بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینی مدارس کا نصاب و نظام، نقد و نظر کے آئینہ میں

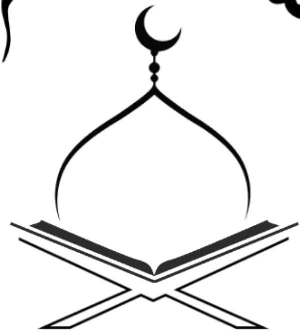

حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

- ★ دینی مدارس کے اہداف و مقاصد اور تاریخی و معاشرتی کردار
- ★ دینی مدارس، حکومت اور بین الاقوامی حلقے
- ★ نصابِ تعلیم اور طریقِ تدریس
- ★ اصلاحِ احوال کے مختلف پہلو اور حکمتِ عملی
- ★ دینی مدارس کے معاشرتی کردار کے حوالے سے ایک مکالمہ
- ★ عصری مدارس میں دینی تعلیم اور بین الاقوامی لابیاں

— ناشر —

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب : دینی مدارس کا نصاب و نظام، نقد و نظر کے آئینے میں

مصنف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

مرتب : محمد عمار خان ناصر

مجموعہ : اگست ۲۰۰۷ء

ناشر :

اشاعت :

فہرست

☆ پیش لفظ.....7

دینی مدارس کے اہداف و مقاصد اور تاریخی و معاشرتی کردار.....11

☆ جنوبی ایشیا میں دینی مدارس کا معاشرتی کردار.....12
☆ دینی مدارس کے کردار کا غیر جانب دارانہ تجزیہ.....18
☆ دینی مدارس کے جداگانہ نظام و نصاب کا مقصد.....28
☆ درسِ نظامی کے بارے میں امریکی دانش ور کے خیالات.....33
☆ محراب و منبر کے وارث اور محنت مزدوری.....36
☆ دینی مدارس اور جدید سائنسی علوم.....42
☆ دینی مدارس کے بارے میں پانچ سوالات کے جوابات.....47
☆ جدید مغربی معاشرے کے لیے دینی مدارس کا پیغام.....62
☆ دینی مدارس: درپیش چیلنجز.....67
☆ قومی تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات.....73
☆ معاشرہ میں دینی مدارس کا کردار اور اہمیت.....79

دینی مدارس، حکومت اور بین الاقوامی حلقے.....85

☆ دینی مدارس کی اسناد کی حیثیت.....86
☆ دینی مدارس کی اسناد: ایک پہلو یہ بھی ہے.....93

☆ دینی مدارس کی اسناد کا مسئلہ......98
☆ دینی مدارس کے نصاب کے مندرجات پر ایک نظر......102
☆ پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی......107
☆ دینی مدارس کے حوالے سے چار اہم خبریں......111
☆ پرویز حکومت اور دینی مدارس......115
☆ دینی مدارس اور حکومتی اقدامات......119
☆ مدرسہ آرڈیننس کے مضمرات......123
☆ مدارس آرڈیننس نافذ کرنے کا نیا سرکاری پروگرام......128
☆ دینی مدارس اور حکومتی امداد......133
☆ وفاق المدارس العربیہ کا کنونشن......138
☆ وفاق المدارس کا کامیاب کنونشن......143
☆ وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کا ایک خوش آئند فیصلہ......147
☆ نفاذ شریعت کے لیے جامعہ حفصہ کا اقدام......151
☆ یہ راستہ شریعت کے مطابق نہیں......156
☆ منکرات و فواحش کا فروغ اور ارباب دانش کی ذمہ داری......160
☆ غازی برادران کا غلط طرز عمل اور دینی مدارس کا مستقبل......164

نصاب تعلیم اور طریق تدریس......169

☆ دینی مدارس کا نصاب تعلیم......170
☆ دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ......177
☆ دینی مدارس کا تعلیمی نصاب اور چند ناگزیر جدید تقاضے......184

☆ بنگلہ دیش کے دینی مدارس 190
☆ کلیۃ الشریعہ کے نصاب سے متعلق دو روزہ سیمینار 195
☆ دینی مدارس کے منتظمین سے ایک گزارش 200
☆ وفاق المدارس کے ایک فیصلہ پر چند گزارشات 204
☆ دینی مدارس میں جدید فکر و فلسفہ کی تعلیم 208
☆ بچیوں کی تعلیم اور نصاب تعلیم 213
☆ دینی مدارس کے اساتذہ کیا سوچتے ہیں؟ 217

اصلاح احوال کے مختلف پہلو اور حکمت عملی 225

☆ دینی نظامِ تعلیم: چند اصلاح طلب امور 226
☆ نئے دور کا چیلنج اور دینی مدارس 242
☆ دینی نظام تعلیم میں اصلاحِ احوال کی ضرورت اور حکمتِ عملی 249
☆ دینی مدارس میں تحقیق و تصنیف کی صورت حال 257
☆ دینی مدارس کو درپیش داخلی و خارجی چیلنج 265
☆ فکری و مسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو 277
☆ دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے 284
☆ ائمہ مساجد اور علماء کرام کی معاشرتی ذمہ داریاں 289
☆ دینی مدارس میں عمدہ تعلیم 294
☆ دینی تعلیم کے مختصر کورسز: ضرورت و اہمیت 299
☆ دینی مدارس، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ 304

تکملہ ۱

دینی مدارس کے معاشرتی کردار کے حوالے سے ایک مکالمہ..........309

☆ ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا — عطاء الحق قاسمی..................310

☆ مولانا زاہد الراشدی کے جواب میں — عطاء الحق قاسمی........................314

☆ ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — عطاء الحق قاسمی...................317

☆ ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کا مکتوب گرامی....................................321

☆ جناب آفتاب عروج کا مکتوب گرامی..324

☆ ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا؟ — آفتاب عروج....................326

☆ خطوط و مضامین میں اٹھائے گئے اہم نکات پر ایک نظر — ابو عمار زاہد الراشدی....331

تکملہ ۲

عصری مدارس میں دینی تعلیم اور بین الاقوامی لابیاں..........335

☆ عالمی طاقتیں اور نصاب تعلیم..336

☆ میٹرک کا نصاب اور سورہ توبہ...340

☆ تعلیمی نظام اور بین الاقوامی مطالبات.......................................344

☆ تعلیمی نصاب میں اصلاحات کی نئی بحث.....................................348

☆ نصاب میں تبدیلی اور آغا خان فاؤنڈیشن.....................................353

☆ قومی نظام تعلیم اور آغا خان تعلیمی بورڈ.....................................359

☆ ”دی لیڈر“ اور قومی نصاب کمیٹی...363

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہ تبارک وتعالٰی ونصلی ونسلم علٰی رسولہ الکریم وعلٰی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

۱۸۵۷ء میں متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی مسلح تحریک آزادی کی ناکامی اور دہلی پر باضابطہ برطانوی حکومت قائم ہونے کے بعد جب دفتروں اور عدالتوں سے فارسی زبان کی بساط لپیٹ دی گئی، فارسی اور عربی کے ساتھ فقہ اسلامی اور دیگر متعلقہ علوم کی تعلیم دینے والے مدارس کے معاشرتی کردار پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا اور ہزاروں مدارس اس نوآبادیاتی فیصلے کی نذر ہوگئے تو حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت کے کچھ بچے کھچے درویش صفت بزرگوں نے دیوبند، سہارنپور، مراد آباد اور ہاٹ ہزاری میں دینی مدارس کے ایک رضاکارانہ اور پرائیویٹ سلسلے کا آغاز کیا جو ان بزرگوں کے خلوص اور معاشرے کی دینی ضروریات کے باعث بہت جلد ایک مربوط اور منظم نظام کی شکل اختیار کر گیا اور جنوبی ایشیا کے کونے کونے میں ایسے مدارس کا جال بچھ گیا۔

ان مدارس کا بنیادی مقصد عام مسلمانوں کا دین کے ساتھ تعلق باقی رکھنا، دینی علوم کی تعلیم و تدریس کے تسلسل کو قائم رکھنا اور دینی معاشرت اور اقدار کا تحفظ تھا اور ایک خاص تحفظاتی ماحول میں ان مدارس نے برطانوی استعمار کے اقتدار کے خاتمہ تک اپنا کردار پورے تسلسل اور کامیابی کے ساتھ جاری رکھا اور علامہ اقبال کے بقول جنوبی ایشیا کی مسلم سوسائٹی کو اسپین بننے سے بچا لیا۔ دینی مدارس کے اس تاریخی کردار کے، اپنے اور پرائے سب معترف ہیں اور جہاں یہ بات کھلم کھلا تسلیم کی جا رہی ہے کہ اس خطہ کے مسلمانوں میں مذہبیت کا شعور اور مشرقیت کا ادراک باقی رہنے کا واحد ذریعہ یہ دینی مدارس ہیں، وہاں اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا جا رہا ہے کہ نوآبادیاتی حکمرانوں نے اس خطہ کے مسلمانوں کے عقیدہ و فکر اور ان کی ثقافت و تہذیب کو تحلیل کر دینے کے لیے جو ہمہ جہتی یلغار

کی تھی، اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ مدارس ثابت ہوئے ہیں۔

لیکن ان مدارس دینیہ کے اس عظیم کردار کے اعتراف کے باوجود مسلم معاشرہ کی دینی ضروریات کی وسعت و تنوع اور گلوبل سوسائٹی کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے انسانی معاشرہ کے تقاضوں کے حوالے سے دینی مدارس کے نصاب، نظام، طریق کار، دائرۂ عمل، اہداف اور پیشرفت کی رفتار کے دائروں میں مختلف نوع کے خلا کا احساس ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے جس کی اہل فکر و دانش نشان دہی بھی کرتے رہے ہیں، مگر اب زمانہ کی رفتار میں مزید تیزی کے باعث یہ احساس مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے اور دینی مدارس پر اس حوالے سے دباؤ میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے۔

دینی مدارس کا معاشرتی اور تعلیمی کردار آج کی دنیا میں زیر بحث آنے والا ایک اہم موضوع ہے اور مشرق و مغرب میں اس پر بحث و مباحثہ جاری ہے۔ دینی مدارس کو اس سلسلے میں دو طرفہ دباؤ کا سامنا ہے۔ ایک طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی نظام کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہے اور انہیں اپنا امتیاز و تشخص ختم کر کے عالمی اور قومی نظام تعلیم کے اجتماعی دھارے میں ضم ہو جانا چاہیے، جبکہ دوسری طرف سے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ عالمی اور قومی سیکولر نظام تعلیم کے مقابلے میں دینی مدارس کا جداگانہ دینی تشخص اپنے طریق کار اور دائرۂ عمل کے بہت سے پہلوؤں میں کچھ ایسی عملی کمزوریوں اور خامیوں کا شکار ہے جنھیں اگر دور کر لیا جائے تو ان مدارس کے اسلامی تشخص میں مزید نکھار پیدا ہو سکتا ہے اور وہ آج کے عالمی سیکولر ماحول میں اسلامی تعلیمات کا پرچم زیادہ حوصلے اور اعتماد کے ساتھ بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس دوسرے پہلو پر بات کرنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ گزشتہ ربع صدی سے اس موضوع پر مختلف اخبارات و جرائد میں کچھ نہ کچھ لکھتا آ رہا ہوں اور اس کے بیسیوں پہلوؤں پر گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ نے ان میں سے اہم مضامین کو کتابی شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس سے ان کے دائرہ اور افادیت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور اضافہ ہو گا۔ یہ مضامین چونکہ ایک ہی موضوع پر مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے لکھے گئے ہیں، اس لیے قارئین کو ان میں بعض نکات کے ذکر میں تکرار بھی محسوس ہو گا، لیکن ایسی صورت میں اس قسم کا تکرار ایک حد تک ناگزیر ہو جایا کرتا ہے اور

امید ہے کہ قارئین کے لیے یہ زیادہ گرانی کا باعث نہیں ہو گا۔ قارئین سے استدعا ہے کہ وہ راقم الحروف اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے لیے بطور خاص دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ دین کی مثبت اور مؤثر خدمت کی توفیق سے ہمیشہ نوازتے رہیں۔ آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ
۲/ جولائی ۲۰۰۷ء

دینی مدارس کے اہداف و مقاصد اور تاریخی و معاشرتی کردار

جنوبی ایشیا میں دینی مدارس کا معاشرتی کردار

جنوبی ایشیا میں آزاد دینی مدارس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ تاج برطانیہ نے نظام حکومت سنبھال کر متحدہ ہندوستان کے نظام کو تبدیل کرنے کے لیے جو اقدامات کیے، ان میں پرانے نظام تعلیم کا خاتمہ بھی تھا۔ اس سے قبل متحدہ ہندوستان میں فارسی دفتری زبان تھی اور عدالتوں میں فتاویٰ عالمگیری کا قانون رائج تھا جو اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں سلطان مرحوم کی سربراہی میں ملک کے پانچ سو جید علماء کرام کی اجتماعی کاوشوں سے فقہ حنفی کی بنیاد پر ملک کے اجتماعی نظام کے طور پر مرتب ہوا تھا اور ملک میں بطور قانون نافذ کر دیا گیا تھا۔

دفتری زبان فارسی تھی جبکہ قانون کی زبان عربی تھی اور درس نظامی کا نصاب ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اس لیے مغل دور کے مدارس میں یہی نصاب رائج تھا اور مدارس کے اخراجات ریاستی وسائل سے پورے ہوتے تھے مگر برطانوی حکومت نے دفتری زبان انگریزی قرار دے دی اور عدالتوں میں رائج اسلامی قوانین کو منسوخ کر کے برٹش لا نافذ کر دیا، اس لیے ان دونوں حوالوں سے سابقہ تعلیمی نظام و نصاب کی افادیت ختم ہو گئی جو کہ اس اقدام سے برٹش گورنمنٹ کا اصل مقصد تھا۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ ۱۸۵۷ء اور اس سے قبل ۱۸۳۱ء کے معرکہ ہائے حریت میں علماء کرام ہی مسلح جدوجہد میں پیش پیش تھے اور آئندہ بھی انہی سے خطرہ تھا کہ جب بھی موقع ملا، وہ انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، اس لیے اس طبقہ کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ ہو گیا۔ بہت سے علماء کرام ان معرکہ ہائے حریت میں کام آ چکے تھے، ہزاروں کو گرفتار کر لیا گیا، ہزاروں کو بغاوت کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بے شمار علماء کرام کو جلاوطن کر کے کالا پانی کے جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔

ان اقدامات کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ دین کا علم رکھنے والے اور اسلامی اقدار و روایات کی حفاظت کرنے والے علماء کرام کی اس وقت موجود کھیپ کو ختم کر دیا جائے اور ان مراکز کو بھی بند کر دیا جائے جہاں سے یہ کھیپ تیار ہوتی ہے، چنانچہ مدارس کا نظام مکمل طور پر سبوتاژ کر دیا گیا اور ایک محتاط اندازے کے مطابق متحدہ ہندوستان میں مجموعی طور پر تیس ہزار کے لگ بھگ مدارس یک لخت بند ہو گئے۔

اس صورت حال میں باقی ماندہ علماء کرام نے اپنے اپنے علاقہ میں اپنے ذوق کے مطابق دینی تعلیم کو باقی رکھنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے، جبکہ یو پی کے علاقہ شاملی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ میں حصہ لینے والے چند علماء کرام نے دیوبند کے قصبہ میں رضاکارانہ بنیاد پر عوامی چندہ کے ذریعے سے ایک دینی درس گاہ مدرسہ عربیہ کے نام سے قائم کی جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے متعارف ہوئی۔

اس درس گاہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حاجی عابد حسینؒ پیش پیش تھے اور ان کے ساتھ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ اور دوسرے حضرات بھی معاون تھے جو عارف باللہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حلقہ ارادت سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے دور میں چشتی سلسلہ کے بڑے مشائخ میں سے تھے۔ انہوں نے شاملی کے محاذ پر انگریزوں کے خلاف جنگ میں علماء کرام کی قیادت کی تھی۔ شاملی فتح ہونے کے بعد چند روز تک امیر المومنین کی حیثیت سے حکمران بھی رہے مگر انگریزوں کا اس علاقے پر دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے اور مقبرۃ المعلاۃ میں مدفون ہیں۔ مکہ مکرمہ کا مدرسہ صولتیہ قائم کرنے والے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی انہی حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خوشہ چینوں میں سے تھے۔ انہوں نے بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ بعد میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی سرپرستی میں ہی انہوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا تھا۔

دیوبند کے مدرسہ کی بنیاد خالصتاً عوامی تعاون پر تھی اور اس کے بنیادی اصولوں میں، جو آج بھی تحریری صورت میں موجود ہیں، یہ بات مستقل طور پر طے کر دی گئی تھی کہ اس کے لیے کسی مستقل آمدنی کا انتظام نہیں کیا جائے گا اور کسی حکومت یا نواب سے امداد نہیں لی جائے گی بلکہ عام مسلمانوں کے رضاکارانہ چندوں کے ذریعے سے اس کا نظام چلایا جائے گا۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک دارالعلوم

دیوبند اور اس سے عملی و فکری طور پر وابستہ اکثر و بیشتر مدارس کا نظام اسی اصول کے مطابق چل رہا ہے، حتیٰ کہ بہت سے مواقع پر متعدّد حکومتوں نے امداد کی پیش کش کی ہے مگر ان مدارس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ دیوبند کے علاوہ اسی دور میں سہارنپور، مراد آباد اور ڈھاکہ میں بھی اسی طرز کے مدارس وجود میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں ان مدارس کا جال بچھ گیا۔

ان مدارس نے جو نمایاں خدمات سرانجام دیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

- مساجد میں امامت اور قرآن کریم کی تعلیم کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے ائمہ مساجد، خطباء اور حفاظ قرآن تیار کیے، چنانچہ آج جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں جتنی مساجد آباد ہیں اور جتنے مکاتب قرآن کریم کی تعلیم دے رہے ہیں، ان میں انہی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کام کر رہے ہیں۔
- قرآن کریم، حدیث نبوی، فقہ اسلامی، عربی و فارسی زبانوں اور دیگر متعلقہ علوم کی حفاظت و تدریس کا اہتمام کیا اور درس نظامی کے اس نظام و نصاب کو آج تک باقی رکھا جسے برطانوی حکومت اپنے خیال میں جڑ سے اکھاڑ کر سمندر میں پھینک چکی تھی۔
- مسلمانوں کے عقیدہ و فکر کی حفاظت کی اور توحید و سنت کے سر چشمہ کے ساتھ انہیں وابستہ رکھنے کے علاوہ اس خطہ میں مسیحیت کو فروغ دینے کی مساعی کی روک تھام کی اور انکار سنت، انکار معجزات، عقل پرستی، شرک و بدعت، انکار ختم نبوت اور دیگر اعتقادی و عملی فتنوں کا مقابلہ کیا۔
- مسلمانوں میں حریت اور آزادی کے جذبہ کو باقی رکھا اور خود مختاری کے جذبات کی آبیاری کرتے ہوئے تحریک آزادی کو سینکڑوں قائدین اور ہزاروں کارکنوں کی کھیپ ہر دور میں مہیا کی۔
- عام مسلمانوں میں دعوت و اصلاح کے عمل کو جاری رکھا۔ آج یہ عمل پوری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور دینی مدارس کے فضلاء کا اس میں بہت بڑا کردار ہے۔
- تحریر و تقریر کے میدان بھی بڑے بڑے مصنفین، محققین، دانش ور اور خطباء پیدا کیے جن کے تذکرہ کے لیے مستقل کتاب درکار ہے اور اس طرح علمی و تحقیقی میدان میں بھی علماء کی جدوجہد کے تسلسل کو قائم رکھا۔

دینی مدارس کی انہی خدمات کی وجہ سے مغربی استعمار انہیں اپنی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے اور ان دینی مدارس کو ختم کرنے یا سرکاری کنٹرول میں لا کر بے اثر بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً منصوبے بنتے رہتے ہیں، جبکہ یہ دینی مدارس سمجھتے ہیں کہ ان کی مذکورہ بالا خدمات اور کارکردگی کا تسلسل اور اثرات صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتے ہیں جبکہ وہ سرکاری مداخلت سے آزاد ہوں، مالی طور پر خود مختار ہوں اور نصاب و نظام کے معاملات خود ان کے اپنے کنٹرول میں ہوں، ورنہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر ریاستی مشینری کو مداخلت کا موقع دینے سے دینی مدارس کا یہ سارا نظام مجروح ہو گا اور وہ مشنری جذبہ کے ساتھ مذکورہ بالا مقاصد کے لیے کام نہیں کر سکیں گے۔

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۰ء میں پاکستان میں دینی مدارس کی مجموعی تعداد سات ہزار کے لگ بھگ تھی جن میں طلبہ اور طالبات کی تعداد گیارہ لاکھ کے قریب ہے اور تیس ہزار سے زائد اساتذہ تدریسی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ ان میں دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مدارس کا تناسب چونسٹھ فی صد ہے جبکہ بریلوی مکتب فکر کے مدارس پچیس فیصد، اہل حدیث مکتب فکر کے مدارس چھ فیصد اور اہل تشیع کے مدارس دو فیصد ہیں اور تین فیصد مدارس ایسے ہیں جو اپنا کوئی مسلکی تشخص نہیں رکھتے۔

پاکستان میں اس وقت مسلکی بنیاد پر ان مدارس کے پانچ بورڈ آزادانہ طور پر قائم ہیں:

- وفاق المدارس العربیہ پاکستان، دیوبندی مکتب فکر
- تنظیم المدارس العربیہ پاکستان، بریلوی مکتب فکر
- وفاق المدارس السلفیہ پاکستان، اہلحدیث مکتب فکر
- وفاق المدارس الشیعہ پاکستان، شیعہ مکتب فکر
- رابطۃ المدارس العربیہ پاکستان، جماعت اسلامی

ان وفاقوں کا اپنا اپنا امتحانی نظام ہے جس کے تحت ان کے زیر نگرانی تمام مدارس کے امتحانات ہوتے ہیں اور انہیں باقاعدہ اسناد جاری کی جاتی ہیں۔ ان وفاقوں کی آخری سند کو، جسے دورۂ حدیث سے فراغت کی سند کہا جاتا ہے اور الشہادۃ العالمیۃ کے عنوان تعبیر کیا جاتا ہے، سرکاری طور پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے فیصلہ کے مطابق ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔

ان مدارس سے فارغ التحصیل علماء کرام کی ایک بڑی تعداد ملکی سیاست میں حصہ لیتی ہے اور علماء

مختلف دینی و سیاسی جماعتوں کے ذریعے سے اسمبلیوں میں پہنچ کر قومی سطح پر نفاذ اسلام کی جدوجہد میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ:

- قیام پاکستان کے بعد پہلی دستور ساز اسمبلی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی موجود تھے جو دار العلوم دیوبند کے سابق اساتذہ میں سے تھے اور علماء کرام کی ایک بڑی جماعت جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے سربراہ تھے۔ تحریک پاکستان میں ان کی نمایاں خدمات کا اعتراف خود قائداعظم محمد علی جناح نے کیا تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی سے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ پر ایمان کا اظہار کرتے ہوئے عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے سے قرآن و سنت کے احکام کے مطابق ملک کا نظام چلانے کا عہد کیا گیا۔ یہ قرارداد مقاصد آج بھی پاکستان کے دستور کی بنیاد ہے اور اسی بنا پر پاکستان کو ایک نظریاتی اسلامی ریاست تصور کیا جاتا ہے۔
- ۱۹۷۳ء کا دستور تشکیل دینے والی دستور ساز اسمبلی میں مولانا مفتی محمود، مولانا عبد الحق، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبد الحکیم، مولانا عبد المصطفیٰ ازہری، مولانا محمد ذاکر، مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہم جیسے سرکردہ علماء کرام کی موجودگی کی وجہ سے اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا، قرآن و سنت کے منافی قانون سازی کو ممنوع قرار دیا گیا اور ملک کے تمام مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت دی گئی۔ ان دفعات پر اگرچہ ابھی تک عمل نہیں ہوا، لیکن یہ دفعات ملک میں اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کے لیے دستوری بنیاد فراہم کرتی ہیں۔
- ۱۹۷۲ء میں جمعیت علمائے اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے اور انہوں نے متعدّد اسلامی اصلاحات اور سادگی و قناعت کے عملی مظاہرہ کے ساتھ ایک اسلامی حکومت کا نمونہ پیش کیا۔
- افغانستان میں روس کی فوج کشی کے خلاف بغاوت کر کے علم جہاد بلند کرنے والے مجاہدین کی قیادت زیادہ تر انہی علماء کرام پر مشتمل تھی جو ان دینی مدارس کے تربیت یافتہ تھے اور دینی مدارس سے تعلیم پانے والے ہزاروں علماء کرام نے میدان جہاد میں اسلام کی سربلندی اور ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔

- امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کے سادہ منش، درویش صفت اور شریعت اسلامیہ کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ رکھنے والے وزراء اور حکام بھی انہی مدارس کے تربیت یافتہ تھے جنہوں نے اپنی سادگی، ایثار، قناعت اور دینداری کے ساتھ اسلامی حکومت کے ایک مثالی نمونہ سے دنیا کو متعارف کرایا۔
- ۱۰/ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں ملک میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی متحدہ مجلس عمل میں بھی اکثریت ان علماء کرام کی ہے جو ان دینی مدارس کے فیض یافتہ ہیں۔ ان میں جمعیت علمائے اسلام سب سے نمایاں ہے اور صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کی قیادت جمعیت علمائے اسلام کے رہنما محمد اکرم خان درانی کر رہے ہیں جن کے آباواجداد نے انگریزی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں سرگرم کردار ادا کیا تھا اور بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔

بلاشبہ اس پس منظر، خدمات اور کردار کے ساتھ یہ دینی مدارس جنوبی ایشیا میں مغربی استعمار کے توسیع پسندانہ عزائم اور مغربی ثقافت و تہذیب کو مسلط کرنے کے منصوبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور اسی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے ان مدارس کی کردارکشی اور ان کے خلاف مکروہ پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ انہیں ختم کرنے، ریاستی مشینری کے ذریعے سے قابو میں لانے اور انہیں بے اثر بنانے کے نت نئے منصوبے سامنے آتے رہتے ہیں اور اسی پس منظر کی وجہ سے امریکہ کے وزیر دفاع رمزفیلڈ نے گزشتہ دنوں کھلے بندوں یہ بات کہہ دی ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس ہمارے لیے شدید خطرہ ہیں۔ لیکن تمام مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود یہ دینی مدارس محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور غریب عوام کے مخلصانہ تعاون کے ساتھ اپنے مقدس مشن کے لیے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں اور آئندہ بھی مخالفت کا کوئی حربہ انہیں ان کے مشن اور آزادانہ کردار سے محروم نہیں کر سکے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، مظفر آباد، ۳/ فروری ۲۰۰۳ء)

دینی مدارس کے کردار کا غیر جانب دارانہ تجزیہ

اہل اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے انفرادی و اجتماعی اور شخصی و معاشرتی، تمام معاملات میں وحی الٰہی کے پابند ہیں اور اخروی نجات کے ساتھ ساتھ ان کی دنیاوی کامیابی اور فلاح بھی آسمانی تعلیمات کی پیروی پر موقوف ہے۔ اہل اسلام حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کی تعلیمات کو حق مانتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور قرآن کریم وحی الٰہی کا فائنل اور مکمل ایڈیشن ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں جو معروضی حقائق سے مکمل مطابقت رکھتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی الٰہی کا صرف وہی حصہ تاریخ کے ریکارڈ میں مکمل طور پر محفوظ ہے جو قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و تعلیمات پر مشتمل ہے، جب کہ اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر پر نازل ہونے والی وحی اور اس پیغمبر کی اپنی تعلیمات اس وقت دنیا میں کہیں بھی محفوظ حالت میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے آج جو شخص یا قوم بھی آسمانی تعلیمات کو اپنی زندگی کے معاملات میں راہنما بنانا چاہے، اس کے لیے قرآن کریم اور اسوہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اہل اسلام یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ چونکہ آسمانی تعلیمات ہی نسل انسانی کی صحیح راہنمائی کی ضامن ہیں اور انسان محض اپنی انفرادی یا اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر اپنے مسائل حل کرنے اور مثالی انسانی سوسائٹی تشکیل دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور چونکہ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی آسمانی تعلیمات کو مکمل اور محفوظ حالت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اس لیے اہل اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خود قرآن و سنت پر اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں مکمل طور پر عمل کریں بلکہ دنیا کی دوسری اقوام کے سامنے بھی اسلامی تعلیمات کو پیش کریں اور انہیں دعوت

دیں کہ وہ محض انسانی عقل و خواہش پر بھروسہ کرنے کے بجائے وحی الٰہی کی بالاتر راہنمائی کو قبول کریں اور آسمانی تعلیمات کے محفوظ ترین اور فائنل ایڈیشن قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے انسانی سوسائٹی کو عقل و خواہش کی بے لگام پیروی سے نجات دلائیں، تاکہ دنیا کی انسانی آبادی مجموعی طور پر فطری قوانین اور نظام کے تحت امن و خوشحالی کی حقیقی منزل سے ہم کنار ہو سکے۔

اس پس منظر میں ہر مسلمان مرد اور عورت کا قرآن و سنت کی تعلیمات سے آراستہ ہونا اس کے دینی فرائض میں شامل ہے اور مسلمانوں کی مذہبی قیادت اسے اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے کہ وہ ہر مسلمان خاندان اور فرد کو ضروری دینی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو، کر گزرے اور اس معاملہ میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھے۔

بیشتر مسلم ممالک پر برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور دیگر استعماری قوتوں کے تسلط سے قبل ان ممالک میں دینی تعلیمات کے فروغ کو ریاستی ذمہ داری شمار کیا جاتا تھا اور ہر مسلمان حکومت اپنے ملک کے باشندوں کو قرآن و سنت کی تعلیمات اور دینی احکام و فرائض سے آگاہ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی جس کے لیے ہر ریاستی نظام میں خاطر خواہ بندوبست موجود ہوتا تھا مگر جب استعماری قوتوں نے مختلف حیلوں اور ریشہ دوانیوں سے مسلم ممالک کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ان ملکوں کے نظاموں کو تبدیل کر کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی شعبہ میں بھی تبدیلی کر کے مسلم عوام کو دینی تعلیم کے صدیوں سے چلے آنے والے تسلسل سے محروم کر دیا تو آسمانی تعلیمات کے تحفظ، دینی تعلیمات کے فروغ اور مسلم عوام کو قرآن و سنت کی تعلیمات و احکام سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری کو اپنا بنیادی اور ناگزیر فریضہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کی مذہبی قیادت نے اس کے لیے امداد باہمی کی بنیاد پر رضا کارانہ اور پرائیویٹ تعلیمی نظام کی بنیاد رکھی جو آج مختلف مسلم ممالک بالخصوص جنوبی ایشیا کے ممالک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں دینی مدارس کی شکل میں موجود ہے۔ برصغیر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں مغل حکومت کے دور میں ”درس نظامی“ کا یہی نصاب ملک کا سرکاری نصاب تعلیم تھا جو آج ضروری ترامیم اور تبدیلیوں کے ساتھ اسی نام سے دینی مدارس میں رائج ہے۔ اسے ”درس نظامی“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ نے، جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاصرین میں سے تھے، کئی نسلوں سے پڑھائے جانے والے تعلیمی نصاب کو باقاعدہ اور مربوط نصاب کی شکل دی تھی جس کے بعد یہ

نصاب انہی کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اس نصاب میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل علوم شامل ہیں:

۱۔ قرآن پاک اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ترجمہ و تشریح کے ساتھ۔

۲۔ صرف و نحو اور عربی ادب و گریمر کے دیگر فنون تاکہ قرآن و سنت تک براہ راست رسائی آسان ہو۔

۳۔ فقہ اسلامی، تاکہ قرآن و سنت سے مستنبط احکام و قوانین سے آگاہی ہو۔

۴۔ یونانی منطق و فلسفہ، تاکہ اس منطق و فلسفہ کے عروج اور عمل داری کے دور میں لکھے گئے اسلامی لٹریچر کے وسیع ذخیرہ تک رسائی ممکن ہو۔

۵۔ علم کلام، تاکہ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلامی عقائد کا فرق اور عقائد کے حوالہ سے مسلمان فرقوں کی تعبیرات کا باہمی فرق ذہنوں میں واضح ہو۔

۶۔ ریاضی اور حساب، تاکہ باہمی لین دین اور حساب کتاب کو نمٹانا آسان ہو۔

۷۔ فارسی زبان، جو مغل دور کی سرکاری زبان تھی اور درس نظامی کے نصاب کا لازمی حصہ تھی، تاکہ دفتری اور سرکاری امور میں بے جھجک شرکت ہو سکے۔

۸۔ کتابت و تحریر، تاکہ لکھنا پڑھنا آسان ہو۔

اس طرح ایک مہذب اور منظم سوسائٹی میں تعلیم کے تمام ضروری تقاضے مثلاً خواندگی، دفتری زبان، مروجہ قوانین، مذہبی زبان، عقائد و نظریات، کلچر و ثقافت، اسلامی لٹریچر تک رسائی، حساب کتاب اور قرآن و سنت کی تعلیمات سے آگاہی تک کے سب اہم اور ناگزیر امور اس نصاب کے اندر سمو دیے گئے تھے۔ ملک کی عام آبادی کے لوگ، مسلم اور غیر مسلم یہی نصاب پڑھتے تھے اور اسی نصاب کی بنیاد پر انتظامی، عدالتی اور مالیاتی شعبوں میں تمام مناصب تک پہنچتے تھے۔ مگر جب برطانوی استعمار نے مغل حکومت سے اقتدار چھین کر اس خطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی اور انتظامی، مالیاتی اور عدالتی نظام کو یکسر بدل دینے کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی فارسی کے بجائے انگریزی مقرر کر دی تو اجتماعی اور ریاستی معاملات سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے ''درس نظامی'' کی بنیاد پر چلنے والا یہ پورا نصاب و نظام بے مصرف ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ نئے حکمرانوں کے نافذ کردہ جدید تعلیمی نظام نے لے لی۔

اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے کچھ مردان خیر نے مسجد و مدرسہ کے معاشرتی کردار کو بحال رکھنے کی حد تک درس نظامی کے اس سسٹم کو بہر حال قائم رکھنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے رضا کارانہ طور پر عوامی چندہ اور امداد باہمی کے اصول کو بنیاد بنا کر پرائیویٹ دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابتدا میں دیوبند، سہارنپور، مراد آباد اور دیگر چند شہروں میں دینی مدارس قائم ہوئے، لیکن یہ ضرورت چونکہ پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشترکہ ضرورت تھی، اس لیے ایک قابلِ عمل مثال سامنے آتے ہی ملک کے طول و عرض میں اس قسم کے دینی مدارس کا جال بچھ گیا۔ ان مدارس کا نصاب بنیادی طور پر وہی چلا آرہا ہے جس کا تذکرہ سطور بالا میں ''درس نظامی'' کے حوالہ سے کیا گیا ہے، مگر اسے بے لچک اور جامد نصاب کے طور پر نہیں اختیار کیا گیا بلکہ ہر دور میں اجتماعی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں مناسب تبدیلیاں بھی کی گئیں اور ان تبدیلیوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ تاہم تعلیمی نصاب اور نظام کے حوالہ سے ان مدارس کے ارباب حل و عقد نے بعض ناگزیر تحفظات کے پیش نظر دو باتوں کو بنیادی پالیسی کے طور پر اختیار کیا اور یہی دو باتیں عالم اسباب میں ان مدارس کے نظام میں استحکام اور ان کے جداگانہ تشخص و امتیاز کی بقا کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

مالیاتی امور میں مدارس کے اس نظام نے ریاستی اداروں سے مکمل بے نیازی کا رویہ اختیار کیا۔ سرکاری امداد کسی صورت میں قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور نہ ہی کسی سطح پر سرکاری مداخلت کو در آنے کا موقع فراہم کیا۔ ان مدارس نے اپنے اخراجات اور مالیاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عوام کے صدقات، زکوٰۃ، عطیات اور چندے کی دیگر صورتوں پر بھروسہ کیا اور انتہائی قناعت اور بے نیازی کے ساتھ بہت تھوڑے خرچ سے کام چلایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی بھی حکومت ان مدارس کے معاملات میں مداخلت کے لیے راہ نہ پا سکی اور یہ مدارس پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہے۔

ان مدارس نے شعوری طور پر یہ پالیسی اختیار کی کہ ان کے فارغ التحصیل علماء کی غالب اکثریت مسجد و مدرسہ کے سوا کسی اور شعبہ زندگی میں نہ کھپ سکے اور اسی وجہ سے یہ مدارس جدید تعلیم کو اپنے نصاب میں پوری طرح شامل کرنے سے اب تک گریزاں ہیں، کیونکہ انہیں بجا طور پر یہ خطرہ ہے کہ

اگر ان کے تربیت یافتہ افراد بھی مسجد و مدرسہ کے نظام کا حصہ بننے کے بجائے دوسرے شعبوں میں چلے جائیں گے تو مسجد و مدرسہ کے لیے امام اور استاد فراہم کرنے کا کام پھر سے ادھورا رہ جائے گا اور وہ خلا بدستور موجود رہے گا جس کو پر کرنے کے لیے دینی مدارس کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور اس طرح پرائیویٹ دینی مدارس کے اس نظام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان مدارس کے نظام میں انگریزی زبان اور دیگر جدید علوم و فنون کو داخل نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان مدارس کے ارباب حل و عقد انگریزی زبان کو ناجائز سمجھتے تھے، جیسا کہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے، کیونکہ انگریزی زبان کو بطور زبان سیکھنے کے جواز کا فتویٰ تو حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اس دور میں دے دیا تھا جبکہ ابھی دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور یہ فتویٰ آج بھی فتاویٰ عزیزی میں موجود ہے۔ اسی طرح یہ علماء جدید سائنسی علوم کے بھی مخالف نہیں تھے اور عام مسلمانوں کو ان کے حصول کی ترغیب دیتے رہتے تھے، البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ دینی مدارس سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے علماء مسجد و مدرسہ کے ماحول تک محدود رہیں اور یہاں سے نکل کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہ کھپ جائیں تاکہ وہ خلا دوبارہ عود نہ کر آئے جو برطانوی حکومت کی طرف سے درس نظامی کے مدارس کو ختم کرنے سے پیدا ہو گیا تھا اور جسے پر کرنے کے لیے یہ دینی مدارس پرائیویٹ سطح پر کامیاب کوشش کر رہے تھے۔

مگر ان بنیادی تحفظات کے باوجود دینی مدارس نے اپنے نصاب میں ضروری تبدیلیوں اور ترامیم سے کبھی گریز نہیں کیا اور ہر دور میں نصاب میں ردوبدل کا یہ سلسلہ جاری رہا، مثلاً:

- مغل دور میں درس نظامی کے نصاب میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک کتاب 'مشکوٰۃ شریف' شامل تھی، جبکہ اس کے بعد صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے ساتھ موطا امام مالک اور دیگر کتب احادیث بھی شامل نصاب کی گئی ہیں۔
- مختلف فنون میں پرانی کتابوں کی جگہ نئی کتابیں شامل کی گئی ہیں اور بعض کتابیں بطور خاص اس مقصد کے لیے لکھوائی گئی ہیں۔
- سینکڑوں دینی مدارس کے ساتھ مڈل اور ہائی اسکول کی سطح پر عصری تعلیم کے اسکول قائم ہیں

اور انگریزی اور ریاضی جیسے ضروری مضامین بنیادی ضرورت کی حد تک خود درس نظامی کے نصاب میں بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔

- امتحانات کے نظام کو باہم مربوط بنانے کے لیے مختلف بورڈ ملکی سطح پر قائم ہیں جو جدید اسلوب اور معیار کے مطابق امتحانات کا نظام مرتب کرتے ہیں، ان کی نگرانی کرتے ہیں، امتحانات کے لیے پرچے تیار کیے جاتے ہیں، ان کی مارکنگ ہوتی ہے، رزلٹ جاری کیے جاتے ہیں اور ملک گیر سطح پر امتحانات کے سسٹم میں یکسانیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔
- بہت سے بڑے مدارس نے مختلف مضامین میں تخصص کے شعبے قائم کر رکھے ہیں جن میں افتاء، دعوت وارشاد اور تقابلِ ادیان کے مضامین بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

ان مدارس کی اسناد کو مختلف سطحوں پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن آف پاکستان نے تسلیم کیا ہے اور یہاں سے فراغت حاصل کرنے والے فضلاء بیرون ملک معروف تعلیمی اداروں بالخصوص جامعہ ازہر قاہرہ، مدینہ یونیورسٹی اور دیگر بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور امتیازی پوزیشن سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اس تناظر میں ان دینی مدارس کی معاشرتی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اس کا سرسری خاکہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ یہ مدارس:

۱۔ ملک کے لاکھوں نادار افراد کو نہ صرف تعلیم سے بہرہ ور کرتے ہیں بلکہ ان کی ضروریات مثلاً خوراک، رہائش، علاج اور کتابوں وغیرہ کی کفالت بھی کرتے ہیں۔

۲۔ معاشرہ میں بنیادی تعلیم اور خواندگی کے تناسب میں معقول اضافہ کا باعث ہیں۔

۳۔ قرآن وسنت کی تعلیم اور دینی علوم کی اشاعت وفروغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

۴۔ عام مسلمانوں کو عبادات، دینی راہنمائی اور مذہبی تعلیم کے لیے رجال کار فراہم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

۵۔ عام مسلمانوں کے عقائد، عبادات، اخلاق اور مذہبی کردار کا تحفظ کرتے ہیں اور دین کے ساتھ ان کا عملی رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

۶۔ اسلام کے خاندانی نظام اور کلچر وثقافت کی حفاظت کر رہے ہیں اور غیر اسلامی ثقافت وکلچر

کی یلغار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے مضبوط حصار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷۔ اسلامی عقائد و احکام کی اشاعت کرتے ہیں اور ان کے خلاف غیر مسلم حلقوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات و شبہات کا جواب دیتے ہیں۔

۸۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عقائد و احکام سے انحراف اور بغاوت کا مقابلہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کی ''راسخ العقیدگی'' کا تحفظ کرتے ہیں۔

۹۔ مادہ پرستی، مفادات، خود غرضی اور نفسانفسی کے اس دور میں قناعت، ایثار اور سادگی کی روحانی اقدار کو مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے میں باقی رکھے ہوئے ہیں۔

۱۰۔ وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے مکمل اور محفوظ ذخیرہ کی نہ صرف حفاظت کر رہے ہیں بلکہ سوسائٹی میں اس کی عملی تصدیق کا نمونہ بھی باقی رکھے ہوئے ہیں تاکہ نسل انسانی کے وہ سلیم الفطرت لوگ جو ''عقل و خواہش'' کی مطلق العنانی کے تلخ اور تباہ کن معاشرتی نتائج کو محسوس کرتے ہوئے فطرت کی طرف واپسی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور جن کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، انہیں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کے حقیقی سرچشمہ تک رسائی میں کوئی دقت نہ ہو۔ اس طرح یہ مدارس صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ پوری نسل انسانی کی خدمت کر رہے ہیں اور اس کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ سسٹم کے بارے میں عام طور پر کیے جانے والے دو تین سوالات کا جائزہ بھی لے لیا جائے تاکہ ان مدارس کے ناقدین کا موقف اور اس کی حقیقت بھی سامنے آ جائے۔ مثلاً:

- یہ مدارس ''بنیاد پرستی'' کو فروغ دے رہے ہیں جو ''گلوبلائزیشن'' کے اس دور میں ''ملٹی نیشنل کلچر'' اور مشترکہ عالمی سوسائٹی کی تشکیل میں رکاوٹ ہے۔
- ان مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات مختلف جہادی تحریکات میں عسکری خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور اس طرح یہ مدارس ''دہشت گردی'' کے فروغ کا باعث ہیں۔ نیز ان مدارس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عسکری ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔
- قومی سطح پر یہ مدارس اجتماعی دھارے میں شامل ہونے کے بجائے الگ تشخص قائم رکھنے پر

مصر ہیں اور مروجہ ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ قبول نہیں کر رہے جس کی وجہ سے قوم میں ''دوذہنی'' کی فضا موجود ہے اور یہ دوہرا نظام قومی یکجہتی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

- جہاں تک ''بنیاد پرستی'' کا تعلق ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مدارس عام مسلمانوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں اسلامی ''سولائزیشن'' کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے جو مذہب کے اجتماعی کردار کی نفی کرتے ہوئے سوسائٹی کی اجتماعی عقل و خواہش کی بنیاد پر سیکولر ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے تو ''دینی مدارس'' کو اس الزام کو قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں، بلکہ وہ اسے اپنے لیے الزام کے بجائے اعزاز اور کریڈٹ سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے اس کردار کی اثر خیزی کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کا بنیادی موقف ہی یہ ہے کہ انسانی سوسائٹی کی راہنمائی اور قیادت کے لیے انفرادی یا اجتماعی ''عقل و خواہش'' کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی نگرانی اور بالادستی ضروری ہے اور اس سے ہٹ کر اباحیت مطلقہ اور ہمہ نوع آزادی کی بنیاد پر جس کلچر کو ''گلوبل سولائزیشن'' کے نام پر فروغ دیا جا رہا ہے، وہ سراسر غلط ہے، گمراہی ہے اور نسل انسانی کو مزید تباہی اور انارکی کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے۔ اگر دینی مدارس اس موقف میں لچک پیدا کر لیں تو خود ان کا مقصد وجود ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور ان کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا، اس لیے اس معاملہ میں دینی مدارس کسی قسم کی کوئی لچک قبول کرنے کے روادار نہیں ہیں۔

دوسرا سوال جہادی اور عسکری تحریکات میں دینی مدارس کے طلبا کی کثرت کے ساتھ شمولیت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ دو مسئلے قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔ ایک مسئلہ جہاد کے بارے میں شرعی احکام اور قرآن و سنت کے فرمودات کی تعلیم کا ہے، وہ یقیناً ان مدارس میں ہوتی ہے اور اسی طرح ہوتی ہے جس طرح قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے باقی شعبوں کی ہوتی ہے۔ یہ دینی تعلیمات کا حصہ ہے اور کسی دینی ادارے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ قرآن و سنت کی دیگر تعلیمات کا تو اپنے ہاں اہتمام کرے مگر جہاد سے متعلق آیات قرآنی، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہی ابواب کو صرف اس لیے نصاب سے خارج کر دے کہ دنیا کے کچھ حلقے اس سے ناراض ہوتے ہیں۔ دوسرا مسئلہ

جہاد کی عملی تربیت اور عسکری ٹریننگ کا ہے۔ یہ ان مدارس میں کسی سطح پر نہیں ہوتی اور نہ ہی ان مدارس میں ایسا کوئی نظام موجود ہے جو طلبہ کو اس طرح کی ٹریننگ دیتا ہو، حتیٰ کہ سرکاری کالجوں اور سکولوں میں این سی سی طرز کی جو نیم فوجی تربیت عام طلبہ کو دی جاتی ہے، دینی مدارس کے نظام میں وہ بھی باضابطہ طور پر موجود نہیں ہے، اس لیے یہ کہنا قطعی طور پر غلط ہے کہ دینی مدارس اپنے طلبہ کو عسکری ٹریننگ دیتے ہیں۔ البتہ دینی مدارس کے طلبہ یہاں سے فارغ ہو کر یا چھٹیوں کے دوران میں اپنی آزادانہ مرضی سے کسی دباؤ کے بغیر جہادی تحریکات کے مراکز میں جاتے ہیں، ٹریننگ حاصل کرتے ہیں اور کسی نہ کسی محاذ پر جہاد میں شریک بھی ہوتے ہیں، لیکن اس کا مدارس کے نظام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ٹریننگ کے یہ مراکز مدارس کے سسٹم میں شامل ہیں۔ ان کا نظم اور ذمہ داری بالکل مختلف دائرہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار ٹھہرانا قطعی طور پر غلط بات ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے سرکاری کالجوں، سکولوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہزاروں نوجوان مختلف عسکری تنظیموں میں شامل ہو جاتے ہیں جن میں جہادی تحریکات بھی ہیں، لسانی گروپ بھی ہیں، علاقائی تنظیمیں بھی ہیں اور طبقاتی گروہ بھی ہیں، حتیٰ کہ ڈکیتی اور رہزنی کے گینگ بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ نوجوان بھی مختلف ٹریننگ سنٹروں میں عسکری تربیت حاصل کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کارروائیاں کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی گروہ کی کارروائیوں کا ذمہ دار ان کے تعلیمی اداروں کو قرار نہیں دیا جاتا اور انہیں ان کے ذاتی فعل اور فیصلے پر محمول کیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی دینی مدارس کے طلبہ بھی اگر تعلیمی نظام اور ڈسپلن سے ہٹ کر جہادی تحریکات میں شامل ہوتے ہیں اور عسکری تربیت حاصل کر کے کسی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں تو ان کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

تیسرا سوال قومی اجتماعی دھارے سے الگ رہنے اور جداگانہ تشخص قائم رکھنے کا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اس کا تعلق بھی ان مدارس کے مقصد وجود سے ہے، کیونکہ جب تک ریاستی نظام معاشرہ میں دینی تعلیمات کے فروغ، مساجد کے ائمہ کی فراہمی، دینی راہنمائی کے لیے علماء کرام کی تیاری اور قرآن و سنت کی تعلیم کے لیے اساتذہ مہیا کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس کے لیے قابلِ قبول عملی نظام پیش نہیں کرتا، اس وقت تک ان مدارس کے قیام و وجود کی ضرورت بہرحال باقی

رہے گی، ورنہ وہی خلا پیدا ہو جائے گا جس کو پر کرنے کے لیے یہ مدارس قائم کیے گئے تھے اور اس ”خلا“ کو باقی رکھنے کا کوئی باشعور مسلمان رسک نہیں لے سکتا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے نہ صرف ان مدارس کا وجود ضروری ہے بلکہ ان کی اس مالیاتی خود مختاری، انتظامی آزادی اور نصابی تحفظات کا برقرار رکھنا بھی ناگزیر ہے جس کے بغیر یہ اپنا کردار اعتماد کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے، اس لیے دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی نظام اور معاشرہ میں ”دو ذہنی“ اور ”تعلیمی دوئی“ کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری ریاستی نظام پر عائد ہوتی ہے جو اس کردار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جو ان دینی مدارس کے جداگانہ وجود کا باعث ہے، مگر ان مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کی خواہش کا بار بار اظہار کر رہا ہے جس کا منطقی نتیجہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے اس نظام کو یکسر ختم اور بے اثر کر دینے کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔

مدارس دینیہ کے خلاف اس مسموم فضا میں وہ حق پسند و حقیقت پسند حضرات قابلِ تحسین ہیں جو ان کی ضرورت و افادیت اور خدمات کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ ان مدارس کے ساتھ مالی و اخلاقی تعاون کرتے ہوئے اسلام کی آواز کو سربلند کرنے میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

(روزنامہ انصاف، ۲۴/ جولائی ۲۰۰۲ء)

دینی مدارس کے جداگانہ نظام و نصاب کا مقصد

رجب المرجب کے آغاز کے ساتھ ہی ملک بھر میں دینی مدارس کی تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ختم بخاری شریف، تقسیم اسناد، دستار بندی اور سالانہ اجتماعات کے عنوان سے یہ تقریبات شعبان المعظم کے اختتام تک جاری رہیں گی اور ان میں مختلف دینی و تعلیمی موضوعات پر گفتگو کے علاوہ مدارس کے منتظمین اپنی کارکردگی کی سالانہ رپورٹیں پیش کریں گے اور آئندہ عزائم کا تذکرہ کریں گے۔

میں اسی حوالہ سے دو روز سے حیدر آباد سندھ میں ہوں اور نصف درجن سے زائد دینی مدارس کی تقریبات میں شرکت کر چکا ہوں۔ اس دوران میں بعض دوستوں نے مجھ سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی طرف سے کی گئی دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں حالیہ ترجیحات اور اضافوں کے بارے میں دریافت کیا ہے جس پر میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ ابھی ان ترجیحات اور اضافوں کا کوئی باقاعدہ پیپر ورک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وفاق کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد حنیف جالندھری نے ایک ملاقات میں بھجوانے کا وعدہ کیا تھا اور میں اس کے انتظار میں ہوں، اس کے مطالعے کے بعد ہی کوئی رائے دے سکوں گا۔ البتہ دینی مدارس کے جداگانہ نظام و نصاب کے اہتمام سے ہمارے اکابر اور بزرگوں کا جو مقصد تھا اور اس حوالہ سے ان کے ذہنوں میں جو اہداف تھے، ان میں سے بعض امور کا تذکرہ اس موقع پر کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہم اس سلسلہ میں جو قدم بھی اٹھائیں، اس میں وہ اصل مقاصد و اہداف ہمارے پیش نظر رہیں جو دینی مدارس کے اس جداگانہ نظام و نصاب کے بارے میں ہمارے اکابر اور بزرگوں کے ذہن میں تھے۔

اس نظام و نصاب کی تدوین و تشکیل میں ہمارے اکابر کا اصل مقصد اس معاشرہ میں مسجد و مدرسہ کے اداروں اور دینی تعلیم و تربیت کے فروغ کی ضروریات کے لیے رجال کار کی فراہمی تھا اور ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ معاشرہ کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تعلیم یافتہ حضرات ہر جگہ عام مسلمانوں کو ملتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی یہ خواہش بھی رہتی تھی کہ ذہین افراد اس شعبہ کو

زیادہ سے زیادہ میسر رہیں تاکہ مسجد و مدرسہ اور دینی تعلیم و تربیت کا نظام کسی خلا اور تعطل کے بغیر چلتا رہے۔ اسی مقصد سے ہمارے ہاں اس بات کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے حضرات جدید تعلیم کے شعبوں کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اس میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ چونکہ دوسری طرف ملازمت کا تحفظ، مراعات اور سہولتیں زیادہ ہیں، اس لیے فطری طور پر دینی مدارس سے تعلیم پانے والے نوجوان دوسرے شعبوں میں منتقل ہو جائیں گے اور ہمارے ہاں رجال کار کا خلا اسی طرح باقی رہ جائے گا جس کو ختم کرنے کے لیے دینی مدارس کا جداگانہ نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے بزرگوں کا ذہن کس انداز سے سوچتا تھا، اس کا اندازہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی اس روایت سے کر لیجیے جو مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ نے ''حیات مولانا گیلانی'' میں مولانا مرحوم سے نقل کی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ٹونک کے زمانہ قیام میں ٹونک کے نواب کے طبیب خاص مولانا حکیم برکات احمدؒ ان کے استاذ تھے۔ مولانا گیلانی دینی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں امتیازی ذہانت سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ ان کا خیال ہوا کہ استاد محترم سے طب کی تعلیم حاصل کریں تاکہ ذریعہ معاش طب کو بنائیں اور دینی خدمات جتنی ہو سکے، رضاکارانہ طور پر سرانجام دیتے رہیں مگر استاد محترم نے انہیں طب پڑھانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے حکیم صاحب مرحوم کے بھائی صاحب سے رجوع کیا۔ وہ بھی بڑے طبیب تھے، لیکن مولانا حکیم برکات احمدؒ نے انہیں بھی سختی کے ساتھ مولانا مناظر احسن گیلانی کو طب پڑھانے سے منع کر دیا۔ مولانا گیلانی کے بقول استاد مرحوم نے طب پڑھانے سے خود انکار اور دوسروں کو منع اس لیے کیا کہ ذی استعداد اور ذہین مولوی ہے، استاد بنے گا تو ملک و ملت کو عظیم فائدہ ہو گا، طبیب بن کر کیا کرے گا؟ علاج معالجہ کے راستے سے اچھے پیسے کما لے گا، مگر اس کام کے لیے بہت سارے اطباء موجود ہیں۔ اس گوہر گراں مایہ کا برباد ہونا بڑا علمی خسارہ ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اکابر اپنے ہاں کے ذہین افراد کو دوسرے شعبوں میں منتقل ہونے سے عملاً روکتے تھے اور یہ ان کی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے ذہین افراد اسی شعبہ میں رہیں اور ایثار و قربانی سے کام لیتے ہوئے مراعات اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود دین کی خدمت کو ترجیح دیں۔

اس کے ساتھ ہی اسی کتاب سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی ایک اور روایت بھی ملاحظہ کر لیں جس میں وہ بتاتے ہیں کہ جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ تحریک آزادی کی قیادت کر رہے تھے اور ان کے گرد برطانوی حکومت کا ریاستی حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا، حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرس تھے، اس لیے اس صورت حال سے دارالعلوم دیوبند کے منتظمین کا پریشان ہونا فطری بات تھی اور ممکنہ خطرات و خدشات سے دارالعلوم کو بچانے کی سعی ان کی ذمہ داری بھی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ان دنوں شیخ الہند کے قریبی حلقے میں تھے۔ دارالعلوم کے نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ اس معاملہ میں وہ کہاں تک آگے جانا چاہتے ہیں اور ممکنہ خطرات سے دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام و ماحول کو بچانے کی کیا صورت ہوگی؟ مولانا گیلانیؒ کے بقول حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ان کے نزدیک دار العلوم دیوبند کے قیام کا مقصد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کی تلافی کی کوشش کرنا تھا، اس لیے تعلیم و تعلم اور درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا۔ فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا، ادا کرتا رہا۔ اب آخری کام رہ گیا ہے جسے آخری حد تک کر گزروں گا۔ چنانچہ اس کے ڈیڑھ دو برس بعد حضرت شیخ الہندؒ تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں حجاز مقدس گئے اور انقلابی تحریک کا راز فاش ہو جانے کی بنا پر گرفتار کر کے مالٹا جزیرے میں پہنچا دیے گئے۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ دینی مدارس کے جداگانہ نصاب و نظام سے ہمارے اکابر کا اصل ہدف صرف تعلیم نہیں تھا اور نہ ہی وہ "تعلیم برائے تعلیم" کے فلسفہ کے قائل تھے بلکہ وہ ملی مقاصد کے حصول کے لیے اس نظام و نصاب کو ذریعہ بنائے ہوئے تھے، اس لیے اگرچہ دینی مدارس کے تعلیمی ماحول کو قائم رکھنا اور ہر دور میں اس نظام و نصاب کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا اس نظام کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے اور دینی مدارس کے ارباب اختیار و انتظام کی ذمہ داری ہے، لیکن دینی مدارس، اس کے نظام و نصاب اور ماحول کو ملی مقاصد و ضروریات سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور دینی مدارس کے قیام کا اصل مقصد اور اہداف یہی ہے کہ امت مسلمہ کی فکری و علمی قیادت کے خلا کو پر کیا

جائے اور عالمی کفر و استعمار کے ساتھ عقیدہ و ثقافت کی جنگ میں ملت اسلامیہ کو علمی و عملی راہنمائی ان مدارس سے ملتی رہے۔

اس کے بعد ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈال لیجیے جس کا تذکرہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

”یہ کیا طریقہ ہے کہ پست و بالا، کس و ناکس ہر قسم کے طالب علموں کو دورہ حدیث میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ صرف دو چار ذہین طالب علموں کو ہی پڑھاؤں گا تاکہ کیفاً کچھ ذی استعداد علماء تیار ہو سکیں۔ حضرت تھانویؒ کا نظریہ بھی یہی تھا کہ تعلیم کی اشاعت کمّاً اور کیفاً دونوں طرح ہونی چاہیے۔ کمّاً کا طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے مدارس میں رائج ہے۔ علماء بڑی تعداد میں تیار ہوں اور ملک و بیرون ملک میں پھیلیں لیکن کیفاً اچھے علماء پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ ذہین و ذکی اور محنتی طلبہ کو لے کر الگ بیٹھا جائے۔ خود حضرت نانوتویؒ بھی مدرسہ میں بیٹھ کر نہیں پڑھایا کرتے تھے بلکہ چند اچھے طلبہ منتخب کر کے ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا احمد حسن امروہویؒ اور مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اسی طرح پیدا ہوئے۔“

(بحوالہ ماہنامہ دار العلوم دیوبند، رجب ۱۳۷۲ھ)

یعنی ہمارے بزرگوں کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ دینی مدارس کے فضلاء میں سے چند ذہین افراد کو الگ کر کے ان کی بطور خاص امتیازی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ ذہانت کی اعلیٰ سطح کو اسی سطح پر اسلام کی دعوت و تبلیغ، اسلام کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالہ اور اسلام کے خلاف عالمی کفر و استعمار کی فکری اور ثقافتی یلغار کے مقابلہ کے لیے استعمال میں لایا جا سکے اور عام مسلمانوں کی طرح جدید تعلیم یافتہ حضرات اور اعلیٰ ذہانت کے حامل افراد کی دینی راہنمائی کے لیے بھی اسی سطح پر رجال کار کی فراہمی کو ممکن بنایا جائے۔ ہمارے ہاں دینی مدارس نے شاید اسی خلا کو پر کرنے کے لیے دو تین شعبوں میں تخصص کے درجات کا اہتمام کیا ہے جو ہمارے روایتی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے ان شعبوں کی بعض ضروریات کو تو پورا کرتے ہیں، لیکن اس اہم ضرورت اور تقاضے کی تکمیل نہیں کرتے جس کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ اس کے لیے آج کے عالمی ماحول کو سمجھنا ہوگا، اسلام کے خلاف عالمی کفر کی فکری و ثقافتی جنگ کے اہداف، طریق کار اور ذرائع و وسائل کا ادراک حاصل کرنا

ہو گا اور اس کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مدارس کے فضلاء میں سے ذہین اور محنتی افراد کا انتخاب کر کے انہیں اس کام کے لیے تیار کرنا ہو گا۔

الغرض آج جبکہ دینی مدارس ایک نئے بحران کی زد میں ہیں، ان کے خلاف عالمی اور قومی سطح پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے نظام و نصاب میں ترجیحات و اصلاحات کی طرف پیشرفت کر رہے ہیں تو اس مرحلہ میں ہم یہ گزارش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملی مقاصد اور معاشرہ کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کے اصل اہداف کو سامنے رکھا جائے اور ان کی روشنی میں عملی پیشرفت کی جائے۔ ہم خود دینی مدارس کے نصاب و نظام میں بہت سی اصلاحات، ترامیم اور اضافوں کے حامی بلکہ داعی ہیں، لیکن ایسی اصلاحات و ترامیم جو دینی مدارس کو ان کے اصل اہداف و مقاصد کے اور زیادہ قریب کریں اور ان کے فضلاء کی صلاحیتوں، استعداد اور قوت کار میں اس حوالہ سے اضافہ کریں۔ ہمیں اپنی ملی و دینی ضروریات اور مغرب کے اغراض و مقاصد میں فرق کرنا ہو گا اور اس سے ہر وقت چوکنا رہنا ہو گا۔ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں ترمیم و اصلاح کی تجویز و تحریک دو دھاری تلوار ہے جو دونوں طرف چل سکتی ہے۔ اس ہتھیار کو مغرب بھی استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہم بھی اس کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، مگر دونوں کے اہداف مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ یہ دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت کی ذہانت، تدبر اور معاملہ فہمی کا امتحان ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہماری تعلیمی قیادت کو اس سلسلے میں دین و ملت کی بہتری کے لیے صحیح فیصلے کرنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، ۴ ستمبر ۲۰۰۳ء)

درسِ نظامی کے بارے میں امریکی دانش ور کے خیالات

گزشتہ دنوں امریکی دانشور پروفیسر جان وال برج کے لیکچر کے کچھ اقتباسات لاہور کے ایک قومی اخبار میں نظر سے گزرے جس میں انہوں نے ''درس نظامی'' کے نصاب و نظام کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کے بارے میں اخباری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اسلام اور دیگر مشرقی علوم کے معروف سکالر ہیں اور انہوں نے ان خیالات کا اظہار لاہور میں ''اقبال میموریل لیکچر ۲۰۰۱ء'' سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا ہے۔ اس خطاب کا اہتمام پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلاسفی نے کیا تھا اور تقریب کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر رفیق احمد نے کی۔

رپورٹ کے مطابق پروفیسر جان وال برج نے کہا کہ اسلام اتحاد اور قانون کا مذہب ہے اور اسلامی معاشرہ میں درس نظامی کا روایتی نظام ختم ہونے سے اسلامی تعلیمات کو نقصان اور اسلام میں اختلافات کے خاتمہ کے ماحول کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نوآبادیاتی نظام، جدیدیت اور سیکولرازم کے نظاموں نے اسلامی تعلیمات کے پرانے نظام ''درس نظامی'' کو ختم کر دیا ہے جس سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی قانون کی تحقیق کے حوالہ سے حوصلہ شکنی ہوئی ہے جب کہ اسلامی معاشروں کو درس نظامی کے پرانے اور فعال نظام کی ضرورت ہے۔ اسی نظام سے اسلامی معاشروں میں اختلافات کے خاتمے میں مدد ملتی تھی اور معاشرے میں برداشت عام ہوتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جدیدیت پسند اور بنیاد پرست دونوں مسلمان گروپ درس نظامی کے فعال کردار کے خاتمہ پر خاموش ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر اسلام کی تشریح اپنے حوالہ سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ درس نظامی کی روایت اس وقت صرف مصر، ایران اور عراق میں باقی ہے، باقی مسلم دنیا سے یہ روایت ختم ہو گئی ہے، حتیٰ کہ مصر میں بنیاد پرست اور لبرل مسلمان، دونوں ''الازہر'' کی روایت کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انڈونیشیا جیسے اسلامی ملک کے سرکاری اسلامی مدرسوں میں اجتہاد کے نام پر حکومتی پالیسیوں کو درست قرار دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اکثریت اسلام کو مکمل

ضابطہ حیات تسلیم کرتی ہے، ان کے نزدیک اسلامی معاشروں میں سیاست، معیشت اور سماج کو اسلام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام نے اسلامی معاشروں کے قیام پر براہ راست اثر ڈالا ہے، لہٰذا یہ قدرتی امر ہے کہ مسلمان اپنے تمام مسائل کا حل اسلام میں تلاش کریں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں درس نظامی سے دوری دکھائی دیتی ہے، سکولوں میں پڑھائی جانے والی اسلامیات میں درس نظامی کی روایت کا ذکر تک نہیں۔

پروفیسر جان وال برج کے مکمل لیکچر تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی اور ان کے جو خیالات اخباری رپورٹ کے ذریعے سے سامنے آئے ہیں، وہ ہم نے نقل کر دیے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت مغربی دانش گاہوں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے کس سطح پر تحقیق و مطالعہ کا عمل جاری ہے اور مغرب کے دانش ور اس بارے میں کس انداز سے سوچ رہے ہیں۔ پروفیسر برج نے ''درسِ نظامی'' کے حوالہ سے جس نظام تعلیم کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد اصل میں قرآن و سنت، فقہ اسلامی اور ان سے متعلقہ علوم پر مشتمل نصاب تعلیم ہے جو دنیائے اسلام پر مغربی استعمار کے تسلط سے قبل کم و بیش تمام مسلمانوں میں رائج تھا مگر مغرب کے استعماری ملکوں نے اپنے اپنے مقبوضہ مسلم ملکوں میں اس نظام تعلیم کا خاتمہ کر کے انگریزی زبان اور اس کے متعلقات کی ترویج کا بیڑا اٹھایا جس کی طرف پروفیسر موصوف نے اشارہ کیا ہے اور جس کے نتیجے میں آج دنیا کے اکثر مسلمان ملکوں میں اقتدار کے سرچشموں پر وہ کلاس قابض ہے جس کے بارے میں جنوبی ایشیا میں انگریزی تعلیم کی ترویج کرنے والے برطانوی ماہر تعلیم لارڈ میکالے نے پیشگی کہہ دیا تھا کہ اس نظام کے تربیت یافتہ افراد رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور فکر و مذاق کے اعتبار سے انگریز ہوں گے۔

ہمیں امریکی دانش ور کے تجزیہ کے اس حصے سے اتفاق ہے کہ مسلمان معاشرہ کا قیام ہی اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں ہوا ہے اس لیے اس کے بقا و تحفظ کا مدار بھی اسلامی تعلیمات پر ہے اور اسلامی تعلیمات کی بنیاد ''درس نظامی'' کے روایتی نظام پر ہے، اس لیے مسلمان ممالک کو جلد یا بدیر ''درس نظامی'' کی طرف واپس لوٹنا ہوگا، مگر پروفیسر جان وال برج نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی طرف سے درس نظامی سے بے اعتنائی کا جو شکوہ کیا ہے، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے اور ہمارے نزدیک ان کے اس تاثر کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس خطہ میں ان کی رسائی سرکاری تعلیمی اداروں اور

سرکاری رپورٹوں تک محدود ہے، ورنہ اگر وہ سرکاری تعلیمی اداروں کے ماحول سے باہر نکل کر جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں مدارس پر نظر ڈالیں جو قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی تعلیم سے لے کر قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مختلف شعبوں میں تخصص تک کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں تو انہیں اس بات کا شکوہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ پاکستان میں درس نظامی سے دوری دکھائی دیتی ہے، اور اگر وہ درس نظامی کے فعال کردار کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو وہ بھی انہیں امارت اسلامی افغانستان کی طالبان حکومت کی صورت میں زندہ حقیقت کے طور پر دکھائی دے گا جو اسی درس نظامی کا ثمر ہے۔

یہ بات درست ہے کہ دنیا کے بیشتر مسلم ممالک میں ''درس نظامی'' کا نظام باقی نہیں رہا اور اگر کہیں ہے تو وہ فعال اور مؤثر نہیں ہے جس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ درس نظامی کا نظام باقی رکھنے کے خواہشمند حضرات خود کو سرکاری نظام کی آمیزش سے نہیں بچا سکتے جس کے نتیجے میں ''الازہر'' جیسے قدیم ترین اور روایتی ادارہ کی روایت پر بھی پروفیسر جان وال برج کو شکوک و شبہات کے سائے منڈلاتے نظر آرہے ہیں لیکن جنوبی ایشیا کے درویش صفت علماء نے کسی دور میں سرکاری سسٹم کی آمیزش کو قبول نہیں کیا اور تمام سہولتوں اور پیشکشوں کو مسترد کرتے ہوئے آج بھی اپنے فقر و درویشی کو برقرار رکھ کر سرکاری گرانٹوں کی بجائے عام مسلمانوں کے دیے ہوئے چندوں اور قربانی کی کھالوں پر قناعت کرتے ہوئے ''درس نظامی'' کی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہم پروفیسر جان وال برج کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ''درس نظامی'' مغرب کی تمام تر مخالفانہ کوششوں کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ فعال بھی ہے اور یہی نظام دنیا میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار ہوگا، ان شاء اللہ۔

(روزنامہ اوصاف، ۲۸/اپریل ۲۰۰۱ء)

محراب و منبر کے وارث اور محنت مزدوری

محترم راجہ انور صاحب کو شکایت ہے کہ محراب و منبر کے وارث مزدوری کیوں نہیں کرتے ؟ ان کی بڑی تعداد محنت مزدوری یا نوکری اور تجارت سے اپنا پیٹ کیوں نہیں پالتی ؟ ان میں سے اکثر چندے اور قربانی کی کھالیں جمع کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یا وزن اٹھا کر اپنی روزی کیوں نہیں کماتے ؟

یہ شکایت نئی نہیں، بہت پرانی ہے اور جب مسجد اور مدرسہ نے ایک ریاستی ادارے کی حیثیت سے محروم ہو کر پرائیویٹ ادارے کی حیثیت اختیار کی ہے اور اسے اپنا وجود برقرار رکھنے اور نظام چلانے کے لیے صدقہ، زکوٰۃ، قربانی کی کھالوں اور عوامی چندے کا سہارا لینا پڑا ہے، تب سے یہ شکوہ زبانوں پر ہے اور مختلف طریقوں سے وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔

مغل حکومت کے دور میں مسجد و مدرسہ کو ریاستی ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے اخراجات کی ذمہ داری ریاست پر تھی۔ درس نظامی ملک کا سرکاری نصاب تعلیم تھا اور عدالتوں میں اسلامی احکام و قوانین کی عمل داری تھی۔ جب اس سارے سسٹم کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد انگریزی سرکار نے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور مساجد و مدارس کی بندش کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مخصوص اوقاف و وسائل بھی ضبط کر لیے تو باقی سارے معاملات سے قطع نظر کم سے کم عام مسلمانوں کی عبادات کا نظام برقرار رکھنے اور ان کے لیے دینی تعلیم کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے عوامی چندے اور زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے سے مسجد و مدرسہ کے نظام کو چلانے کا رجحان پیدا ہوا اور کچھ اصحاب بصیرت نے غریب عوام کے سامنے جھولی پھیلا کر زکوٰۃ و صدقہ اکٹھا کر کے، قربانی کی کھالیں جمع کر کے بلکہ ایک ایک گھر سے روٹی مانگ کر مسجد و مدرسہ کے اس نظام کو تباہ ہونے سے بچا لیا، ورنہ تاشقند اور سمرقند میں ایسی مساجد میں نے خود دیکھی ہیں اور وہاں نمازیں ادا کی ہیں جو گزشتہ نصف بلکہ پون صدی کے عرصہ میں سیمنٹ کے گودام اور سینما ہال کے طور پر استعمال

ہوتی رہی ہیں۔ اگر ہمارے ہاں کے منبر و محراب کے وارث کھالوں اور چندوں کے پیچھے نہ پھرتے تو یہاں بھی صورت حال تاشقند اور سمرقند سے مختلف نہ ہوتی۔

مسجد و مدرسہ مولوی اور چندہ کے اس نظام پر دو قسم کے حضرات کو اعتراض ہے اور ان کی شکایت کے پس منظر کو الگ الگ طور پر سمجھنا ضروری ہے۔

- کچھ حضرات کو تو اس بات پر غصہ ہے اور وہ اپنے غیظ و غضب کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کہ یہ نظام ابھی تک بدستور قائم کیوں ہے؟ اور نہ صرف قائم ہے بلکہ مغرب اور اسلام کے درمیان گلوبل سولائزیشن وار میں ایک ناقابلِ تسخیر مورچہ کی حیثیت کیوں اختیار کیے ہوئے ہے؟ اور چونکہ اس نظام کے باقی رہنے بلکہ دن بدن ترقی کرنے میں ظاہری سبب یہی صدقہ زکوٰۃ، قربانی کی کھالیں اور چندہ ہے، اس لیے انہیں یہ سارا کچھ برا لگتا ہے،
- لیکن کچھ حضرات خیر خواہی اور خلوص کے جذبہ کے ساتھ بھی اس خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں کہ علماء کرام کو صدقہ و زکوٰۃ کے بجائے کوئی ہنر اپنا کر اپنی معیشت کا انتظام کرنا چاہیے۔ ایسے دوستوں کے پیش نظر انتہائی خلوص کے ساتھ یہ بات ہوتی ہے کہ منبر و محراب کے وارثوں کا معاشرتی مقام بلند ہونا چاہیے اور انہیں لوگوں کا دست نگر ہونے کے بجائے خود کفیل ہو کر دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے تاکہ ان کی بات میں زیادہ وزن ہو اور وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ معاشرہ کی دینی قیادت کر سکیں۔

مگر منبر و محراب کے وارثوں کے لیے اس خواہش کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی مدرسہ و مسجد کے اسی نظام کا تحفظ ہے۔ کیونکہ ایک طرف حافظ، قاری اور مولوی کے ذاتی معاشرتی وقار کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف مسجد و مدرسہ کے نظام کو باقی رکھنے کے تقاضے ہیں۔ اور مولوی پوری ہوشمندی کے ساتھ آج بھی اپنے ذاتی مفاد پر مسجد و مدرسہ کے نظام کے تحفظ کو ترجیح دے رہا ہے۔

حافظ اور قاری کے ذاتی اور معاشرتی وقار کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف مسجد و مدرسہ کے نظام کو باقی رکھنے کے تقاضے ہیں اور مولوی پوری ہوش مندی کے ساتھ آج بھی اپنے ذاتی مفاد پر مسجد و مدرسہ کے نظام کو ترجیح دے رہا ہے۔ ہم ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں کہ ایک دور میں ریاست

حیدر آباد دکن کے نواب نے جو اپنے دور کے امیر ترین حکمران سمجھے جاتے تھے، دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کو پیش کش کی کہ اگر دارالعلوم کے نصاب میں کچھ جدید مضامین کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ دارالعلوم کے اخراجات میں تعاون کرنے اور دارالعلوم کے فضلاء کو اپنی ریاست میں ملازمتیں فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں تو اس کے جواب میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے یہ تاریخی جملہ کہہ کر اس پیش کش کو مسترد کر دیا تھا کہ ہم ریاست حیدر آباد کا نظام چلانے کے لیے نہیں، بلکہ مسلمانوں کی نماز، روزہ اور دینی تعلیم کا نظام باقی رکھنے کے لیے پڑھا رہے ہیں۔

ان کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم بھی اپنے مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کو جدید تعلیم کا ٹچ دے کر ریاستی نظام کے کل پرزے بنا دیں تو پھر مسجدوں میں نماز کون پڑھائے گا؟ اور لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم کون دے گا؟ اس لیے اس دور کے اکابر علماء نے شعوری طور پر حکمت عملی کے تحت اپنے طلبہ کو جدید علوم اور ہنر و فن سے دور رکھا تاکہ وہ مسجد اور مدرسہ کے علاوہ کہیں فٹ نہ آسکیں اور عام مسلمانوں کا عبادات اور دینی تعلیم کا نظام چلتا رہے، اس لیے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اسلامی نظام کے لیے رجال کار فراہم کرنے کے نقطہ نظر سے دینی مدارس کو اپنے نصاب و نظام میں ضروری تبدیلیاں کرنا چاہیے تھیں اور ہم خود اس پر مسلسل معروضات پیش کر رہے ہیں مگر جہاں تک مسجد و مدرسہ کے موجودہ نظام کی افادیت اور اس کے معاشرتی ثمرات کا تعلق ہے، اس کا دارومدار ظاہری طور پر اس صدقہ و خیرات اور قربانی کی کھالوں پر ہے۔ اس سسٹم کو طنز و طعن کا نشانہ بنا کر اس کی نفی کرنا عام مسلمانوں کی عبادات اور دینی تعلیم کے نظام کو سبوتاژ کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کے سوا اور کسی عنوان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

راجہ انور صاحب محترم نے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کرنے والے شخص کو کلہاڑی دے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹنے اور محنت کر کے پیٹ پالنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ واقعہ درست ہے اور کسی بھی تندرست شخص کے لیے یہی حکم ہے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے محنت مزدوری کر کے روٹی کمائے لیکن یہاں ایک عمومی رویہ اور الجھن کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ لوگ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انفرادی واقعات کا سہارا لے کر ان کے حوالہ سے اپنے جذبات و افکار پیش کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر اس دور کے سسٹم

اور نظام کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس مسئلہ پر ہم بات کر رہے ہیں، اس کی حیثیت جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے رائج کردہ مجموعی نظام میں کیا تھی؟ اس لیے اس سلسلہ میں دو حوالے سامنے لانا مناسب خیال کرتا ہوں۔

ایک خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کہ ان کا اپنا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اور اگر راجہ صاحب کو مسلمان حکمرانوں کی خود ان کے بقول لوٹ مار کی کہانی پھر سے یاد نہ آجائے تو یہ گزارش ہے کہ ضابطہ اور قانون کے طور پر جنگوں میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا ۱/۵ حصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کے اخراجات کے لیے مخصوص ہوتا تھا، یعنی کسی بھی جنگ میں حاصل ہونے والے کل مال غنیمت کا بیس فیصد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے متعیّن رہتا تھا جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل خانہ کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا حتیٰ کہ اسی مال غنیمت میں سے ایک بہت بڑے باغ فدک کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت سمجھتے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ سے اسے وراثت کے طور پر انہیں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ یہ باغ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے طور پر نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ بیت المال کی ملک رہے گا، البتہ اس کی آمدنی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور دیگر اہل خانہ کے اخراجات بدستور ادا کیے جاتے رہیں گے۔

دوسرا حوالہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو ان کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ سے تھوڑے فاصلہ پر سنح نامی جگہ میں ان کی کپڑے کی کھڈیاں تھیں اور وہ کپڑا بیچ کر گزارا کیا کرتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد وہ حسب معمول کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر بازار کی طرف چلے تو حضرت عمرؓ نے انہیں روک لیا کہ آپ کاروبار میں مصروف رہیں گے تو لوگوں کے معاملات کون نمٹائے گا؟ اس لیے آج کے بعد آپ کاروبار نہیں کریں گے اور کاروبار سلطنت کے لیے خود کو فارغ رکھیں گے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کی تجویز پر خلافت راشدہ کی مجلس شوریٰ کا پہلا اجلاس ہوا جس میں حضرت صدیق اکبرؓ کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اسی سے فقہائے کرام نے یہ اصول اخذ کیا کہ جو شخص بھی امت کے اجتماعی کاموں کے

لیے وقف ہو جائے، اس کے اخراجات اور ضروریات زندگی کی کفالت بھی اجتماعی آمدنی میں سے ہوگی۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت حاکم، قاضی، مجاہد، معلم اور امام وغیرہ حضرات کی تنخواہ اجتماعی آمدنی سے ادا کی جاتی ہے اور یہ صرف ہمارے ہاں نہیں، بلکہ دنیا کے ہر نظام میں یہی اصول ہے اور اجتماعی کاموں کے لیے وقت دینے والے حضرات کے اخراجات اجتماعی آمدنی میں سے ہی ادا کیے جاتے ہیں۔ اب ایک ڈپٹی کمشنر کو دیکھ لیجیے۔ اس کی تنخواہ عام لوگوں سے جمع کی گئی رقم سے ہی دی جاتی ہے اور ایک مدرسہ کے مہتمم کی تنخواہ بھی عام لوگوں سے جمع کی گئی رقم سے ہی دی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے لیے جمع کی جانے والی رقم ٹیکس کہلاتی ہے اور ریاستی ادارے لا اینڈ آرڈر کی قوت سے اسے جمع کرتے ہیں اور مہتمم مدرسہ کی تنخواہ کے لیے جمع ہونے والی رقم کو چندہ کہا جاتا ہے جو لوگ رضا کارانہ طور پر پیش کر دیتے ہیں۔

بات کچھ لمبی ہوتی جا رہی ہے، لیکن اس حوالہ سے ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مولوی صاحبان صرف پانچ وقت کی نمازیں پڑھا کر سارا دن فارغ بیٹھے رہتے ہیں اور لوگوں کے چندوں پر عیش کرتے ہیں، اس لیے اس فراغت اور عیش کی جھلک بھی سامنے آجائے تو مناسب ہوگا اور اس کے لیے میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں سرگودھا سے تعلق رکھنے والے قاری محمد ریاض صاحب امام ہیں جن کی ذمہ داری یہ ہے کہ انہوں نے پانچ وقت نمازوں کی امامت کے لیے موجود رہنا ہے اور اس کے علاوہ ان کی روزمرہ ذمہ داری کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ صبح اذان فجر سے پہلے اٹھ کر وہ قرآن کریم پڑھنے والے بچوں کو پڑھاتے ہیں، جو اذان فجر سے لے کر قاری صاحب کی نگرانی میں ۱۱ بجے دن تک پڑھتے ہیں۔ پھر ظہر سے عصر تک پڑھاتے ہیں اور اس کے بعد مغرب سے عشاء تک پھر سبق یاد کرنے والے بچوں کی نگرانی کے لیے انہیں بیٹھنا ہوتا ہے۔ اس ”فراغت“ کے عوض میں انہیں جو ”عیش“ فراہم کی جاتی ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ انہیں اسلام آباد کے چوتھے درجے کے ملازمین کے معیار کا ایک کوارٹر مسجد کی طرف سے دیا گیا ہے جس میں وہ اپنے بیوی بچوں سمیت رہتے ہیں۔ پانی، بجلی، گیس کا بل ان کے ذمے نہیں ہے اور انہیں مبلغ تین ہزار روپے تنخواہ دی جاتی ہے، وہ بھی اس سال رمضان المبارک میں انتظامیہ سے ضد کر کے میں

نے کرائی ہے، ورنہ اس رمضان سے پہلے تک انہیں صرف دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی رہی ہے۔

اور اگر راجہ صاحب محترم زیادہ ناراض نہ ہو جائیں تو ڈرتے ڈرتے ایک اور بات کہنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ نیکی اور عبادت صرف نماز پڑھانا اور بچوں کو دینی تعلیم دینا ہی تو نہیں ہے۔ عدالت میں بیٹھ کر لوگوں کو انصاف مہیا کرنا بھی نیکی ہے اور اسے عبادت کا درجہ حاصل ہے اور جس طرح قرآن پڑھانے کا کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح انصاف کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اس لیے تھوڑی سی ہمت کر کے وہ یہ بھی فرما دیں کہ عدالت کے منصب پر بیٹھ کر لوگوں کو انصاف مہیا کرنے والے مزدوری کر کے یا نوکری اور تجارت کر کے اپنا پیٹ کیوں نہیں پالتے اور لوگوں سے وصول کی جانے والی اجتماعی رقم سے تنخواہ حاصل کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یا وزن اٹھا کر اپنی روزی کیوں نہیں کماتے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، ۱۰/ مارچ ۲۰۰۰ء)

دینی مدارس اور جدید سائنسی علوم

گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ر) خالد مقبول نے رمضان المبارک کے دوران میں لاہور کے تین دینی مراکز کا دورہ کیا اور علماء و طلبہ کے سامنے اپنے خیالات اکا اظہار کیا۔ وہ جامعہ اشرفیہ مسلم ٹاؤن، جامعہ نظامیہ لوہاری گیٹ اور جامعہ عثمانیہ ماڈل ٹاؤن تشریف لے گئے، اساتذہ و طلبہ اور مسجد کے نمازیوں سے ملاقات کی اور ان سے مختلف امور پر بات چیت کی۔ اس سے قبل وفاقی وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر نے کراچی میں دارالعلوم کورنگی کا دورہ کیا اور اساتذہ و طلبہ سے بعض امور پر گفتگو کی۔

ہمارا خیال ہے کہ دینی مدارس کے حوالے سے اس وقت عالمی حلقوں کی طرف سے جو دباؤ بڑھ رہا ہے، اس کے پیش نظر حکومت کے ذمہ دار حضرات ملک کے بڑے دینی مدارس کا دورہ کر رہے ہیں جس کا مقصد اس دباؤ کے سلسلے میں اہم دینی مدارس کے منتظمین کو اعتماد میں لینا معلوم ہوتا ہے جو بہر حال ایک خوش آئند بات ہے اور دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کو اس معاملہ میں سنجیدہ غور و خوض کی کوئی صورت ضرور نکالنی چاہیے تاکہ دینی مدارس کے تعلیمی کردار، خود مختاری اور آزادانہ نظام کی ضرورت و اہمیت کا ارباب اختیار کو احساس دلاتے ہوئے اس کے تحفظ کا بھی کوئی باوقار راستہ نکل آئے۔

دینی مدارس کے تعلیمی کردار اور معاشرہ پر اس کے اثرات کے بارے میں عالمی حلقوں کو ایک عرصہ سے تشویش ہے اور وہ مسلم امہ میں مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفہ و نظام کے اثر و نفوذ میں جو فکری و نظریاتی رکاوٹیں محسوس کر رہے ہیں، ان کے خیال میں ان رکاوٹوں کا سرچشمہ یہ آزاد دینی مدارس ہیں، اس لیے عالمی حلقوں کی مدت سے یہ کوشش ہے کہ دینی مدارس کے اس آزادانہ اور خود مختار و خود کار نظام کو یا تو سرے سے ختم کر دیا جائے اور یا پھر اسے قومی تعلیمی نظام کے اجتماعی دھارے میں اس طرح ضم کر دیا جائے کہ وہ حکومتی پالیسیوں کے دائرہ سے ہٹ کر معاشرے میں کوئی امتیازی

اور انفرادی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس مقصد کے لیے اس سے قبل بھی مختلف حکومتوں کے دور میں دینی مدارس میں سرکاری مداخلت کے راستے نکالنے کی متعدّد کوششیں کی گئی ہیں جنہیں دینی مدارس نے اجتماعی طور پر مسترد کر دیا تھا اور اب ۱۱ر ستمبر کے واقعات اور افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد اس کام کو پہلے کی نسبت آسان تصور کرتے ہوئے حکومتی حلقے پھر اس قسم کا کوئی راستہ تلاش کر رہے ہیں کہ دینی مدارس کے آزادانہ کردار کو محدود کرنے، اس نظام میں ریاستی مداخلت کی راہ ہموار کرنے اور ان کے امتیازی تعلیمی تشخص کو ختم کر کے انہیں سرکاری پالیسی کے تابع قومی تعلیمی نظام کے اجتماعی دھارے میں ضم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں مگر دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ اور جماعت اسلامی کے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے دینی مدارس کے پانچوں وفاقوں، وفاق المدارس العربیہ، تنظیم المدارس، وفاق المدارس السلفیہ، وفاق المدارس الشیعہ اور رابطۃ المدارس الاسلامیہ نے گزشتہ دنوں ایک مشترکہ اجلاس میں ہر قیمت پر دینی مدارس کے آزادانہ تعلیمی کردار اور مالیاتی و انتظامی خود مختاری کے تحفظ کا عزم کرتے ہوئے ۶ر جنوری کو جامعہ نعیمیہ لاہور، ۲۰ر جنوری کو بنوری ٹاؤن کراچی، ۳ر فروری کو درویش مسجد پشاور اور ۱۰ر فروری کو اسلام آباد میں ''اجتماعی کنونشن'' منعقد کرنے کا اعلان کر دیا ہے جس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ دینی مدارس حسب سابق اپنی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے متحد ہیں اور حکومتی اقدامات کی مزاحمت کے لیے مکمل طور پر تیار ہیں۔

اس فضا میں جنرل (ر) معین الدین حیدر اور جنرل (ر) خالد مقبول کے دینی مدارس کے یہ دورے اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اعلیٰ سرکاری حلقے افغانستان کی صورتحال اور طالبان حکومت کے خاتمے کے دینی مدارس پر پڑنے والے اثرات کا براہ راست جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے اقدامات کی ترجیحات طے کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی شاید ان کی یہ خواہش بھی ہو کہ کچھ اہم تعلیمی مراکز کو دینی مدارس کی اجتماعی مزاحمتی جدوجہد سے الگ رکھنا اگر ممکن ہو تو اس کے لیے ابھی سے پیشرفت کر لی جائے، مگر ان سب امور سے قطع نظر ہم گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول کے ان ارشادات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نظامیہ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ دنیائے اسلام کو اس وقت بہت بڑا چیلنج درپیش ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ، اقتصادی وسائل اور ٹیکنالوجی پر دسترس رکھنے والی قوتوں نے اسلام اور پاکستان کا غلط اور غیر حقیقی رخ پیش کر کے ہمارے مذہب وملک کو ٹارگٹ بنالیا ہے۔ ذرائع ابلاغ وجدید ٹیکنالوجی پر حاوی ہونے کے سبب یہ ممالک اپنے مفادات کا بھرپور تحفظ کر رہے ہیں کیونکہ وہ جو بات کہتے ہیں، دنیا اس کو تسلیم کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے جذبات اور نیتوں میں کوئی خرابی نہیں لیکن ہم دور جدید کے وسائل و ذرائع سے محروم ہونے کے سبب اپنے مفادات کا مؤثر تحفظ کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں مغربیت اور جدید ٹیکنالوجی کے حصول میں فرق کرنا ہوگا کیونکہ ایک اچھا ہتھیار مومن یا غیر مومن دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مخالفین کو جدید سائنسی علوم و تحقیقات میں کمال حاصل ہے جبکہ ہم کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھی اغیار کی فنی مہارت و امداد کے محتاج ہیں۔ غیر ممالک سے خوراک و ادویات اور دیگر سازوسامان حاصل کرنے کی صورت میں ہم برائے نام آزاد و خود مختار رہ جاتے ہیں۔

ہمیں جنرل خالد مقبول کے ان ارشادات سے سو فیصد اتفاق ہے اور ہم ان کی دونوں باتوں کی تائید کرتے ہیں۔ اس بات کی بھی کہ اس وقت دنیا کے سامنے اسلام اور پاکستان کی صحیح تصویر پیش نہیں کی جا رہی ہے اور مغربی میڈیا جان بوجھ کر اسلام اور پاکستان کی تصویر بگاڑ رہا ہے جب کہ اسلام کی بات کہنے والے حلقے اور مراکز ابلاغ کے جدید ذرائع اور سائینٹیفک اسلوب سے بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کو اسلام کی تعلیمات اور اس کے حقیقی کردار سے آگاہ نہیں کر پا رہے اور ان کی اس بات سے بھی ہم پوری طرح متفق ہیں کہ عالم اسلام کی بے بسی اور مغربی قوتوں کی بالادستی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب کو سائنسی علوم و تحقیقات اور جدید ترین ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل ہے جب کہ عالم اسلام اس سے محروم ہے اور اس کی وجہ سے نہ صرف مسلم ممالک کی آزادی اور خود مختاری برائے نام رہ گئی ہے بلکہ خود عالم اسلام کے اپنے بے پناہ وسائل اور دولت بھی مسلمانوں کے بجائے ان پر گھیرا تنگ کرنے والوں کے کام آ رہی ہے۔

البتہ گورنر پنجاب نے یہ باتیں جہاں کھڑے ہو کر فرمائی ہیں، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ باتیں کہنے کی صحیح جگہ جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نظامیہ نہیں ہے اور نہ ہی دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ

ان باتوں کے صحیح مخاطب ہیں۔ گورنر صاحب اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ جنوبی ایشیا پر برطانوی استعمار کے تسلط اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلم معاشرہ میں ایک فطری تقسیم کار وجود میں آگئی تھی جس کے تحت دو الگ الگ تعلیمی نظام وجود میں آئے تھے۔ ایک نظام دینی مدارس کا تھا جس نے اپنے ذمہ صرف یہ کام لیا تھا کہ وہ دینی علوم و روایات کا تحفظ کریں گے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے نشانات کو باقی رکھتے ہوئے اسے حملہ آور تہذیب میں ضم ہونے سے بچائیں گے، جب کہ دوسرے تعلیمی نظام نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ مسلمانوں کو جدید علوم، سائنس، ٹیکنالوجی اور تحقیقات سے بہرہ ور کیا جائے گا اور انہیں معاصر اقوام کی ترقی سے ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد کی جائے گی۔

جہاں تک دینی مدارس کی ذمہ داری، جدوجہد اور اس کے نتائج کا تعلق ہے، آج وہ اس معاملہ میں پوری طرح سرخرو ہیں کہ انہوں نے اسلامی علوم و فنون کی صرف حفاظت نہیں کی بلکہ کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر معاشرہ کے لاکھوں افراد کو ہر دور میں اسلامی علوم سے بہرہ ور کیا اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے صرف نشانات کو باقی نہیں رکھا بلکہ طالبان حکومت کی صورت میں اس کا عملی نمونہ بھی اس انداز سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ دیکھنے والے پکار اٹھے کہ یہ تو وہی دو سو سالہ پرانا نمونہ ہے اور انہوں نے تو گزشتہ دو صدیوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی سرے سے کوئی اثر قبول نہیں کیا، اس لیے دینی مدارس سے کسی درجہ میں یہ شکایت تو ہو سکتی ہے (اگر اس شکایت کو درست تسلیم کر لیا جائے) کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی، انہوں نے اتنی سختی اور شدت سے اس کی حفاظت کی اور اسے آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا ہے کہ اسے زمانے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی، مگر جدید ٹیکنالوجی، سائنسی تحقیقات اور علوم میں قوم کے پیچھے رہ جانے پر دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا اور ان کے اساتذہ و طلبہ کے درمیان کھڑے ہو کر سائنس و ٹیکنالوجی اور ابلاغ کے جدید ترین ذرائع سے محرومی کا رونا رونا نہ صرف سراسر ناانصافی ہے بلکہ انتہائی بے ذوقی کی بات بھی ہے۔

آج اگر ہم جدید سائنسی علوم، ٹیکنالوجی اور تحقیقات کی صلاحیت و مواقع سے محروم ہیں تو اس کی ذمہ داری دینی مدارس پر نہیں بلکہ اس تعلیمی نظام پر ہے جس نے ڈیڑھ سو برس قبل اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس نے جنرل خالد مقبول کے بقول مغربیت کو قبول کرنے میں تو کسی حجاب سے کام نہ

لیا لیکن جدید ٹیکنالوجی کی طرف اس کے قدم نہ بڑھ سکے اور اس تعلیمی نظام کی نااہلی نے ہماری آزادی اور خود مختاری کو بے بسی کی دلدل سے دوچار کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمیں جنرل خالد مقبول کی باتوں سے اتفاق ہے اور ہم ان میں پوری طرح ان کے ساتھ ہیں لیکن اتنی گزارش کے ساتھ کہ یہ باتیں کہنے کی جگہ جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نظامیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی اور وفاقی وزارت تعلیم کا پالیسی ونگ ہے۔ کیا جنرل (ر) معین الدین حیدر اور جنرل (ر) خالد مقبول اس بات کو پسند کریں گے کہ جدید سائنسی علوم و تحقیقات اور جدید ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کے لیے ایک قومی کمیشن قائم کیا جائے جو اسباب و عوامل کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اس کے ذمہ داروں کا تعین کرے اور اس ناکامی کی تلافی کے لیے طریقہ کار اور اقدامات بھی تجویز کرے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں مگر قدم تو صحیح سمت اٹھائیے!

(روزنامہ اوصاف، ۲۸/ دسمبر ۲۰۰۱ء)

دینی مدارس کے بارے میں پانچ سوالات کے جوابات

پچھلے دنوں پاکستان کے مختلف شہروں میں دینی مدارس کے سالانہ اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا اور عام طور پر دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور کردار کے حوالے سے عام ذہنوں میں پائے جانے شکوک و شبہات اور سوالات کا جائزہ لیا گیا۔ ان میں جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ خان پور، جامعہ مفتاح العلوم سرگودھا، دارالعلوم ربانیہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، مدرسہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا، جامعہ رشیدیہ ساہیوال، جامعہ عثمانیہ شورکوٹ، جامعہ انوار القرآن آدم ٹاؤن کراچی، جامعہ مدینۃ العلم فیصل آباد، جامعہ فاروقیہ شیخوپورہ اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان اجتماعات میں ہونے والی گفتگو کا خلاصہ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے:

دینی مدارس کے بارے میں عام طور پر چار پانچ سوالات ذہنوں میں پائے جاتے ہیں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پروپیگنڈا کے ساتھ ساتھ قومی سطح پر بھی ان کے بارے میں شکوک و شبہات اور تحفظات کا اظہار کیا جا رہا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات اور شبہات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے۔ سوالات یہ ہیں:

۱۔ دینی مدارس اپنے نصاب میں جدید علوم اور آج کی ضروریات مثلاً سائنس، ریاضی، انگلش زبان اور کمپیوٹر وغیرہ کو شامل کیوں نہیں کر رہے اور انہیں اس سلسلہ میں کیا رکاوٹ اور حجاب ہے؟

۲۔ جب ملک کے ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی انتظام کے تحت چل رہے ہیں اور حکومت کے مختلف شعبے ان کا کامیابی کے ساتھ انتظام چلا رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں آنے سے انکار کیوں ہے اور وہ اپنا جداگانہ نظام اور تشخص قائم رکھنے پر کیوں مصر ہیں؟

۳۔ اگر ورلڈ اسٹیبلشمنٹ یا ریاستی ادارے دینی مدارس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جاتے

ہیں تو دینی تعلیم کے جس جداگانہ تشخص کی بات کی جاتی ہے، اس کا مستقبل کیا ہو گا؟ اور دینی حلقے اپنا روایتی کردار کس طرح برقرار رکھ سکیں گے؟

۴۔ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور روزگار کے تحفظ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کا حل کیا ہے؟

۵۔ دینی مدارس اپنے خلاف ملکی اور عالمی سطح پر پائی جانے والی مہم کو موجودہ عالمی حالات میں کس نظر سے دیکھتے ہیں اور موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں ان کا موقف کیا ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں انگلش زبان، سائنس، ریاضی اور دیگر جدید ضروری علوم و فنون کو شامل کرنے سے کیوں انکاری ہیں، اس کے جواب میں تین گزارشات پیش خدمت ہیں:

پہلی گزارش یہ ہے کہ دینی مدارس کو جائز حد تک ان علوم و فنون کو اپنے نصاب میں شامل کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے۔ اب تک مسئلہ زیادہ تر وسائل کا رہا ہے کہ دینی مدارس کے وسائل محدود ہوتے ہیں اور انہیں تھوڑے وسائل کے ساتھ اپنا کام چلانا پڑتا ہے، لیکن اس کے باوجود دینی مدارس نے انگریزی، ریاضی، سائنس اور کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ کے مضامین کو اپنے نصاب میں بتدریج شامل کرنے کا سلسلہ کچھ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے اور دینی مدارس کے تمام وفاق میٹرک کی سطح تک اپنے نصاب میں یہ مضامین شامل کر چکے ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کی جائز حد دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کے نزدیک میٹرک ہے۔ اس کے بعد کے نصاب میں ان مضامین کی شمولیت ضروری نہیں بلکہ بعض حوالوں سے نقصان دہ ہے، اس لیے میٹرک کے بعد کے درجات میں ان مضامین کو شامل نصاب کرنے کے لیے دینی مدارس تیار نہیں ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد تعلیم کے دائرے تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہر دائرہ میں اسی شعبہ کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں دوسرے شعبوں کے مضامین کو شامل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً لا کالج میں صرف قانون کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، انجینئرنگ میں صرف اس سے متعلقہ مضامین

کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں قانون پڑھانے کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا، اور میڈیکل کالج میں صرف طب سے متعلقہ مضامین شامل نصاب ہوتے ہیں اور اس میں انجینئرنگ کے مضامین کی تعلیم کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح دینی تعلیم بھی ایک مستقل شعبہ ہے اور بنیادی تعلیم کی حد میٹرک ہو یا ایف اے، اس کے بعد دینی علوم کے نصاب میں دیگر شعبوں کے مضامین شامل کرنے کا مطالبہ بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے لا کالج میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ کیا جائے یا میڈیکل کالج میں قانون پڑھانے کا تقاضا کیا جائے۔

اس سوال کے جواب میں تیسری گزارش ذرا تلخ سی ہے لیکن اس موقع پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے محترم گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول گزشتہ دنوں جامعہ اشرفیہ لاہور میں تشریف لے گئے اور اساتذہ و طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ہم معاصر اقوام کے سامنے ذلیل ہو رہے ہیں، اس لیے دینی مدارس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس کے جواب میں راقم الحروف نے ایک مضمون میں تفصیل کے ساتھ گزارش کی کہ ان کے اس ارشاد سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوتوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اسی کی مسلسل مار کھا رہے ہیں، لیکن اس کا ذمہ دار دینی مدارس کو قرار دینے اور ان سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینے کے تقاضے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوتوں سے بہت زیادہ پیچھے رہ گئے ہیں اور اس کا احساس ہمیں زیادہ ہے جو مسلمانوں کے عقیدہ و ثقافت کے تحفظ کی جنگ میں مغرب کے مقابلہ میں عملی طور پر صف آرا ہیں اور صرف ایک مثال سے اس صورت حال کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل اللہ تعالیٰ نے ہمارے زوال و ادبار کے دور میں ہمیں خلیج عرب میں تیل کے چشموں کی عظیم دولت سے نوازا تھا مگر ہماری نااہلی کی صورت حال یہ تھی کہ ہم زمین کھود کر تیل نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے، تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی اہلیت ہم میں نہیں تھی اور ریفائن کرنے کے بعد اسے دنیا میں بیچنے یعنی مارکیٹنگ کی صلاحیت سے بھی ہم بے بہرہ تھے، مگر ہم نے اپنی اس نااہلی کو دور کرنے اور ان چیزوں کی صلاحیت حاصل کرنے کے بجائے اس کام کے لیے

مغربی ماہرین کو بلایا۔ ماہرین آئے، ان کے بعد مغرب کی کمپنیاں آئیں، پھر دولت سمیٹنے کے لیے مغرب کے بینک آگئے، ان کے پیچھے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے سفارت کاروں اور سیاست کاروں نے چکر لگانا شروع کیے اور آخر میں مغربی ممالک کی فوجیں آئیں جو تیل کے چشموں کا گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

زمین ہماری ہے، چشمے ہمارے ہیں، اور تیل بھی ہمارا ہے، لیکن کنٹرول مغربی کمپنیوں کا ہے اور تیل سے حاصل ہونے والی دولت مغربی بینکوں میں ہے جو ہماری نا اہلی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہم آج بھی پون صدی گزر جانے کے باوجود ان تینوں صلاحیتوں سے کورے ہیں، جبکہ ابھی چند روز قبل امریکی وزارت دفاع پینٹاگون میں دی جانے والی ایک بریفنگ میں واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی ہدایات و احکام پر پوری طرح عمل نہ کیا تو تیل کے چشموں پر براہ راست قبضہ کیا جاسکتا ہے اور مغربی ملکوں میں سعودی عرب کے اثاثے ضبط اور مغربی ملکوں میں اس کے اکاؤنٹس منجمد کیے جاسکتے ہیں۔ اس صورت حال کا دکھ اور تکلیف ہم دینی حلقوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے؟ لیکن اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کے دوسری قوتوں سے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور اس میں دینی مدارس کا قصور کیا ہے؟

۱۸۵۷ء میں دہلی پر تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جب متحدہ ہندوستان میں ہمارے صدیوں سے چلے آنے والے نظام تعلیم کو کلیتاً ختم کر دیا گیا اور تمام تر تعلیمی اور تہذیبی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا گیا تو اس وقت تعلیمی محاذ پر دو طبقے سامنے آئے۔ ایک علماء کرام کا گروہ تھا جس نے مسجد و مدرسہ کو آباد رکھنے، قرآن و سنت کی تعلیم کا سلسلہ باقی رکھنے، مسلمانوں کے عقیدہ و اعمال کے تحفظ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا تسلسل جاری رکھنے کی ذمہ داری قبول کی اور اس کے لیے کسی قسم کے ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون سے بے نیازی اختیار کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے رضاکارانہ تعاون سے دینی مدارس کے آزادانہ نظام کی بنیاد رکھی، جبکہ دوسری طرف انگریزی زبان اور سائنس و ٹیکنالوجی جیسے جدید علوم کی ترویج و تعلیم کے لیے ایک دوسرا طبقہ سامنے آیا جس نے سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر علوم میں مسلمانوں کو دوسری اقوام کے برابر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور ایک

مستقل نظام تعلیم کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس نظام کا آغاز بھی رضا کارانہ چندہ سے ہوا تھا، لیکن اسے بتدریج ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون حاصل ہوتا چلا گیا اور بہت جلد ریاست و حکومت نے اس نظام کی تمام تر ذمہ داری اور اخراجات اپنے کھاتے میں ڈال لیے۔

دینی مدارس نے اپنا نظام عام مسلمانوں کے چندہ سے چلایا اور کسی حکومت سے نہ مالی امداد طلب کی اور نہ ہی کسی حکومت کی مالی مدد اس درجہ میں قبول کی کہ اس پر مدارس کے نظام کا انحصار ہو۔ علماء کرام نے اپنی عزت نفس کی پروا نہ کرتے ہوئے زکوٰۃ مانگی، صدقات مانگے، خیرات مانگی، عطیات مانگے حتیٰ کہ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر روٹیاں مانگیں۔ میں نے خود طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے مختلف محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر گھروں سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم چند طالب علم گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر روٹیاں مانگ کر لاتے تھے اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے سب طلبہ وہ روٹیاں کھا کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برصغیر کے طول و عرض کے اکثر مدارس میں ایک عرصہ تک جاری رہا اور اس طریقہ سے دینی مدارس نے نہ صرف عام مسلمانوں تک قرآن و حدیث کی تعلیم کو پہنچایا ہے بلکہ ان کی مسجدوں اور مدرسوں کو آباد رکھا ہے، ملک بھر کی لاکھوں مساجد میں نماز پڑھانے والے امام مہیا کیے ہیں، قرآن کریم کی تعلیم دینے والے اور رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن کریم سنانے والے لاکھوں حافظ اور قاری فراہم کیے ہیں، دینی علوم کی تعلیم دینے والے لاکھوں مدرسین تیار کیے ہیں، مسائل بتانے والے ہزاروں مفتی پیدا کیے ہیں، خطبات دینے والے خطیب مقرر اور واعظ تیار کیے ہیں، کتابیں لکھنے والے مصنفین دیے ہیں، دنیا بھر میں دین اسلام کی دعوت دینے والے لاکھوں مبلغین بھیجے ہیں اور اس سب سے بڑھ کر میدان جنگ میں کفر و ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھا کر جنگ کرنے والے ہزاروں مجاہدین بھی ان مدارس نے فراہم کیے ہیں، اس لیے اپنی ذمہ داری اور مشن کے حوالے سے دینی مدارس پر کوتاہی کا کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ملک کے کسی حصے میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر نہیں ہے، جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب نہیں مل رہا، قرآن کریم پڑھانے والا قاری اور رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ موجود نہیں ہے، دینی علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے مدرسین کی کمی ہے، مسئلہ بتانے والے مفتی حضرات کا فقدان ہے یا دین کی دعوت دینے والے مبلغ کی آواز نہیں پہنچ رہی تو اس کے لیے دینی

مدارس کو موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے اور ان کی کوتاہی شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈالنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ان لوگوں سے دریافت کیجیے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے برابر لانے کا عہد کیا تھا، اس کے لیے کم از کم ایک صدی سے انہیں ریاستی وسائل میسر چلے آ رہے ہیں اور قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں کے برابر لانے میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ بلکہ میری گزارش ہے کہ اس مقصد کے لیے قومی تعلیمی کمیشن قائم کیا جائے جو اس بات کا جائزہ لے کہ ریاستی نظام تعلیم ملی اور قومی مقاصد کے حصول میں کیوں ناکام رہا ہے؟ اس کی ذمہ داری کا تعین کیا جائے اور اس عظیم ناکامی کی تلافی کے لیے اقدامات و تجاویز طے کی جائیں۔ چنانچہ میں نے گورنر پنجاب سے اپنے مضمون میں گزارش کی ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کا رونا ضرور روئیں اور ان علوم کی طرف توجہ کی تلقین بھی ضرور کریں لیکن اس شکوہ اور تلقین کی جگہ جامعہ اشرفیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر یہ گلے شکوے دہرائیں اور اپنی ناکامی کی سیاہی غریب مولوی کے چہرے پر ملنے کی کوشش نہ کریں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب ملک کے دیگر ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی کنٹرول میں چل رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری نظام و کنٹرول کے دائرہ میں آنے سے کیوں انکار ہے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔ ایک تو اصولی بات ہے اور دوسری واقعاتی۔

اصولی بات یہ ہے کہ تعلیم صرف ایک پیشہ وارانہ کام نہیں بلکہ مشن ہے جس کے کچھ اہداف ہوتے ہیں اور جس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان مشرق اور مغرب جیسی دوری ہے اور دونوں کا ہدف اور ٹارگٹ ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہے، اس لیے دینی مدارس کے نظام کو ریاستی نظام کے تابع کرنے کا مطلب اس ہدف، مشن اور مقصد سے دست برداری ہو گا جس کے لیے دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اگر ریاستی نظام تعلیم اپنا قبلہ درست کر لے جو ایک نظریاتی اسلامی ریاست اور حکومت قائم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے تو ایک خالص اسلامی

نظریاتی ریاست و حکومت کے نظام کی بالادستی قبول کرنے سے دینی مدارس کو قطعی طور پر کوئی انکار نہیں ہو سکتا، لیکن سیکولر اہداف رکھنے والے ریاستی نظام کے کنٹرول کو قبول کرنا دینی مدارس کے لیے اپنے بنیادی مشن اور ہدف سے محروم ہو جانا ہوگا، اس لیے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات واقعاتی ہے جو اس اصولی گزارش کی عملی تصدیق کرتی ہے کہ بعض دینی مدارس کو سرکاری نظام کے تحت چلانے کا تجربہ ہم اس سے قبل کر چکے ہیں جو ناکام ثابت ہوا ہے۔ صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تھا جس نے ملک بھر میں ہزاروں مساجد، مزارات، اور ان کے ساتھ بیسیوں مدارس کو تحویل میں لے لیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ان کا نظام صحیح نہیں ہے اور ان کی مالیات میں گڑبڑ ہوتی ہے، اس لیے انہیں سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے تاکہ ان کے نظام کو زیادہ بہتر طریقہ سے چلایا جائے، لیکن عملاً یہ ہوا کہ نظام پہلے سے بھی خراب ہو گیا جس کا مشاہدہ محکمہ اوقاف کے زیر انتظام مساجد اور عام مسلمانوں کی آزادانہ کمیٹیوں کے تحت قائم مساجد کے نظاموں کا کسی بھی شعبہ میں تقابل کر کے کیا جا سکتا ہے، جبکہ محکمہ اوقاف نے کتنے ہی دینی مدارس بھی اس وقت تحویل میں لیے جن کا وجود تک باقی نہیں رہا اور اس کی ایک واضح مثال اوکاڑہ کے گول چوک کی جامع مسجد میں قائم جامعہ عثمانیہ کی شکل میں موجود ہے جس کا مشاہدہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت جا کر کر سکتا ہے۔ محکمہ اوقاف کی تحویل میں جانے سے قبل یہ مدرسہ ملک کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا اور اس میں سینکڑوں طلبہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر اب وہاں کوئی درس گاہ نہیں ہے، جبکہ مدرسہ کے کمرے محکمہ اوقاف نے مختلف لوگوں کو کرائے پر دے رکھے ہیں۔

صدر محمد ایوب خان مرحوم ہی کے دور میں ریاست بہاولپور باقاعدہ طور پر پاکستان میں ضم ہوئی تو وہاں کا سب سے بڑا دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا جسے محکمہ تعلیم نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسے اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا، دینی نصاب تعلیم اور سرکاری نصاب کو ملا کر ایک مشترکہ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا، علامہ شمس الحق افغانی، مولانا سید احمد سعید کاظمی اور مولانا عبد الرشید نعمانی جیسے بہت سے علماء کرام کو مختلف حصوں سے اٹھا کر بہاولپور میں بٹھایا گیا، اور ایک ماڈل دار العلوم یا ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا اعلان کیا گیا، لیکن آج اس کی حالت یہ ہے کہ دینی نصاب تعلیم کے مضامین اس کے نصاب سے بتدریج خارج ہو چکے ہیں اور اس کا نصاب اب وہی ہے جو ملک کی دیگر سرکاری

یونیورسٹیوں کا ہے جبکہ اس کے معیار کا حال یہ ہے کہ جس طالب علم کو ملک کی کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا، اس کے لیے اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم اور محکمہ اوقاف دونوں کے ہاتھوں مختلف دینی مدارس کا یہ حشر دیکھنے کے بعد اگر دینی مدارس سے یہ توقع رکھی جا رہی ہے کہ وہ سرکاری کنٹرول کو قبول کر لیں گے اور محکمہ تعلیم یا محکمہ اوقاف کے نظام میں شامل ہونے کے بعد ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گی تو اسے سادگی اور بھولپن کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اس لیے بڑے ادب سے گزارش ہے کہ ہم ماضی قریب میں ماڈل دارالعلوم اور سرکاری نظام کا تلخ تجربہ کر چکے ہیں اور اس تجربہ کو دہرانے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ مومن کا وصف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جیسا کہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اس بات پر تلی بیٹھی ہے اور ریاستی ادارے بھی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ دینی مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے سنہرے عنوان اور انہیں جدید وسائل اور سہولتیں فراہم کرنے کی خوشنما ترغیب کے ساتھ سرکاری کنٹرول میں لایا جائے تو اگر خدانخواستہ یہ عناصر اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر آزادانہ دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہو گا؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں، کیونکہ طاقت کا استعمال اور چیز ہے اور فکر و عقیدہ کو تبدیل کرنا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ طاقت اور جبر و تشدد کے ذریعہ جسموں کو ختم کر سکتا ہے۔ وہ ”ڈیزی کٹر“ کی بارش کر سکتا ہے، انسانی جسموں کے پرخچے اڑا سکتا ہے اور بلڈنگوں اور آبادیوں کو تہس نہس کر سکتا ہے، لیکن کسی کے ذہن و عقیدہ کو تبدیل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

گزشتہ دنوں امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول پاکستان تشریف لائے۔ آنے سے قبل ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ وہ پاکستانی معاشرے کو سیکولر بنانے کے ایجنڈے پر بھی بات کریں گے۔ ایک مضمون میں راقم الحروف نے ان سے گزارش کی کہ وہ اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان سے قبل اب سے دو صدیاں پہلے برطانیہ بھی اسی ایجنڈے پر جنوبی ایشیا میں آیا تھا۔ اس نے ہزاروں دینی مدارس بند کر دیے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی تھیں، بلڈنگیں قبضے میں لے لی تھیں، بہت سی عمارات بلڈوز کر دی تھیں، ہزاروں علماء کرام کو شہید کر دیا تھا اور ہزاروں کو جیلوں میں

ڈال دیا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شہادت کے بعد ۱۹۴۷ء تک ایک سو نوے برس برطانیہ یہاں اسی ایجنڈے پر کام کرتا رہا، لیکن آج نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ مدارس کی تعداد پہلے سے زیادہ ہے، مولوی، حافظ، قاری، خطیب، مدرس، مبلغ اور مجاہد اپنی تعداد اور کارکردگی دونوں حوالوں سے پہلے سے بہتر پوزیشن میں ہیں، اس لیے کسی بھی طاقت ور کو یہ غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ وہ طاقت اور جبر کے ذریعے سے دینی تعلیم کو ختم کر سکتا ہے اور بلڈنگوں پر قبضہ کر کے، علماء کرام کو گرفتار کر کے یا ان کے ایک حصے کو ملازمتوں اور سہولتوں کے نام پر جال میں پھانس کر دینی تعلیم اور اس کے آزادانہ کردار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بات بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ دینی مدرسہ بلڈنگ یا زمین کا نام نہیں ہے بلکہ مولوی اور سوسائٹی کے تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق اگر قائم ہے تو دینی مدرسہ بھی قائم ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ میں اس پر ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مولوی اور سوسائٹی کا تعلق قائم ہے۔ یہ تعلق لین کا بھی ہے اور دین کا بھی ہے۔ دین کا تعلق یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کسی شخص کو اگر نماز پڑھتے ہوئے کسی بات پر شک ہو گیا ہے کہ نماز خراب تو نہیں ہو گئی تو اس کا یہ شک مولوی نے ہی دور کرنا ہے۔ یہ شک عام مسلمان کو ہوا ہے، پارلیمنٹ کے ممبر کو ہوا ہے، ہائی کورٹ کے جسٹس کو ہوا ہے، پولیس کے آئی جی کو ہوا ہے یا اسٹیٹ بینک کے گورنر کو ہوا ہے، معاشرے کے کسی طبقہ کے کسی بھی شخص کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا کسی دینی معاملہ میں اگر شک ہو گیا ہے تو اس کا شک بہر حال کسی مولوی سے پوچھ کر ہی دور ہو گا، اس کے سوا اس کی تسلی کی اور کوئی صورت نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی صاحب سارا دن دفتر یا دکان میں کرسی پر بیٹھ کر مولوی کو برا بھلا کہتے رہے ہیں، مولوی کے عیوب اور ان کی کمزوریاں بیان کرتے رہے ہیں، اور غریب مولوی کو بات بات پر کوستے رہے ہیں مگر شام کو گھر گئے تو کسی بات پر اہلیہ محترمہ سے تو تکار ہو گئی، غصے میں منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل گئی اور شک پڑ گیا کہ اب ہم میاں بیوی بھی رہے یا نہیں تو ان صاحب کا یہ شک بھی کسی مولوی نے ہی دور کرنا ہے، وہ اس شک سے نجات پانے کے لیے کسی تھانے میں نہیں جائیں گے، اور نہ ہی پارلیمنٹ یا ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، بلکہ اسی مولوی کے حجرے میں جائیں گے جسے سارا دن بیٹھے کوستے رہے ہیں۔ اس مولوی سے پوچھے بغیر ان کی تسلی نہیں ہو گی۔

یہ تو مولوی کا معاشرہ کے ساتھ دین کا تعلق ہے اور یہ وہ چیز ہے جو مولوی معاشرے کو دیتا ہے دوسرا تعلق لین کا ہے کہ سوسائٹی مولوی کو کیا دیتی ہے؟ کسی گھر میں کوئی مصیبت یا پریشانی آگئی ہے اور صاحب خانہ نے یہ حدیث مبارکہ سن رکھی ہے کہ صدقہ دینے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور پریشانیاں دور ہوتی ہیں، ان صاحب نے صدقہ دینے کا ارادہ کیا ہے اور شہر کی بکرا منڈی میں گئے ہیں، وہاں سے انہوں نے صدقہ دینے کے لیے بکرا خریدا اور اس کی رسی پکڑے آرہے ہیں، کیا خیال ہے وہ یہ بکرا کسی تھانے میں پہنچائیں گے؟ پارلیمنٹ میں لے جائیں گے؟ ہائیکورٹ کے دروازے پر باندھیں گے؟ یا سیکرٹریٹ کے کسی افسر کی نذر کریں گے؟ نہیں، بلکہ وہ کسی مسجد یا مدرسہ کا رخ کریں گے جہاں کوئی مولوی صاحب دس بارہ طلبہ کو پڑھا رہے ہوں اور بکرا ان کے سپرد کر کے ہی انہیں اطمینان ہوگا کہ ان کا صدقہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ یہ بکرا مولوی کا حق ہے اور مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس معاشرے میں دین کا مسئلہ صرف مولوی نے بتانا ہے اور صدقے کا بکرا مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے جب تک مولوی اور سوسائٹی کا یہ دوطرفہ تعلق قائم ہے، ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ الٹے لٹک جائیں، دینی مدرسہ ہمارے معاشرہ میں بند نہیں ہو سکتا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم پر روزگار کا تحفظ اور ملازمت کی گارنٹی موجود نہیں ہے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو نوجوان خود کو وقف کرتا ہے، اس کے بارے میں عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ کرے گا کیا؟ اور مولوی تو بن جائے گا لیکن کھائے گا کہاں سے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ ایسا کہنے والوں سے میرا سوال ہے کہ کیا آج تک کسی مولوی یا حافظ کو انہوں نے بھوکا مرتے دیکھا ہے؟ کسی مولوی، حافظ یا قاری کو بھوک اور فاقے کی وجہ سے خودکشی کرتے دیکھا ہے؟ یا پاکستان کی پوری تاریخ میں مولویوں، قاریوں، یا حافظوں کا کوئی جلوس سڑک پر آیا ہے کہ ان کا گزارا نہیں ہوتا، ان کی تنخواہیں بڑھائی جائیں اور انہیں سہولتیں فراہم کی جائیں؟ کبھی مولوی یا قاریوں نے ہڑتال کی ہو کہ وہ تنخواہیں نہ بڑھانے کی وجہ سے نماز پڑھانے سے انکار کر رہے ہیں یا نماز پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ اکا دکا شخصی واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجموعی طور پر طبقاتی حیثیت سے دینی حلقوں میں کبھی اس حوالے سے ہڑتال، جلوس، قرارداد یا مطالبات کی فضا دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ میرے ان سوالات کا مطلب یہ ہے کہ

جب مولوی خود اپنے افلاس، فقر اور محتاجی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ رہا تو کسی دوسرے کو اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسری گزارش ہے کہ اس صورت حال کی وجہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دین کی برکت سے مولوی بلکہ دین اور مسجد سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور یہ عملی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بحمد اللہ تعالیٰ بھوکا نہیں مرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مولوی اور حافظ کو صرف تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس بات کی ذہنی تربیت بھی دی جاتی ہے کہ نماز پڑھانا اور قرآن کریم کی تعلیم دینا اس کا پیشہ نہیں بلکہ مشن اور دینی خدمت ہے، اس لیے وہ قناعت کرتا ہے، ضروریات کو ضروریات تک محدود رکھتا ہے اور اتنے تھوڑے وظیفہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے بلکہ عملاً کر کے دکھا دیتا ہے جتنے وظیفہ میں کسی دوسرے شعبہ کا کوئی فرد اتنا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ نے مشاہدہ کرنا ہو تو اپنے قریب ہی کسی مسجد کے امام یا کسی مدرسہ کے مدرس سے اس کی تنخواہ اور سہولتوں کے بارے میں پوچھ لیں اور اس کی ڈیوٹی کی نوعیت اور اوقات کار کے بارے میں بھی دریافت کر لیں، آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور آپ کو صحیح طور پر اندازہ ہو گا کہ غریب مولوی طعنہ، تحقیر اور تذلیل کے ہر وار کو برداشت کرتے ہوئے کتنے معمولی وسائل کے ساتھ معاشرہ کی کتنی بڑی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

پانچواں سوال موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش کے حوالہ سے دینی مدارس کے موقف اور کردار کے بارے میں ہے اور میں اس پس منظر میں آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ بات درست ہے کہ تمہیں دینی مدرسہ کے کردار اور اس کے وجود سے سخت تکلیف ہے اور تم بجا طور پر یہ سمجھتے ہو کہ دنیا بھر میں انسانی معاشرہ پر مذہب کے اثرات کو ختم یا محدود کر دینے میں گزشتہ دو صدیوں کے درمیان تم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اسلام کے سوا ہر مذہب کے پیروکاروں کو تم نے مذہب کے اجتماعی کردار سے دست برداری پر آمادہ کر لیا ہے، ان کامیابیوں کے عمل کو اسلامی معاشرہ میں آکر بریک لگ گئی ہے اور تم دنیا کے کسی بھی حصے میں عام مسلمانوں کو دین اسلام کی بنیادوں سے ذہنی طور پر دست بردار کرانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ

مسلمان دین سے عملاً کتنا دور کیوں نہ ہو اور دین کی کسی ایک بات پر بھی اس کا عمل نہ ہو، لیکن اس کی ذہنی کمٹمنٹ قرآن کریم کے ساتھ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ آج بھی بے لچک ہے۔

آپ عملی تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی عام مسلمان سے ہاں یا نہ کے طور پر سوال کیجیے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے اور آج کی عالمی برادری اس کے خلاف یہ تقاضا کر رہی ہے، یا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے اور اقوام متحدہ کی فلاں قرارداد میں اس کے برعکس یہ تقاضا ہے، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس مسلمان کا اسلام کی کسی بات پر عمل ہو یا نہ ہو، لیکن اس سوال کے جواب میں وہ کوئی توقف کیے بغیر دو ٹوک جواب دے گا کہ عالمی برادری اور اقوام متحدہ کا تقاضا غلط ہے اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل صحیح اور بجا ہے۔

قرآن و سنت کے ساتھ عام مسلمان کی یہ بے لچک کمٹمنٹ آج کی ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور عالمی استعمار کے لیے چیلنج بنی ہوئی ہے، حتیٰ کہ امریکہ کے سابق صدر کلنٹن کو ابھی چند ماہ قبل مکہ مکرمہ کے پڑوس جدہ میں اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے سعودی حکمرانوں سے کہنا پڑا ہے کہ اگر تم دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں ہمارے ساتھ مخلص اور سنجیدہ ہو تو تمہیں اپنے نظام تعلیم میں تبدیلی کرنا ہوگی اور دینی مواد کم کرنے کے ساتھ ساتھ عقیدہ کی تلقین بھی ختم کرنا ہوگی۔ ہم عالمی استعمار کی اس تکلیف کو سمجھتے ہیں کہ مذہب اور دین کے خلاف اس کی صدیوں کی مہم اسلامی معاشرہ میں آکر ناکامی سے دوچار ہو رہی ہے جس کی وجہ دینی تعلیم اور دینی درس گاہ ہے اور اسی وجہ سے ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کی ہدایات پر چلنے والی مسلم ریاستیں دینی مدارس کے آزادانہ کردار کو ختم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، لیکن ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے میرا سوال یہ ہے کہ تم دینی تعلیم کو ختم کرنے کا تجربہ کتنی بار دہراؤ گے؟ گزشتہ دو صدیوں میں تم نے عالمی سطح پر اس کام کے لیے تین تجربے کیے ہیں اور تینوں میں تمھیں ناکامی ہوئی ہے۔

تم نے سب سے پہلا تجربہ جنوبی ایشیا میں کیا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ برطانوی حکومت نے اس خطہ میں ہزاروں دینی مدارس کو بند کیا، جائیدادیں ضبط کیں، عمارات مسمار کیں اور پڑھانے والوں کو ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن تمام ترجبر کے باوجود دینی تعلیم

موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ ہے۔

تم نے دوسرا تجربہ ترکی میں کیا۔ وہاں خلافت کا خاتمہ کرایا، عربی زبان ختم کرائی، رسم الخط تبدیل کرایا، عدالتوں سے شرعی قوانین ختم کرائے، مدارس بند کرائے، قرآن کریم اور اذان تک کو عربی میں پڑھنا ممنوع قرار دلوایا، شرعی پردہ کو قانوناً ختم کرایا حتیٰ کہ ایک منتخب خاتون رکن پارلیمنٹ کو صرف اسکارف سر پر لینے کی وجہ سے پارلیمنٹ کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا، لیکن ان تمام اقدامات اور جبر و تشدد کے باوجود پون صدی گزر جانے کے بعد بھی ترکی کے عام مسلمانوں میں نہ صرف دینی تعلیم موجود ہے بلکہ دینی روایات و شعائر کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں دینی اقدار کے دوبارہ غلبہ کی خواہش بھی پائی جاتی ہے جس پر قابو پانے کے لیے تمہارے پاس فوجی جبر کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ترکی کے عوام کو فوجی جبر سے آزاد کر کے آج بھی کھلی فضا میں اپنی حکومت منتخب کرنے کا موقع دیا جائے تو وہی لوگ منتخب ہوں گے جو اسلامی اقدار پر یقین رکھتے ہیں اور سوسائٹی میں اسلام کے اجتماعی کردار کی بحالی کے خواہش مند ہیں، اس لیے ترکی میں بھی تمہارا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔

تم نے مسلم معاشرہ کو دینی تعلیم سے محروم کرنے کا تیسرا تجربہ وسطی ایشیا میں کیا جہاں بخارا، تاشقند اور سمرقند جیسے اسلامی تہذیب کے مراکز میں ہزاروں مساجد و مدارس کو جبراً بند کر دیا گیا، مسجدوں اور دینی درسگاہوں کو تالے لگ گئے۔ میں نے تاشقند میں وہ مسجد دیکھی ہے جو چالیس سال تک سیمنٹ کا گودام رہی ہے اور سمرقند کی اس جامع مسجد میں ایک رات گزاری ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کا مین ہال نعوذ باللہ نصف صدی تک سینما ہال بنا رہا ہے۔ ہم نے خرتنگ میں امام بخاریؒ کے مزار سے باہر ایک بڑھیا کو قرآن کریم کا نسخہ دیا تو وہ اسے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی کہ ستر سال کے بعد قرآن کریم کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ جہاں جبر و تشدد کا یہ ماحول تھا کہ تاشقند کی تو قل تاش مسجد کے امام نے بتایا کہ ہم اگر دو بھائی اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھتے تھے تو ایک بھائی دروازے پر پہرہ دیتا تھا کہ کوئی شخص ہمیں نماز پڑھتے دیکھ نہ لے۔ لیکن پون صدی کے اس خوفناک ریاستی جبر کے باوجود وسطی ایشیا میں دینی تعلیم آج بھی موجود ہے اور میں نے ان ہزاروں خفیہ درسگاہوں میں سے ایک کی زیارت کی ہے جو زیر زمین تہہ خانوں میں قائم تھیں اور جہاں رات کے پچھلے پہر طلبہ خفیہ طور پر آ کر وہی کتابیں اور علوم پڑھتے تھے جو ہمارے دینی مدارس میں رائج ہیں اور

جن کی تعلیم حاصل کر کے حافظ، قاری اور عالم دین بنتے ہیں۔ چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ وسطی ایشیا میں سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد مسلم ریاستیں آزاد ہوئی ہیں اور ہزاروں مساجد و مدارس کے تالے کھلے ہیں تو انہیں نماز پڑھانے اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لیے باہر سے افراد درآمد نہیں کرنا پڑے، بلکہ خفیہ درسگاہوں میں پڑھنے والے ہزاروں طلبہ نے ہی مساجد و مدارس کا نظام سنبھال لیا ہے اور عملاً صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ زیر زمین خفیہ تہہ خانوں میں چلنے والے مدارس زمین کے اوپر ان مساجد و مدارس میں واپس آ گئے ہیں جنہیں ساٹھ یا ستر سال کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہے۔

اس لیے میں عالمی استعمار اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے دو ٹوک عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جبر و تشدد کے ایک نئے دور سے بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس سے ہماری مشکلات میں یقیناً اضافہ ہوگا اور آزمائش کے نئے مراحل ہمارے لیے بلا شبہ صبر آزما ہوں گے، لیکن اس سے دینی تعلیم کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آئے گا، وہ باقی رہے گی اور قیامت تک باقی رہے گی، اس لیے کہ یہ خدا کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ یہ ہمارے عقیدہ کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو قیامت تک دنیا میں محفوظ رکھنے کا اعلان فرمایا ہے اور وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب وہ قرآن کریم اور اس کی تعلیم کی حفاظت کرے گا تو اس کے اسباب کی بھی حفاظت کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ مجھے اگر دودھ کے ایک پیالے کی حفاظت کے لیے کہا جائے گا تو میں صرف دودھ کی حفاظت نہیں کروں گا بلکہ اس پیالے کی حفاظت بھی کروں گا جس میں وہ دودھ ہے، کیونکہ عالم اسباب میں اس پیالے کی حفاظت سے ہی دودھ کی حفاظت بھی ہوگی۔ اس لیے یہ دینی مدارس قرآن کریم کی تعلیم کے اسباب ہیں جن کی حفاظت قرآن کریم کے ساتھ خود بخود ہوتی رہے گی بلکہ یہ تو کشتی نوح کی حیثیت رکھتے ہیں اور فتنوں اور آزمائشوں کے اس ہمہ گیر سیلاب اور طوفان میں وہی شخص نجات حاصل کر سکے گا جو اس کشتی میں سوار ہو جائے گا، اس لیے جہاں میں عام مسلمانوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اس کشتی میں آ جائیں، اس کے بغیر وہ ایمان نہیں بچا سکیں گے، اسی طرح ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے بھی میری گزارش ہے کہ وہ حقائق کو تسلیم کرے اور چٹان کے ساتھ ٹکراتے رہنے کے بجائے اس چٹان کا وجود تسلیم کر لے۔

باقی رہی بات انسانی سوسائٹی کے لیے بہتر سسٹم اور نظام کی تو اس سے زیادہ یقین کے ساتھ ہم یہ

عرض کرتے ہیں کہ آج کی ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے بجائے نسل انسانی کے بہتر مستقبل کی ضمانت دینے والا نظام ہمارے پاس ہے۔ عالمی استعمار کے لیڈر چاہیں تو ہم اس پر ان کے ساتھ گفتگو کے لیے تیار ہیں، مگر اس کے لیے انہیں محاذ آرائی ترک کر کے مذاکرات کی میز پر آنا ہوگا اور یہ بہر حال طے ہے۔ آج نہیں تو کل، کیونکہ اس کے بغیر آج کی دنیا کے پاس کوئی متبادل راستہ اور چوائس نہیں۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۳ تا ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

جدید مغربی معاشرے کے لیے دینی مدارس کا پیغام

[۱۷۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو شیفیلڈ (برطانیہ) میں مدنی ٹرسٹ نوٹنگھم کے زیر اہتمام جامعہ الہدیٰ کی افتتاحی تقریب سے خطاب]

برادر محترم مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ جامعہ الہدیٰ شیفیلڈ کے افتتاح کے موقع پر اس تقریب میں آپ حضرات کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا موقع فراہم کیا اور اس نئے تعلیمی ادارے کے آغاز پر مدنی ٹرسٹ کے تمام دوستوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس ادارہ کو پورے خطے میں دین کی سربلندی اور علم کے فروغ کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین

ہم ایک دینی درس گاہ کے افتتاح کی تقریب میں جمع ہیں اور دینی مدارس کے حوالے سے اس وقت یہ صورت حال ہمارے سامنے ہے کہ ایک طرف دینی مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور نئی دینی درس گاہیں قائم ہو رہی ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس کی مخالفت عالمی سطح پر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مدرسہ کو انسان کی تہذیبی پیشرفت میں رکاوٹ قرار دیا جا رہا ہے، سولائزیشن کا دشمن بتایا جا رہا ہے اور بلند آہنگی کے ساتھ یہ پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ یہ مدرسہ تہذیب و تمدن کے لیے خطرہ ہے، سولائزیشن اور نسل انسانی کی ثقافتی پیشرفت کے لیے خطرہ ہے اور موجودہ عالمی سسٹم کے لیے خطرہ ہے، اس لیے اسے ختم کیا جائے یا کم از کم اس کے جداگانہ تشخص، کردار، آزادی اور خود مختاری کو محدود کر دیا جائے۔ میں اس پس منظر میں آج کی اس محفل میں صرف ایک پہلو پر مختصراً کچھ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ وہ لوگ جو اس مدرسہ کی مخالفت میں پیش پیش ہیں اور اسے بند کرنے کے درپے ہیں، ان سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تم انصاف کی نظر سے دیکھو تو یہ مدرسہ خود تمہاری ضرورت بھی ہے اور پوری نسل انسانی کو اس کی ضرورت ہے۔ میری اس گزارش کے مخاطب وہ

تمام لوگ ہیں جو اس دینی مدرسہ کے مخالف ہیں اور خاص طور پر ویسٹرن سولائزیشن کے علمبرداروں اور مغربی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرنے والے دانشوروں سے عرض کرنا چاہ رہا ہوں کہ یہ دینی درس گاہ تمہاری ضرورت بھی ہے، جو کچھ یہ مدرسہ پڑھا رہا ہے اور جن علوم کو یہ تاریخ کی دستبرد سے محفوظ رکھے ہوئے ہے، اس کی مستقبل میں تمہیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے بلکہ ضرورت پڑے گی اس لیے تم اس کی ضرورت سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

تم نے اب سے دو تین سو برس قبل یورپ میں اہل مذہب کے ظالمانہ کردار سے تنگ آکر اس کے ردعمل میں مذہب کا طوق گردن سے اتار دیا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اب سے تین صدیاں قبل یورپ میں اہل مذہب کا کردار کیا تھا اور کس طرح انہوں نے پورے معاشرے کو اپنے ظالمانہ کردار کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اسی کے ردعمل میں تم نے مذہب سے پیچھا چھڑانے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ تم اہل مذہب کی مخالفت میں خود مذہب کے خلاف انتہا پر چلے گئے اور تم نے کہا کہ اب انسانی سوسائٹی بالغ ہوگئی ہے اور اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے، اس لیے انسان کو باہر سے ڈکٹیشن لینے کی ضرورت نہیں ہے اور آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی پابندی کا دور گزر گیا ہے اس لیے اب ہم اپنے معاملات خود طے کریں گے، انسانی سوسائٹی اپنے فیصلے خود کرے گی اور کسی بیرونی ہدایت کے بغیر اپنا نظام خود چلائے گی۔ تم نے اس فلسفے پر ایک نیا نظام تشکیل دیا، ایک نیا کلچر پیش کیا اور پھر اسے پوری دنیا پر مسلط کرنے کے لیے ہر طرف چڑھ دوڑے۔

لیکن تین صدیوں کے بعد آج تمہاری اس تگ و دو کے نتائج سامنے آرہے ہیں تو تم خود پریشانی کا شکار ہو گئے ہو، آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی راہ نمائی سے بے نیاز ہو کر آج انسانی سوسائٹی فکری انتشار، تہذیبی انارکی اور افراتفری کی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور تمہاری دانش گاہیں خود اس مقام سے واپسی کی راہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم جان میجر نے اس نعرہ پر باقاعدہ مہم چلائی کہ "Back to Basics" (بنیادوں کی طرف واپسی) کی ضرورت ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے بنیاد پرستی کو طعنہ بنا دیا گیا ہے اور اہل مغرب خود بنیادوں کی طرف واپسی کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے بی بی سی پر کئی لیکچر دیے اور کہا کہ ہم نے صرف عقل کو معیار قرار دے کر ٹھوکر کھائی ہے اور ہم نسل انسانی کو نقصان کی طرف لے جا رہے ہیں

اس لیے ''وجدان'' کی طرف واپسی کی ضرورت ہے۔ برطانوی شہزادے نے ''وجدان'' کی اصطلاح استعمال کی ہے جو ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس کے بعد وحی اور الہام ہی کی بات آئے گی۔ جبکہ ممتاز روسی لیڈر اور دانش ور گورباچوف نے کھلے بندوں اعتراف کیا کہ ہم نے عالمی جنگ کے بعد دفتروں اور کارخانوں میں افرادی قوت کے خلا کو پر کرنے کے لیے عورت کو بہکا کر گھر سے نکالا جس سے ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا ہے اور اب ہمیں عورت کو دوبارہ گھر میں لے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

ان باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کے دانشوروں کی سوچ کا رخ کیا ہے اور وہ موجودہ صورت حال سے کس قدر پریشان ہیں۔ اب یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی رہنمائی سے پیچھا چھڑا کر نسل انسانی نے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ نقصان سے دوچار ہوئی ہے اور انسانی سوسائٹی کو اس نئے فلسفے اور کلچر نے اخلاقی انارکی اور ذہنی خلفشار کے سوا کچھ نہیں دیا چنانچہ مغرب کی دانش گاہوں میں اس بات پر غور شروع ہو چکا ہے کہ یہاں سے واپسی کا راستہ کیا ہے اور انسانی سوسائٹی کو اس دلدل سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔

مغرب کے اہل دانش سے میرا سوال ہے کہ جس ''وجدان'' اور ''بنیادوں'' کی طرف واپسی کی تم بات کر رہے ہو، اگر تم نے اس کا فیصلہ کر لیا اور تمہارے پاس اب اس فیصلے کے سوا کوئی اور ''چوائس'' باقی بھی نہیں رہا تو یہ بنیادیں تمہیں ملیں گی کہاں سے؟ اور عقل انسانی کے لیے بیرونی راہ نمائی یا دوسرے لفظوں میں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کا یہ سودا تم آخر کس دکان سے حاصل کر سکو گے؟ یہ ''جنس'' آج مسلمانوں کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ کسی اور مذہب کے ماننے والوں کے پاس آسمانی تعلیمات کا کوئی قابلِ اعتماد ذخیرہ موجود ہے۔ یہ سعادت صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس نہ صرف قرآن کریم اصلی حالت میں محفوظ و موجود ہے بلکہ قرآن کریم کی تشریحات و تعبیرات میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی تمام تر جزئیات و تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں اور نسل انسانی نے جب کبھی آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا، اسے یہ چیز صرف اور صرف مسلمانوں کے ہاں سے ہی ملے گی اور دنیا کا کوئی مذہب انسانی سوسائٹی کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے آخری کتاب قرآن کریم اور آخری پیغمبر حضرت محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و تعلیمات کی حفاظت کا ایسا فول پروف انتظام کر رکھا ہے کہ ان میں کسی اور چیز کی دراندازی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت ہے کہ لاکھوں سینوں میں قرآن کریم کے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کے سب سے پہلے لکھوائے جانے والے نسخے بھی ابھی تک موجود و محفوظ ہیں جو امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اس لیے آج صرف اور صرف مسلمان اس دعویٰ کی پوزیشن میں ہیں کہ ان کے پاس آسمانی تعلیمات محفوظ حالت میں موجود ہیں اور نسل انسانی کو جب بھی آسمانی تعلیمات کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ اصلی حالت میں اسے مسلمانوں کے پاس مل جائیں گی۔

میں مغرب کے اہل دانش سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سمجھ دار لوگ ہیں اور سمجھ دار لوگوں کی ایک علامت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی متبادل ضرور ذہن میں رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی مغرب کے دانشوروں کو سوچنا چاہیے کہ جس راستے پر انہوں نے نسل انسانی کو تین سو برس قبل چلانا شروع کیا تھا، اس کی ناکامی کی صورت میں ان کے پاس اس کا متبادل کیا ہے؟ اور انہوں نے اس کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟

آج سچی بات یہ ہے کہ مغرب کا فلسفہ ناکام ہو چکا ہے، مغرب کے کلچر نے انسانی سوسائٹی کو اخلاقی انارکی اور ذہنی خلفشار سے دوچار کر دیا ہے، انسانی قدریں برباد ہو گئی ہیں، خاندانی نظام جو انسانی سوسائٹی کا بنیادی یونٹ ہے، بکھر کر رہ گیا ہے اور خود مغرب کے دانشوروں نے وجدان، بنیادوں اور ماضی کی طرف واپس جانے کے لیے سوچنا شروع کر دیا ہے اس لیے میں ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دینی مدرسہ جس کو وہ ختم کرنے کے درپے ہیں، انہی وجدانیات، بنیادوں اور ماضی کے اخلاقی اقدار کی تعلیم دے رہا ہے جن کی ضرورت کا احساس خود ان کے ذہنوں میں اجاگر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ یہ مدرسہ ان اقدار و تعلیمات کو نہ صرف محفوظ رکھے ہوئے ہے بلکہ اسے نئی نسل کے سپرد کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے محاذ پر سرگرم عمل بھی ہے اور اس حوالے سے یہ مدرسہ ان لوگوں کی بھی ضرورت ہے جو اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کل جب انہیں کہیں اور پناہ نہیں ملے گی، یہی مدرسہ ان کی راہنمائی اور نجات کے لیے کردار ادا کرے گا۔

باقی رہی بات اس مدرسہ کو ختم کرنے کی تو میں اس موقع پر اہل مغرب سے اختصار کے ساتھ یہ

بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تم بار بار اس بات کا تجربہ کر چکے ہو کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں اس لیے اس کام میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم نے ۱۸۵۷ء کے بعد جنوبی ایشیا میں اس درس گاہ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا لیکن جبر و تشدد کے تمام تر مراحل کے باوجود جنوبی ایشیا میں یہ درس گاہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے سے زیادہ متحرک اور مؤثر کردار ادا کر رہی ہے۔ تم نے ترکی میں اس مدرسہ کو اپنی طرف سے مکمل طور پر ختم کر دیا تھا اور اس کو دوبارہ ابھرنے سے روکنے کے لیے پون صدی سے جبر کا ہر حربہ آزما رہے ہو لیکن یہ مدرسہ ترکی میں بھی زندہ ہے اور اگر تم اس کی زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو ترکی میں فوج کے جبر سے ہٹ کر ایک الیکشن کرا کے دیکھ لو، تمہیں اس مدرسے کی کارکردگی کا گراف معلوم ہو جائے گا۔ تم نے وسطی ایشیا میں اس مدرسہ کو بند کرنے کے لیے جبر اور تشدد کو انتہا تک پہنچا دیا اور اس درس گاہ کا کردار ختم کرنے کے لیے ریاستی جبر کی ہر شکل آزما کر دیکھ لی ہے لیکن پون صدی کے بعد دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ وسطی ایشیا میں بھی یہ مدرسہ زندہ ہے اور اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اس لیے میں مغرب کے دانشوروں کو آج کی اس محفل کی وساطت سے یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ حقائق سے آنکھیں بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ مدرسہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری نسل انسانی کی اور خود تمہاری بھی ضرورت ہے۔ اس چٹان سے سر ٹکرانے کے بجائے اس کے وجود کو تسلیم کرو اور اس کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کا پیغام نسل انسانی کے بہتر مستقبل کا پیغام ہے، انسانی سوسائٹی کو انارکی اور خلفشار کی دلدل سے نکالنے کا پیغام ہے اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا پیغام ہے۔ اب نسل انسانی کو اسی پیغام کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے سوا نسل انسانی کی فلاح کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، نومبر ۲۰۰۲ء)

دینی مدارس: درپیش چیلنجز

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام مجلس مذاکرہ

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے ۳/ اگست ۲۰۰۰ء کو ’’دینی مدارس: درپیش چیلنجز‘‘ کے عنوان سے ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا جس میں ملک کے منتخب ارباب علم و دانش نے شرکت کی اور دینی مدارس کے حوالہ سے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ مجلس مذاکرہ کی تین نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست کی صدارت اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان نے، دوسری نشست کی صدارت قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا گوہر رحمن نے، اور تیسری نشست کی صدارت نیشنل سیکیورٹی کونسل کے رکن ڈاکٹر محمود احمد غازی نے کی۔ مجلس مذاکرہ کی کارروائی مجموعی طور پر تقریباً سات گھنٹے جاری رہی اور اس میں مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر خورشید احمد، مولانا عبدالمالک خان، ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، پروفیسر افتخار احمد بھٹہ، ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، مولانا محمد صدیق ہزاروی، مولانا محمد حنیف جالندھری، سید ریاض حسین نقوی، جناب خالد رحمن، ڈاکٹر ممتاز احمد اور مولانا سید معروف شاہ شیرازی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں، جبکہ ڈاکٹر خالد علوی اور پروفیسر یاسین ظفر صاحب کے مضامین پڑھ کر سنائے گئے اور دیگر شرکاء میں ڈربن یونیورسٹی (جنوبی افریقہ) کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ پروفیسر ڈاکٹر سید سلمان ندوی نمایاں تھے جو تحریک پاکستان کے عظیم راہنما حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ہیں۔

مجلس مذاکرہ میں راقم الحروف کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی اور راقم الحروف نے ’’دینی نظام تعلیم میں اصلاح احوال کی ضرورت اور حکمت عملی‘‘ کے عنوان سے اپنی گزارشات تحریری صورت میں پیش کیں۔ ان معروضات کو کم و بیش سب شرکاء نے پسند کیا اور پروفیسر خورشید احمد

صاحب نے اعلان کیا کہ انہی گزارشات کو ”مجلس مذاکرہ“ کی مجموعی سفارشات کی حیثیت دی جا رہی ہے۔

مجلس مذاکرہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے مقررین نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان میں معاشرہ میں دینی حمیت کو باقی رکھنے اور اسلامی علوم و روایات کے تحفظ میں دینی مدارس کے کردار کا اعتراف نمایاں تھا اور دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے بھی سب حضرات کے جذبات یکساں تھے، البتہ اس کے ساتھ آزادانہ کردار اور خود مختاری کو برقرار رکھتے ہوئے دینی مدارس کے نظام و نصاب میں دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق اصلاح و ترمیم کی ضرورت کی طرف اکثر حضرات نے توجہ دلائی اور دینی مدارس کے وفاقوں پر زور دیا کہ وہ اس ضرورت کا احساس کریں اور دینی مدارس کے معاشرتی کردار کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے بہی خواہ اور مخلص حلقوں کی طرف سے پیش کی جانے والی سفارشات و تجاویز کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں۔

بعض ارباب دانش نے اس نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی کہ ملک کے نظام کو چلانے اور صالح رجال کار فراہم کرنے کے لیے دینی مدارس پر جو زور دیا جا رہا ہے، اس کی اصل ذمہ داری تو ریاستی نظام تعلیم پر عائد ہوتی ہے جبکہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود ریاستی نظام تعلیم میں کوئی مقصدی تبدیلی سامنے نہیں آئی اور ملک کے ریاستی نظام تعلیم کے ارباب حل و عقد سرے سے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہے ہے، بلکہ اگر ملک کے مروجہ سرکاری نظام تعلیم میں اسلامی مقاصد اور ضروریات کو شامل کرنے کی طرف کسی طرف سے توجہ دلائی جاتی ہے تو اسے یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان کا یہ انکشاف بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے کچھ عرصہ قبل لا گریجویٹس کے لیے ایل ایل بی کے نصاب میں اسلامی قوانین کے اضافہ اور نصاب کا دورانیہ دو سال کے بجائے تین سال کر دینے کی تجویز پیش کی مگر ان سفارشات کا جائزہ لینے والی کمیٹی نے، جس میں متعدّد لا کالجز کے پرنسپل حضرات بھی شامل تھے، کورس کا دورانیہ دو سال سے تین سال کرنے کی تجویز تو منظور کر لی مگر اسلامی قوانین کے جس نصاب کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی گئی تھی، اس کا بمشکل پانچ فیصد حصہ کورس میں شامل کرنے پر رضامندی ظاہر کی گئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے مروجہ نظام تعلیم کو اسلامی مقاصد و ضروریات کے

سانچے میں ڈھالنے کے لیے اس نظام تعلیم کے کارپردازان کی دلچسپی کا عالم کیا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مولانا گوہر رحمن نے زیادہ زور دے کر یہ بات کہی کہ دینی مدارس کے نصاب میں ضروری اصلاحات سے ہمیں انکار نہیں اور ہم بتدریج ایسا کر بھی رہے ہیں، لیکن اس سے بات نہیں بنے گی اور ملک کے سیاسی، انتظامی، عدالتی اور عسکری شعبوں کو دینی لحاظ سے تربیت یافتہ افراد کار مہیا کرنے کا مقصد پورا نہیں ہو گا بلکہ اس کے لیے ملک کے ریاستی نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور سرکاری نصاب تعلیم کو مکمل طور پر تبدیل کر کے اسے قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے، کیونکہ یہ ذمہ داری بنیادی طور پر اسی نظام کی ہے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس نظام میں تبدیلی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں دلا رہا اور دینی مدارس کے نظام و نصاب میں تبدیلی کے لیے چاروں طرف سے شور مچایا جا رہا ہے۔

بعض مقررین نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ دینی مدارس کے طلبہ اور عصری کالجز کے طلبہ میں اجنبیت کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اس نوعیت کے پروگراموں کا اہتمام ہونا چاہیے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ، عصری کالجوں میں جا کر جدید علوم کی تعلیم حاصل کر سکیں اور کالجوں کے فاضل نوجوانوں کو دینی مدارس میں جا کر درس نظامی کا کوئی مختصر کورس کرنے کی سہولت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ طلبہ کے وفود کے باہمی تبادلہ، تعلیمی اداروں کے دوروں اور مشترکہ مجالس کے اہتمام کے ساتھ بھی اس سلسلہ میں مؤثر پیشرفت ہو سکتی ہے۔

مجلس مذاکرہ میں دینی مدارس کے دائرہ میں وسعت اور پھیلاؤ کا بھی ذکر کیا گیا کہ مختلف اطراف سے مخالفت کے باوجود دینی مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور طلبہ و طالبات کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ایک مقرر نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ریاستی نظام تعلیم اپنے مقاصد کے حوالہ سے ناکام ہو چکا ہے کیونکہ لاکھوں ڈگری یافتہ افراد بے روزگاری کا شکار ہیں، اس لیے اب نوجوان ادھر سے مایوس ہو کر دینی تعلیم کی طرف آ رہے ہیں تاکہ اگر دنیا کا فائدہ نہ ہو تو کم از کم دین تو ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے کہا کہ خود ان کی زیر نگرانی ایک ہائی سکول سے گزشتہ سال بیس طالبات نے میٹرک پاس کیا جن میں سے صرف پانچ طالبات کالج میں گئی ہیں جبکہ باقی پندرہ طالبات نے مزید تعلیم کے لیے دینی مدارس کو ترجیح دی ہے۔

مجلس مذاکرہ میں پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد کے بارے میں ایک سروے رپورٹ بھی پیش کی گئی جس میں بتایا گیا کہ وفاقی وزارت تعلیم کی سروے مہم کے نتیجے میں جو معلومات سامنے آئی ہیں، ان کے مطابق ملک میں دینی مدارس کی تعداد اس وقت ساڑھے چھ ہزار سے زیادہ ہے جن میں مجموعی طور پر ساڑھے دس لاکھ کے قریب طلبہ اور طالبات قرآن و سنت، فقہ اسلامی اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان مدارس میں اساتذہ کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہے جبکہ دینی تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور بیرونی ممالک کے اٹھائیس ہزار کے قریب طلبہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سروے رپورٹ کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ محکمہ تعلیم کی طرف سے ان مدارس کی امداد کے لیے جو رقم مختص کی جاتی ہے، اس کا آغاز ایک لاکھ روپے سالانہ سے ہوا تھا اور اب یہ پندرہ لاکھ روپے سالانہ تک جا پہنچی ہے۔ اس سلسلے میں یہ دلچسپ واقعہ بھی بتایا گیا کہ جس دور میں سید فخر امام صاحب وزیر تعلیم تھے، دینی مدارس کی امداد کے لیے محکمہ تعلیم کی طرف سے دس لاکھ روپے کی منظوری دی گئی اور وزارت کے افسران کے ایک اجلاس میں وفاقی وزیر تعلیم کی طرف سے افسران پر زور دیا گیا کہ رقم کی تقسیم میں مدارس کے معیار اور کوالٹی کا لحاظ رکھا جائے۔ اس پر اجلاس میں موجود وزارت تعلیم کے ایک افسر نے وزیر موصوف سے گزارش کی کہ جناب والا! اس وقت دینی مدارس میں طلبہ کی جتنی تعداد تعلیم حاصل کر رہی ہے، اس کے حساب سے محکمہ تعلیم کی عطا کردہ دس لاکھ روپے کی اس رقم کو تقسیم کیا جائے تو فی طالب علم پچیس پیسے سالانہ بنتے ہیں۔ وزیر تعلیم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا مگر ان کا اصرار قائم رہا کہ رقم تقسیم کرتے ہوئے مدارس کے معیار اور کوالٹی کا بہر حال لحاظ رکھا جائے۔

مجلس مذاکرہ میں امریکہ کی ہمپٹن یونیورسٹی کے استاذ، محترم ڈاکٹر ممتاز احمد بھی شریک تھے جو جنوبی ایشیا کے دینی مدارس کے بارے میں سروے کر رہے ہیں اور حال ہی میں بنگلہ دیش کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطاب میں بنگلہ دیش کے دینی مدارس کے بارے میں اپنی سروے رپورٹ کا خلاصہ پیش کر کے شرکائے محفل کو چونکا دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش میں دینی تعلیم دینے والے مدارس کی تعداد اس وقت اٹھائیس ہزار سے زائد ہے جن میں ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں ساڑھے چھ ہزار مدارس وہ ہیں جو صرف عوامی چندہ سے

چلتے ہیں جبکہ ان مدارس کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی ہے جنہیں حکومت کی طرف سے امداد دی جاتی ہے جو مختلف مدارج میں اخراجات کے ۸۰ فیصد تک جا پہنچتی ہے اور کچھ دینی مدارس ایسے بھی ہیں جو صرف حکومت کے خرچہ پر قائم ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد میں قائم ابتدائی دینی مدارس کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس سال بنگلہ دیش کی حکومت نے اپنے بجٹ میں دینی مدارس کے لیے جو رقم مخصوص کی ہے، اس کی مقدار پانچ سو کروڑ ٹکہ (پانچ ارب ٹکہ) ہے۔

انہوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت نے ان دینی مدارس کو بند کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان مدارس پر الزام تھا کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی ہے اور ان مدارس سے فارغ ہونے والے علماء بنگلہ قومیت کے بجائے اسلام کی بات کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس نے رپورٹ میں یہ سفارش کر دی کہ ان مدارس کو بند کر دیا جائے، لیکن اس کے ساتھ ہی مجیب حکومت نے ایک عوامی سروے کا بھی اہتمام کیا جس کی رپورٹ حیران کن تھی کیونکہ اس کے مطابق ملک کے نوے فیصد عوام نے، جن میں جدید پڑھے لکھے حضرات کی اکثریت تھی، دینی مدارس کو بند کر دینے کی تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی اور حکومت سے کہا تھا کہ وہ دینی مدارس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے بتایا کہ اس سلسلے میں بنگلہ دیش کے عوامی حلقوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اسی دوران میں ایک روز مولانا عبدالحمید بھاشانی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی گاڑی کو ایک سڑک پر جاتے ہوئے راستہ میں رکوا کر ان سے کہا کہ آپ کی بہت سی باتیں میں برداشت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کر رہا ہوں، مگر دینی مدارس بند کرنے کی بات برداشت نہیں کروں گا اور اگر اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کی مزاحمت کے لیے میں خود میدان میں آؤں گا۔ چنانچہ شیخ مجیب الرحمٰن نے دینی مدارس پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بنگلہ دیش میں دینی مدارس پوری آزادی اور پہلے سے زیادہ وسعت کے ساتھ دینی خدمات میں مصروف ہیں۔

اس موقع پر پروفیسر خورشید احمد نے ترکی کے تجربہ کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ترکی میں اتاترک کے دور میں دینی مدارس کو بالکل بند کر دیا گیا تھا اور دینی تعلیم ہر سطح پر ممنوع قرار دے دی گئی تھی جو کم و بیش ۳۵ سال تک مسلسل ممنوع رہی جبکہ ساٹھ کی دہائی میں وزیر اعظم عدنان میندرس شہیدؒ نے یہ پابندی اٹھا کر ابتدائی اور ثانوی سطح پر دینی تعلیم کی اجازت دے دی جس کے بعد دینی مدارس قائم

ہوئے اور ان دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان سول اور فوج کے مختلف محکموں میں جانے لگے جس کا نتیجہ عظیم فکری اور ذہنی انقلاب کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے کہ ترکی میں اسلامی بیداری کی لہر نے پوری قومی زندگی کا احاطہ کر لیا ہے اور اسی سے پریشان ہو کر سیکولر فوج نے اب پھر ترکی کے مدارس میں قرآن و سنت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا ہے، لیکن دینی تعلیم کا پہلا دور اپنا اثر دکھا چکا ہے اور ترکی میں اب اسلامی بیداری کو دبانا ممکن نہیں رہا۔

مجلس مذاکرہ کے اختتامی خطاب میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کے رکن ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بتایا کہ حکومت دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری پر یقین رکھتی ہے اور اس کا اس میں کسی قسم کی مداخلت کا پروگرام نہیں ہے۔ البتہ وہ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں اس قسم کی ترمیم و اصلاح ضرور چاہتی ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء آج کے دور کے تقاضوں کو سمجھیں اور ان سے ہم آہنگ ہو کر آج کے عالمی تناظر میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت دینی مدارس کے نظام میں کسی قسم کا دخل دیے بغیر دینی تعلیم کا ایک مستقل بورڈ قائم کرنے اور تعلیمی کونسل تشکیل دینے کا پروگرام بنا رہی ہے جس کے ساتھ رضا کارانہ طور پر منسلک ہونے کی دینی مدارس کو دعوت دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی حکومت بڑے شہروں میں ماڈل دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے جس کے لیے نصاب ترتیب دیا جا چکا ہے اور بہت جلد اس سلسلہ میں عملی پیشرفت کی جا رہی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۷، ۱۸/ اگست ۲۰۰۰ء)

قومی تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جوابات

[حکومت پاکستان کے قائم کردہ قومی تعلیمی کمیشن کی خصوصی کمیٹی نمبر ۵ کے کنوینر جناب جسٹس (ریٹائرڈ) محمد ظہور الحق کی طرف سے دینی مدارس اور عصری اسکولوں و کالجوں کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی کے سلسلہ میں ماہرین تعلیم کو ارسال کیے جانے والے سوالنامہ کا جواب]

سوالنامہ

محترم و مکرم السلام علیکم!

حکومت پاکستان نے شریعت کے نفاذ کے لیے اپنی کاوشوں کا آغاز کر رکھا ہے۔ شریعت بل ۱۹۹۱ء کے تحت قومی تعلیمی کمیشن برائے اسلامائزیشن تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کمیشن کی پہلی نشست ۳۰/ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ہوئی تھی اور کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ کمیٹی نمبر ۵ کا میں کنوینر ہوں۔ یہ کمیٹی دینی مدارس کے مسائل، ضروریات اور سہولتوں کے مسائل پر غور و فکر کر رہی ہے۔ دینی مدارس کے مسائل کا علم آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے میں کمیشن کی اعانت فرمائیں اور دینی مدارس کو کیا سہولتیں حکومت سے درکار ہیں یا ہو سکتی ہیں، اس کی وضاحت فرمادیں۔

سفارشات ۵ دسمبر سے پہلے ارسال فرمائیں۔

۱۔ دینی مدارس کو حکومت کی مالی معاونت کی ضرورت سے متعلق آپ کی تجاویز۔

۲۔ دینی مدارس کے مسائل اور ضروریات۔

۳۔ دینی مدارس کو حکومت کس طرح کی سہولتیں مہیا کرے؟

۴۔ جدید نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر کس طرح استوار کیا جائے؟

۵۔ دینی مدارس میں جدید علوم کو کس طرح متعارف کرایا جائے؟

۶۔ یہ بھی درخواست ہے کہ دینی مدارس اور عام مدارس کے نصاب اور نظام میں کس طرح ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی اپنی تجاویز تحریر فرما دیں۔ نوازش ہوگی۔

تعاون کا پیشگی شکریہ۔ والسلام

جسٹس (ریٹائرڈ) محمد ظہور الحق
کنوینر نیشنل ایجوکیشنل کونسل، اسلام آباد

جواب

حکومت پاکستان کے قائم کردہ نیشنل ایجوکیشنل کمیشن کی کمیٹی نمبر ۵ نے دینی مدارس اور مروجہ تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جو سوالنامہ جاری کیا ہے، اگرچہ اس میں چھ سوالات ہیں، لیکن یہ سب سوالات بنیادی طور پر دو سوالوں پر مشتمل ہیں۔ ایک یہ کہ عصری اسکولوں اور کالجوں کے نصاب و نظام کے ساتھ دینی مدارس کے نصاب و نظام کو کس طرح زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ دینی مدارس کو درپیش مسائل و ضروریات میں حکومت کیا تعاون کر سکتی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس ضمن میں یہ گزارش ہے کہ اگرچہ یہ بظاہر ایک دل کش اور خوشنما تصور ہے لیکن اصولی طور پر یہ غلط اور غیر منطقی سوچ ہے کیونکہ اس سوچ کی بنیاد ان دونوں نظام ہائے تعلیم کی جداگانہ ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرنے پر ہے اور یہ ضرورت و اہمیت بجائے خود محل نظر ہے۔

عصری اسکولوں اور کالجوں کا نظام تعلیم مستقل حیثیت کا حامل ہے اور دینی مدارس کا نظام تعلیم اس سے بالکل مختلف اور الگ حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس دور کی قومی ضروریات کے پیش نظر ہوا تھا۔ دونوں تعلیمی نظاموں کی بنیاد خوف اور تحفظات پر تھی۔ جدید تعلیم کا نظام کھڑا کرنے والوں کے سامنے یہ خوف تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تو وہ نئے قومی نظام میں شریک نہیں ہو سکیں گے اور ان کے ہندو معاصرین

اس دوڑ میں آگے بڑھ کر قومی زندگی پر تسلط جما لیں گے جس سے مسلمان دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جائیں گے، جبکہ دینی تعلیمی نظام کے بانیوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر قرآن و سنت اور عربی علوم کی تعلیم کا اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کا رشتہ اپنے مذہب اور اعتقاد سے کٹ جائے گا اور وہ دینی تشخص سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ دونوں خوف اپنی اپنی جگہ صحیح تھے اور انہی کی بنیاد پر دو الگ اور مستقل نظام ہائے تعلیم وجود میں آ گئے، لیکن قیام پاکستان کے بعد ان میں سے کسی خوف کے تسلسل کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا اور قومی دانشوروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان خدشات کی نفی کرتے اور دونوں محاذوں پر قوم کو خوف سے نجات دلا کر خوف اور تحفظات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے دونوں تعلیمی نظاموں کے یکسر خاتمہ کی راہ ہموار کرتے، لیکن بدقسمتی سے اب تک ایسا نہیں ہوا اور ہم حصول آزادی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی تعلیمی پالیسیوں کے لحاظ سے ابھی تک انیسویں صدی کے اواخر کے ذہنی دائروں میں کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہے ہیں۔

کالجوں اور دینی مدارس کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہماری بنیادی تعلیمی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض ایڈہاک ازم ہے جو کسی ٹھوس اور واضح تعلیمی پالیسی کے جڑ پکڑنے تک ایک عبوری اور عارضی انتظام کا درجہ تو پا سکتی ہے، لیکن یہ ہمارے تعلیمی مسائل کا حل نہیں ہے اور اگر سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو دونوں نصابوں کو مکمل طور پر ہم آہنگ کرنا قابلِ عمل اور ممکن بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر دونوں نصاب پورے کے پورے یک جا کر دیے جائیں تو طلبہ کی میسر کھیپ میں سے شاید پانچ فیصد اسے بمشکل کور کر سکیں اور اگر ایک کو بنیاد بنا کر دوسرے نصاب کی چند چیزیں اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے تو اسے "ہم آہنگی" قرار دینا مشکل ہو جائے گا، اس لیے ہمارے نزدیک یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ دونوں نظام ہائے تعلیم کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جرأت و حوصلہ سے کام لے کر ان دونوں نظاموں کی نفی کرتے ہوئے ایک نئے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جائے۔ ان دو نظام ہائے تعلیم کی نفی کا مطلب ان کے قومی کردار کی نفی نہیں ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرے میں قوم کی خدمت کی ہے اور ان میں سے کسی کے کردار کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کی ضرورت اور اہمیت کا دور گزر چکا ہے اور دونوں نظام اپنی طبعی عمر پوری کر چکے ہیں، اس لیے انہیں مصنوعی تنفس کے ذریعے سے زندہ رکھنے کی کوشش نہ عقل و دانش کا

تقاضا ہے اور نہ ہی ایسا کرنا نئی نسل کے ساتھ انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گا۔ ہمارے خیال میں قومی تعلیمی کمیشن کا اصل رول یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک نئے اور انقلابی تعلیمی نظام کے لیے قوم کی ذہن سازی کرے اور دونوں طبقوں کے ماہرین تعلیم کو اعتماد میں لے کر نئے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ تشکیل دے۔

نئے تعلیمی نظام کو بنیادی شخصی ضروریات اور قومی تقاضوں کے دو دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تعلیمی نظام کا پہلا حصہ بنیادی شخصی ضروریات پر مشتمل ہونا چاہیے اور دوسرے حصے میں قومی ضروریات کو ایک حسین توازن و تناسب کے ساتھ سمو دینا چاہیے۔ مثلاً اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کی مادری اور علاقائی زبان پر اسے عبور ہو اور وہ اسے لکھنے پڑھنے پر قادر ہو۔

۲۔ قومی زبان اردو پر بھی اسے یہی قدرت حاصل ہو۔

۳۔ دینی زبان عربی کے ساتھ اس کا اتنا تعلق ضرور ہو کہ وہ قرآن و حدیث کو سمجھ سکے۔

۴۔ بین الاقوامی زبان انگریزی پر بھی اسے دسترس حاصل ہو۔

۵۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کے بارے میں اسے اتنا دینی علم حاصل ہو کہ وہ ایک صحیح مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکے۔

۶۔ اتنا حساب کتاب جانتا ہو کہ روزمرہ کے معاملات میں اسے دقت پیش نہ آئے۔

۷۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے اس قدر ضرور واقف ہو کہ قومی تقاضوں کو سمجھ سکے۔

۸۔ وہ جدید سائنسی علوم کے بارے میں بھی بنیادی معلومات سے بہرہ ور ہو۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ ان بنیادی ضروریات پر مشتمل نصاب تعلیم کو میٹرک تک از سر نو مرتب کیا جائے اور اسے ہر شہری کے لیے قانوناً لازمی قرار دے دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے تعلیمی نظام میں قومی تقاضوں کو سامنے رکھ کر شعبوں کی تقسیم کی جائے۔ مثلاً ہمیں اچھے علماء کی ضرورت ہے، بہترین سائنس دانوں کی ضرورت ہے، قابل ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، ماہر انجینئروں کی ضرورت ہے، اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ماہرین درکار ہیں، اس لیے میٹرک کے بعد ہر طالب علم کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق ان میں سے کسی ایک شعبہ میں تعلیم و

مہارت حاصل کرے اور قومی پالیسی کے طور پر ایک ایسا توازن قائم کیا جائے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کی ضروریات تناسب کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔

دوسرا اہم سوال دینی مدارس کی ضروریات و مسائل میں حکومت کے ممکنہ تعاون کی صورت کے بارے میں ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ دینی مدارس معاشرہ میں قرآن و سنت اور دیگر دینی علوم کی ترویج اور بقاو تحفظ کا جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ بہت بڑی قومی خدمت ہے اور جب تک دینی تعلیم کی تمام ضروریات کو اپنے اندر سمونے والا کوئی ہمہ گیر نظام تعلیم وجود میں آکر مستحکم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک دینی مدارس کی ضروریات اور ان کا کردار بہرحال ایک ناگزیر قومی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ دینی مدارس کا یہ کردار ان کے اس آزادانہ نظام کی بدولت ہی تاریخ میں اپنی جگہ بنا سکا ہے جو ہر دور میں حکومت کی سرپرستی اور دخل اندازی سے بے نیاز رہا ہے۔ اگر دینی مدارس کو وقت کی حکومتوں کی دخل اندازی سے آزادی اور بے نیازی حاصل نہ ہوتی تو ان کی خدمات اور جدوجہد کے نتائج کی موجودہ شکل سامنے نہیں آسکتی تھی۔ اس لیے ہمارے نزدیک دینی مدارس کا سب سے بڑا مسئلہ اور ان کی سب سے اہم ضرورت ان کے آزادانہ تعلیمی کردار کا تحفظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو دینی ادارے اپنے معاشرتی کردار کی اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ ہیں، وہ ہر دور میں سرکاری امداد قبول کرنے سے گریزاں رہے ہیں اور آج بھی بے نیازی کی اسی روش پر گامزن ہیں۔ محتاط دینی اداروں کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں کا اسلام کے ساتھ تعلق مخلصانہ اور نظریاتی نہیں بلکہ مصلحت پرستانہ ہے اور وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ کسی بھی قسم کی سرکاری امداد حکومت کی پالیسیوں اور مصلحتوں کے ساتھ کسی نہ کسی درجے میں وابستگی کا احساس ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ پھر بعض تجربات نے اس احساس کو بھی جنم دیا ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں آنے کے بعد دینی مدارس شاید اپنے موجودہ کردار کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے، جیسا کہ محکمہ تعلیم کی تحویل میں آنے والے جامعہ عباسیہ بہاولپور اور محکمہ اوقاف کے کنٹرول میں آنے والے جامعہ عثمانیہ اوکاڑہ کے انجام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر حکومت دینی مدارس کو ان کے آزادانہ کردار کے تحفظ کا یقین اور اعتماد دلا سکے تو یہ ان مدارس کے ساتھ حکومت کا سب سے بڑا تعاون ہوگا اور پھر آزادانہ کردار کے تحفظ کے ساتھ دینی مدارس کے اخراجات میں ان سے تعاون، ان کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے میں ماہرین کے

ذریعے سے ان کی راہنمائی، ان کی سندات کی مسلمہ حیثیت کو یقینی اور قابلِ عمل بنانے اور ان کے درمیان رابطہ و تعاون کی فضا کو بہتر بنانے کے اقدامات کے ذریعے سے حکومت دینی مدارس کی بہتر خدمت کر سکتی ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۱۹۹۲ء)

معاشرہ میں دینی مدارس کا کردار اور اہمیت

۳۰ر نومبر ۱۹۹۹ء کو جامعہ اسلامیہ (ٹرسٹ) کامونکی کی نوتعمیر شدہ مسجد شہداء میں نماز باجماعت کے آغاز اور جامعہ کے ہسپتال کے افتتاح کے موقع پر ایک باوقار تقریب ہوئی جو ظہر سے مغرب تک جاری رہی۔ تقریب کی صدارت استاذ العلماء حضرت مولانا قاری محمد ظریف صاحب فاضل دیوبند نے کی جبکہ پیر طریقت حضرت مولانا پیر عبد الرحیم نقشبندی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے، پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی، پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ معارف اسلامیہ کے مدیر ڈاکٹر محمود الحسن عارف، مولانا خورشید احمد گنگوہی، مولانا سعید الرحمٰن احمد، قاری محمد عالمگیر رحیمی، حافظ فیاض احمد بٹ اور دیگر علماء کرام نے خطاب کیا اور جامعہ اسلامیہ کے بانی و مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی نے جامعہ کی کارکردگی اور عزائم سے شرکاء محفل کو آگاہ کیا۔

اس موقع پر مولانا زاہد الراشدی نے ”معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت اور کردار“ کے عنوان پر جو گفتگو کی، اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے (ادارہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

سب سے پہلے جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی اور ان کے رفقاء کو جامعہ کی جدوجہد میں مسلسل پیشرفت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مولانا فاروقی نے اپنی رپورٹ میں ہسپتال اور دیگر حوالوں سے جن عزائم کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں وقت کے تقاضوں اور آنے والے دور کی ضروریات کا احساس بیدار ہو رہا ہے اگرچہ اس کی رفتار بہت سست ہے جو ہمارے مزاج کا حصہ ہے تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ وقت کی ضرورتوں کا احساس پیدا ہو رہا ہے اور انہیں پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ پیشرفت بھی ہو رہی ہے۔

اس وقت کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اس لیے اختصار کے ساتھ اس درسگاہ اور اس جیسی ہزاروں دینی درسگاہوں کے حوالہ سے ایک دو ضروری باتیں عرض کرنا چاہوں گا، اس لیے کہ آج یہ

درسگاہ دنیا بھر کی اعلیٰ دانش گاہوں، اداروں، لابیوں، اور میڈیا سنٹروں میں موضوع بحث ہے اور معاشرہ میں اس کے کردار اور ضرورت کے بارے میں مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں۔ یہ درسگاہیں جنہیں دینی مدارس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس سطح پر موضوع گفتگو ہیں کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ جیسے نشریاتی ادارے ان کے بارے میں پروگرام پیش کرتے ہیں، ایمنسٹی اور اقوام متحدہ کے ادارے ان کے بارے میں رپورٹیں جاری کرتے ہیں بین الاقوامی پریس ان مدارس کے کردار کو موضوع بحث بنا رہا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ امریکہ کی کانگریس میں گزشتہ دنوں یہی دینی مدارس زیر بحث آئے ہیں اور ان کی بندش کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان مدارس کے حقیقی کردار سے آپ حضرات واقف ہوں اور اسی خیال سے چند معروضات پیش کر رہا ہوں۔

دینی مدارس سے آج کی دنیا کو کیا شکایات ہیں اور ان کے خلاف کونسے الزامات ہیں؟ ان پر ایک نظر ڈال لیجئے ان مدارس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آج کی سولائزیشن اور تہذیب کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور ورلڈ کلچر کے خلاف نئی نسل کی ذہن سازی کرتے ہیں۔ ان مدارس پر الزام ہے کہ یہ نئی پود کو مستقبل کی بجائے ماضی سے جوڑ رہے ہیں اور ترقی اور پیشرفت کی بجائے پسپائی کا سبق دے رہے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مدرسے دہشت گردی پھیلاتے ہیں، بنیاد پرستی کی آبیاری کرتے ہیں کلچر اور سولائزیشن کے دشمن ہیں، اور ہمارے ہاں تو ایک اور بات کہی جاتی ہے کہ ان مدارس سے تیار ہونے والی کھیپ کی معاشرہ میں کھپت نہیں ہے اور یہ بے کاروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کر رہے ہیں جو سوسائٹی کے کسی شعبہ میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کوئی مل مالک اپنی فیکٹری میں ایسا مال تیار نہیں کرتا جس کی مارکیٹ میں مانگ نہ ہو اور کوئی کاشت کار اپنے کھیت میں ایسی فصل نہیں بوتا جس کی منڈی میں طلب اور کھپت نہ ہو مگر یہ مدارس دھڑا دھڑ ایسے افراد پیدا کرتے جا رہے ہیں جن کی معاشرہ کے کسی شعبہ میں نہ طلب ہے اور نہ ہی کھپت ہے اس لیے ان مدارس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

الزامات کی فہرست بڑی لمبی ہے اور شکایات کا سلسلہ بہت طویل ہے لیکن وقت مختصر ہے اس لیے ان میں سے صرف دو الزامات کا آج کی محفل میں جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ مدارس آج کی تہذیب اور ورلڈ کلچر کے خلاف نئی نسل کی ذہن سازی کر رہے ہیں اور دوسرا یہ کہ ان مدارس کے تیار کردہ افراد کی معاشرہ کے کسی شعبہ میں کھپت نہیں ہے۔

جہاں تک ورلڈ کلچر اور جدید تہذیب کے خلاف نئی پود کی ذہن سازی کا تعلق ہے، میں اس الزام کو قبول کرتا ہوں اور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آج کے ورلڈ کلچر کو جو ویسٹرن سولائزیشن کی جدید شکل ہے، تسلیم نہیں کرتے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہمارے دینی مدارس کا بنیادی مشن ہی یہ ہے کہ نئی پود کو ویسٹرن سولائزیشن کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔ صرف اپنے نوجوانوں کو نہیں بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کو ہم اس ورلڈ کلچر سے نجات دلانا چاہتے ہیں، اس لیے کہ اس ورلڈ کلچر نے انسانیت کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا ہے اور انسانی اخلاق و اقدار اور رشتوں کے تقدس کا جنازہ نکال دیا ہے۔ میں ان مغرب والوں سے پوچھتا ہوں کہ یہ ہمیں کس کلچر اور تمدن کی دعوت دیتے ہیں اور کس سولائزیشن کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں؟ ان کے ورلڈ کلچر نے آج انسانی سوسائٹی کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے کم و بیش سب ملکوں میں ہم جنس پرستی اور مرد کا مرد کے ساتھ جنسی تعلق قانونی طور پر جائز قرار پا چکا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ برطانیہ کی ایک عدالت میں مقدمہ چلتا رہا جس میں ایک مرد نے دعویٰ کیا کہ اس کا ایک اور مرد کے ساتھ جنسی تعلق تھا اور وہ دونوں ایک جوڑے کے طور پر اکٹھے رہتے تھے، اب ان کے جنسی پارٹنر کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے اسے اپنے مرنے والے سیکس پارٹنر کی بیوی تسلیم کر کے اس کا قانونی طور پر وارث قرار دیا جائے۔ ابھی دو تین ہفتے قبل یہ خبر میں نے اخبارات میں پڑھی ہے کہ عدالت نے اس کا موقف تسلیم کر لیا ہے اور اسے مرنے والے ساتھی کا وارث قرار دے دیا گیا ہے۔ ہم اس کلچر کو تسلیم نہیں کرتے جس کلچر کی وجہ سے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر خدائی عذاب نازل ہوا تھا اور سدوم اور عمورہ جیسی بستیوں کو اللہ تعالیٰ نے صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا یہ کلچر انسانیت کی تباہی کا کلچر ہے، انسانی اخلاق و اقدار کی بربادی کا کلچر ہے اور خدا کی لعنت اور عذاب کو دعوت دینے والا کلچر ہے جس کے خلاف جدوجہد کو ہم اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ آج انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ نسل انسانی کو اس بربادی سے بچایا جائے اور اسے ان انسانی اخلاق و اقدار کی طرف واپس لایا جائے جن کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور وحی الٰہی پر ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ دینی مدارس یہی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ یہ مدارس جو طبقہ پیدا کر رہے ہیں اس کی معاشرہ میں کھپت نہیں ہے اور یہ معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری نہیں کر رہے اس لیے ان مدارس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ

الزام قطعی طور پر غلط ہے اور میں آپ حضرات کی خدمت میں یہ جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مدارس معاشرہ کی کونسی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں؟ اور ان مدارس کے پیدا کردہ افراد سوسائٹی کے کونسے خلا کو پُر کر رہے ہیں؟

اس کے لیے میں آپ کو حکومت پاکستان کے ایک اعلان کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو کم و بیش تین سال قبل وفاقی محتسب اعلیٰ کے ایک حکم کے بعد کیا گیا تھا کہ حکومت ملک بھر کے پرائمری سکولوں میں قرآن کریم کو لازمی ناظرہ تعلیم کا انتظام کرے گی۔ یہ دینی تعلیم کی سب سے نچلی سطح اور سب سے کم تر درجہ ہے کہ ایک مسلمان کم از کم قرآن کریم ناظرہ پڑھنے کی صلاحیت تو رکھتا ہو اس لیے جب حکومت نے سرکاری سطح پر پرائمری سکولوں میں قرآن کریم کی لازمی ناظرہ تعلیم کی ذمہ داری قبول کی تو ہم بہت خوش ہوئے کہ سب سے نچلی اور معمولی سطح پر ہی سہی مگر حکومت نے اس سلسلہ میں کسی ذمہ داری کا احساس تو کیا ہے۔ اس کو معمولی سطح پر میں اس حوالہ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ کام ہمارے ہاں بالکل معمولی درجہ کا سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ کام وہ ہے جو دیہات میں بعض عورتیں بھی اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی کرتی رہتی ہیں کہ محلہ کے بچوں اور بچیوں کو ناظرہ قرآن کریم پڑھا دیں اور بہت سے عورتیں ایسی ہیں کہ جیسا بھی قرآن کریم ان کو آتا ہے، وہ محلے کے بچوں کو پڑھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ہماری حکومت نے بھی ملک میں قرآن کریم کی تعلیم کا انتظام کرنے کی ذمہ داری اس سطح پر قبول کی لیکن تین چار سال گزر جانے کے باوجود ملک کے پرائمری سکولوں میں آج تک اس کا انتظام نہیں ہو سکا اور اس وقت بھی پرائمری سکولوں میں یہ سلسلہ موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ جب محکمہ تعلیم کے ذمہ دار حضرات سے دریافت کی گئی تو جواب ملا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا سمجھ لیا گیا ہے کیونکہ ملک بھر میں پرائمری سکولوں کی جو تعداد ہے اگر فی سکول دو استاذ بھی مہیا کیے جائیں تو اتنی تعداد میں قرآن کریم کے اساتذہ مہیا کرنا مشکل ہے اور اگر استاذ کہیں سے مل بھی جائیں تو ان کی تنخواہ دینے کے لیے بجٹ میں رقم نہیں ہے اس لیے یہ منصوبہ ناقابلِ عمل ہے۔

دوسری طرف اس بات کا جائزہ بھی لے لیجئے کہ ملک میں مسجدوں کی تعداد پرائمری سکولوں سے کم ہے یا زیادہ؟ میرا اندازہ ہے کہ ملک بھر میں مساجد اگر بہت زیادہ نہیں تو مجموعی طور پر پرائمری سکولوں سے پانچ گنا زیادہ تعداد میں تو یقیناً ہوں گی، ان مساجد میں خطیب فراہم ہو رہے ہیں، امام مل

رہے ہیں، قرآن کریم پڑھانے والے استاذ مل رہے ہیں اور اب رمضان المبارک قریب ہے، ہر مسجد میں قرآن کریم تراویح میں سنانے کے لیے حافظ میسر ہو گا بلکہ سامع بھی ملے گا حتیٰ کہ بعض علاقوں میں حافظوں کی تعداد مساجد کی تعداد سے بڑھ جاتی ہے اور قرآن پاک سنانے پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کھیپ کہاں سے آ رہی ہے اور ان سا تعلیمی سسٹم اور یونیورسٹی ہے جہاں سے ملک بھر میں پرائمری سکولوں سے پانچ گنا زیادہ تعداد میں مساجد کو امام، خطیب، مدرس اور حافظ مل رہے ہیں؟ یہ کھیپ نہ آسمان سے نازل ہوتی ہے اور نہ زمین سے اگتی ہے بلکہ یہی دینی مدارس ہیں جو معاشرے کی اتنی بڑی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں اور جس کام کی ذمہ داری قبول کرنے سے پورے ملک کا ریونیو وصول کرنے والی اور قومی بجٹ کنٹرول کرنے والی حکومت نے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں، اس قومی ضرورت کو یہ دینی مدارس پورا کر رہے ہیں اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ کتنے بجٹ ہیں؟ ان دینی مدارس کے بجٹ کو سرکاری تعلیمی اداروں کے بجٹ کے ساتھ کوئی نسبت بھی ہے؟ آپ حضرات تصور بھی نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم پڑھانے والے استاذ کتنے تھوڑے وظیفے پر کتنی لمبی ڈیوٹی دیتا ہے؟ قرآن کریم پڑھانے والا ایک صحیح استاذ صبح سحری کے وقت بچوں کو لیے بیٹھا ہوتا ہے، نماز فجر کے بعد پڑھاتا ہے، ظہر کے بعد پڑھاتا ہے، مغرب کے بعد پڑھاتا ہے اور رات سردی میں لمبی ہو تو عشاء کے بعد بھی گھنٹہ ڈیڑھ کے لیے بچوں کو لے کر پھر بیٹھ جاتا ہے۔ اتنی لمبی ڈیوٹی پر اس کو تنخواہ کتنی ملتی ہے۔ آپ کسی ایسے استاذ سے پوچھ کر دیکھ لیں۔

پھر آپ نے کبھی یہ نہیں سنا ہو گا کہ قاریوں نے تنخواہ کم ہونے کی بنا پر ہڑتال کر دی ہے، حافظوں نے قرآن کریم سنانے سے انکار کر دیا ہے یا اماموں نے نماز پڑھانے سے معذرت کر دی ہے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ جو طبقہ اتنے تھوڑے بجٹ کے ساتھ، اس قدر معمولی وظیفوں پر اور انتہائی صبر و ایثار کی فضا میں قوم کی اتنی بڑی ضرورت کو پورا کر رہا ہے اور اتنے بڑے خلا کو پر کیے ہوئے ہے اسکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ معاشرے میں اس کی ضرورت نہیں ہے اور دینی مدارس کے پیدا کردہ افراد کی سوسائٹی میں کوئی کھپت نہیں ہے۔

اس مختصر جائزے کے بعد ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں اور پھر گفتگو کو سمیٹ کر آپ سے اجازت لوں گا وہ یہ کہ جب دینی مدارس کے خلاف اتنی اعلیٰ سطح پر باتیں ہوتی ہیں کہ امریکہ اور اقوام متحدہ سے مطالبے آنے لگتے ہیں اور حکومتیں دھمکیاں دینے اور خوف زدہ کرنے پر اتر آتی ہیں تو بعض

دوست پریشان ہوتے ہیں کہ ان مدارس کا کیا بنے گا؟ میں ان سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مدارس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا اور یہ اسی طرح اپنا کام کرتے رہیں گے۔ اس لیے کہ یہ ہمارا ایمان کا حصہ ہے کہ قرآن کریم کی قیامت تک حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ قرآن کریم کی حفاظت کرے گا تو اس سینے کی بھی حفاظت کرے گا جس میں قرآن کریم موجود ہے اور اس سسٹم اور نظام کی بھی حفاظت کرے گا جو قرآن کریم کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال سے بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ دو دوست ایک جگہ بیٹھے دودھ پی رہے ہیں۔ ایک دوست اپنا دودھ کا گلاس رکھ کر دوسرے سے کہتا ہے کہ میں دو چار منٹ کے لیے ضروری کام کی وجہ سے جا رہا ہوں۔ میری واپسی تک دودھ کی حفاظت کرنا تاکہ کوئی جانور اسے پی نہ جائے اب وہ دوسرا شخص اپنے دوست کے آنے تک دودھ کی حفاظت کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ صرف دودھ کی حفاظت تو نہیں کر رہا بلکہ اس گلاس یا پیالے کی حفاظت بھی کر رہا ہے جس میں دودھ موجود ہے اور دودھ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کے برتن کی حفاظت بھی خود بخود ہو رہی ہے۔ اس لیے کسی تردد کے بغیر عرض کرتا ہوں کہ یہ دینی مدارس قرآن کریم اور اس کے علوم کی حفاظت کا تکوینی ذریعہ ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ ان دینی مدارس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرما رکھا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر وعدہ سچا اور پکا ہے۔ لہٰذا آپ حضرات کسی قسم کی پریشانی کا شکار نہ ہوں اور یہ یقین رکھیں کہ دینی مدارس کے سسٹم کو توڑنے کے لیے جو ہاتھ بھی اٹھے، وہ ہاتھ موجود نہیں رہے گا اور اس کا ہم ابھی پچھلے دنوں مشاہدہ کر بھی چکے ہیں، ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ نیت صحیح رکھیں، جذبہ خالص رکھیں اور اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق جو کچھ ہم سے ہو سکے، کام کرتے رہیں، نتائج خدا کے ذمہ ہیں اور اس نے خود پر صحیح بھروسہ رکھنے والوں کو پہلے بھی کبھی مایوس نہیں کیا اور آئندہ بھی کبھی نہیں کرے گا۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(الشریعہ یکم، ۱۶ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

دینی مدارس، حکومت اور بین الاقوامی حلقے

دینی مدارس کی اسناد کی حیثیت

حکومت اور دینی مدارس کی کشمکش کا ایک جائزہ

”دینی مدارس، انسانی حقوق اور مغربی لابیاں“ کے عنوان سے الشریعہ کی خصوصی اشاعت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے اس شمارے میں شامل کرنے کے لیے مضامین کے انتخاب میں اس ضرورت کو پیش نظر رکھا ہے کہ دینی مدارس کے خلاف مغربی لابیوں اور میڈیا کی مہم کے پس منظر اور مقاصد کو آشکارا کرنے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کے حوالہ سے دینی مدارس کے نصاب و نظام میں ناگزیر تبدیلیوں اور تعلیم کے جدید ذرائع اور مواقع سے دینی تعلیم کے لیے استفادہ کے امکانات کا جائزہ بھی قارئین کے سامنے آجائے تاکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اور اس محاذ پر کام کرنے والے حضرات کو زیادہ وسیع تناظر میں اپنے موقف، طریق کار اور ترجیحات کے تعین کا موقع مل سکے۔

اس کے ساتھ ہی ان سطور میں اس کشمکش پر ایک نظر ڈال لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو دینی مدارس کی حیثیت، اسناد اور ان کے مستقبل کے بارے میں حکومتی حلقوں اور مدارس کے درمیان موجود ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں دینی مدارس اگر سرکاری تحویل میں نہیں آتے تو کم از کم مالیاتی نگرانی اور امتحانات کے شعبوں میں ان پر ریاستی کنٹرول ضرور قائم ہو جائے۔ حکومتی حلقے اس کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس سے دینی تعلیم کے نظام میں یکسانی پیدا ہوگی، فرقہ واریت کی شدت میں کمی آئے گی، مالی بدعنوانیوں کے الزامات سے مدارس کے منتظمین محفوظ ہو جائیں گے، نصاب میں عصری علوم شامل ہونے سے علماء کی تعلیم کا معیار بہتر ہوگا اور امتحانات کا ایک معیاری نظام قائم ہو جائے گا۔

جہاں تک ان مقاصد کا تعلق ہے، ان کی افادیت سے کوئی باشعور شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن حکومت کو اس مہم میں کامیابی اب تک حاصل نہیں ہوئی اور نہ ہی مستقبل قریب میں حاصل ہونے کا کوئی امکان نظر آتا ہے جس کے اسباب ہمارے نزدیک یہ ہیں:

۱۔ دینی مدارس کے مالیاتی نظام کی بنیاد حکومتی ذرائع پر نہیں بلکہ معاشرہ کے اصحاب خیر کے رضاکارانہ تعاون پر ہے اور دینی مدارس کے آزادانہ نظام کی سوا سو سالہ جدوجہد کے نتیجہ میں یہ فضا بحمد اللہ ابھی تک موجود و مستحکم ہے کہ دینی تعلیم کے حوالہ سے عام آدمی کے اعتماد کا رشتہ دینی مکاتب و مدارس کے ساتھ قائم ہے۔ ہم نے ایک عوامی اجتماع میں اس موضوع پر گفتگو کے دوران میں اس صورت حال کی تعبیر یوں کی تھی کہ:

”مغربی لابیاں اور ذرائع ابلاغ دینی مدارس کی کردار کشی اور ان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لیے جو چاہے کر لیں، لیکن ہمارے معاشرے کے اس مزاج کو بدلنا ان کے بس میں نہیں ہے کہ دین سے تعلق رکھنے والا شہری خواہ وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے پڑوس میں رہتا ہو، مسئلہ پوچھنے کے لیے کسی دینی مدرسہ کے مولوی سے ہی رجوع کرے گا اور اگر وہ صدقے کا بکرا دینا چاہتا ہے تو اسے بھی کسی دینی مدرسہ یا مکتب تک پہنچا کر ہی مطمئن ہو گا۔“

جب تک یہ فضا موجود ہے، دینی مدارس کے مالیاتی نظام کو کسی حکومتی سہارے کی ضرورت نہیں اور جب مدارس حکومتی سہاروں سے بے نیاز ہیں تو اپنے نظام میں حکومتی دخل اندازی کو قبول کرنے کے لیے کیسے تیار ہوں گے؟

۲۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران میں قائم ہونے والی کوئی حکومت دین اور دینی اقدار کے حوالہ سے عوام میں یہ اعتماد حاصل نہیں کر سکی کہ لوگ اپنے دینی معاملات کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اس کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں بلکہ اس بارے میں بے اعتمادی کی یہ فضا قائم ہے کہ کوئی حکومت کسی دینی معاملہ میں کوئی صحیح قدم بھی اٹھاتی ہے تو اسے بھی عزائم اور مقاصد کے پس منظر میں بدنیتی اور سیاست کاری پر محمول کیا جاتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ اگر کوئی دینی مدرسہ، جماعت یا ادارہ حکومت کے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے تو جتنا وہ حکومت

کے قرب میں آگے بڑھتا ہے، اسی تناسب سے دین دار عوام کے اعتماد سے محروم اور شکوک و شبہات کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں دینی عوامی حلقوں کا اعتماد قائم رکھنے کے لیے دینی مدارس یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ حکومت سے جس قدر دور رہیں، بہتر ہے۔

۳۔ دینی مدارس پر ریاستی کنٹرول کے بارے میں کچھ تلخ عملی تجربات بھی حکومتی عزائم کے راستے میں رکاوٹ ہیں اور ان تجربات کے بعد دینی تعلیم کے حوالہ سے حکومتی نظام پر کسی درجے کا اعتماد قائم ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مثلاً بہاولپور کے جامعہ عباسیہ کو محکمہ تعلیم نے اسلامی یونیورسٹی قرار دے کر اپنی تحویل میں لے لیا اور اعلان کیا گیا کہ یہاں درس نظامی اور جدید تعلیم کا مشترکہ نظام پڑھایا جائے گا۔ کچھ عرصہ یہ نظام قائم رہا، حضرت علامہ شمس الحق افغانیؒ اور حضرت مولانا احمد سعید کاظمیؒ جیسے اکابر علماء کو وہاں لایا گیا، لیکن رفتہ رفتہ دینی تعلیم یعنی درس نظامی کا عنصر نصاب سے خارج ہوتا چلا گیا اور اب وہاں وہی نصاب و نظام رائج ہے جو ملک کے باقی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہے۔ اسی طرح اوکاڑہ کے جامعہ عثمانیہ کو، جو اپنے وقت میں ملک کے بڑے دینی مدارس میں شمار ہوتا تھا، محکمہ اوقاف نے اپنی تحویل میں لیا اور سرکاری نظام کے تحت اسے چلانے کا اعلان کیا گیا، لیکن اب وہاں صورت حال یہ ہے کہ مدرسہ کے کمرے محکمہ اوقاف نے مختلف فرموں اور کمپنیوں کو کرائے پر دے رکھے ہیں اور مدرسہ نامی کسی چیز کا کوئی وجود وہاں اس وقت نہیں ہے۔

ان واقعات سے دینی حلقوں کا یہ ذہن مزید پختہ ہو گیا ہے کہ دینی مدارس پر ریاستی کنٹرول سے حکمرانوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ مدارس یا تو جامعہ عثمانیہ اوکاڑہ کی طرح بالکل ختم ہو جائیں اور اگر ختم نہیں ہوتے تو جامعہ عباسیہ بہاولپور کی طرح سرکاری تعلیمی نظام میں ضم ہو کر اسی کا حصہ بن جائیں۔ اس وجہ سے بھی دینی مدارس اور ان سے وابستہ دین دار عوامی حلقے مدارس پر ریاستی کنٹرول یا سرکاری محکموں سے کسی درجہ کے تعلق کا ''رسک'' لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

حکومت پاکستان نے ایک دور میں دینی مدارس کی اسناد کو سرکاری سطح پر تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دینی مدارس کی آخری سند (شہادۃ العالمیہ) کو ایم اے اسلامیات و عربی

قرار دینے کا نوٹیفکیشن جاری کیا تھا جسے ملک کی بعض یونیورسٹیوں نے تسلیم کیا اور اس کی بنیاد پر فضلائے درس نظامی کو ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے مواقع بھی فراہم کیے، لیکن پنجاب یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم کی نوکر شاہی نے اسے تسلیم نہ کیا اور اسے غیر مؤثر بنانے کی مسلسل تگ و دو ہوتی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس سند کو تسلیم کرنے کے لیے پانچ سو نمبر کے بی اے کے امتحان کی شرط لگا دی، لیکن یہ بھی محض رسمی کارروائی تھی کیونکہ خود ہم نے شاہ ولی اللہ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں اس بنیاد پر فضلائے درس نظامی کو ۵۰۰ نمبر کا بی اے کا امتحان دلوانے اور اس کے بعد ایم اے اور پی ایچ ڈی کرانے کا نظام بنایا جس کے تحت فضلاء کی دو کلاسوں نے بی اے کا امتحان دیا، پنجاب یونیورسٹی نے امتحان لیا، رزلٹ کارڈ جاری کیے لیکن ڈگری دینے سے انکار کر دیا جس سے شاہ ولی اللہ یونیورسٹی گوجرانوالہ کا درس نظامی کے فضلاء کے حوالے سے سارا منصوبہ فلاپ ہو گیا اور اس کے بعد بھی دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں حکومتی پالیسی کے تذبذب کی وجہ سے ابھی تک کوئی متبادل پروگرام طے نہیں پا سکا۔

اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کی بیوروکریسی کی پالیسی مکمل طور پر حوصلہ شکن رہی ہے اور ہمارے ایک محترم دوست نے، جو ملک بھر کے انٹرمیڈیٹ بورڈز کے چیئرمینوں کی مشترکہ کمیٹی کے سیکرٹری رہے ہیں اور ایک دینی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، سرکاری کرسی پر بیٹھے ہوئے ہم سے صاف کہہ دیا تھا:

”مولوی صاحب! دینی مدارس کی اسناد کی سرکاری حیثیت کی بات آپ بھول جائیں۔ یہ ضیاء الحق کا ڈنڈا تھا جس کی وجہ سے ہم خاموش ہو گئے تھے اور کچھ دیر بات چل گئی تھی۔ اب اگر آپ ڈگری کی بات کرتے ہیں تو آپ کو سرکاری نظام کے تحت تھرو پراپر چینل آنا ہو گا، ورنہ ڈگری کی بات ذہن سے نکال دیں، ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“

یہی وجہ ہے کہ سرکاری کالجوں اور سکولوں میں ”درس نظامی گروپ“ کے نام سے وفاقی محکمہ تعلیم کا وہ منصوبہ بھی شکوک و شبہات کی نذر ہوتا دکھائی دے رہا ہے جس کی تیاری میں محکمہ تعلیم کے ایسے افسران بھی شامل ہیں جن کی دین داری اور دینی حمیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں ”درس نظامی گروپ“ کے نام سے دینی تعلیم کا یہ پروگرام وفاقی وزارت تعلیم نے تیار کیا تھا جسے انٹرمیڈیٹ بورڈوں کی مشترکہ کمیٹی کے اجلاس میں ملک بھر کے انٹرمیڈیٹ بورڈز کے چیئرمینوں نے منظور کر لیا ہے اور میٹرک اور ایف اے کے درجہ تک نصاب کی تفصیلات طے کر کے

اس کا باقاعدہ نوٹیفیکیشن بھی جاری کیا جا چکا ہے۔ اس نوٹیفیکیشن کا نمبر (F.1-2/93-IF-II) ہے اور ۷/۲ ستمبر ۹۴ء کو وفاقی وزارت تعلیم کے اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر جناب محمد حنیف کے دستخطوں سے جاری ہوا ہے۔ اس کے مطابق میٹرک میں ۱۰۰ نمبر کی اردو، ۷۵ نمبر کا مطالعہ پاکستان، ۱۰۰ نمبر کی جنرل سائنس اور ۱۰۰ نمبر کی جنرل ریاضی کے ساتھ ۱۰۰ نمبر کا ترجمہ قرآن کریم (فاتحہ تا سورہ النساء)، ۱۰۰ نمبر کی حدیث و سیرت، ۱۰۰ نمبر کی صرف و نحو (علم الصیغہ، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو) اور ۷۵ نمبر کی فقہ (قدوری) شامل کر کے میٹرک کے ساڑھے آٹھ سو نمبر مکمل کیے گئے ہیں، جبکہ ایف اے میں نصاب کی تفصیل یوں ہے:: انگلش ۱۰۰ نمبر، اردو ۱۰۰ نمبر، مطالعہ پاکستان ۵۰ نمبر، ترجمہ قرآن کریم (سورہ المائدہ تا اختتام سورہ کہف) ۱۵۰ نمبر، حدیث اور اصول حدیث ۱۰۰ نمبر، فقہ ۱۰۰ نمبر، اصول فقہ ۱۰۰ نمبر، صرف و نحو ۱۰۰ نمبر، عربی ادب ۱۰۰ نمبر، منطق ۱۰۰ نمبر، تاریخ اسلام ۱۰۰ نمبر اور اس طرح ایف اے کے گیارہ سو نمبر۔

دینی تعلیم کے نصاب میں عصری علوم کو شامل کرنے کے حوالے سے دینی حلقوں دو حصوں میں تقسیم ہیں:

1. ایک حصہ میں وہ دینی مدارس شامل ہیں جنہوں نے درس نظامی کے ساتھ میٹرک، ایف اے اور بی اے کی ریگولر تعلیم اور امتحانات کو اپنے نظام میں شامل کر لیا ہے اور ''نظامت تعلیمات اسلامیہ'' کے نام سے ایک الگ وفاق قائم کر کے اس بنیاد پر کام شروع کر دیا ہے۔ اس وفاق کا ہیڈ کوارٹر جامعہ منظور الاسلامیہ، عید گاہ، لاہور چھاؤنی میں قائم ہے۔ ان حضرات نے اس مقصد کے لیے درس نظامی کے مروجہ نصاب میں تخفیف کی ہے جو بعض اہل علم کے نزدیک محل نظر ہے، لیکن بہر حال ایک تجرباتی کام کا آغاز ہو گیا ہے۔
2. دوسرے حصہ میں وہ حضرات ہیں جو درس نظامی کے نصاب اور اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کو گڈمڈ کر دینے کے قائل نہیں ہیں اور وہ اسکول و کالج کے نصاب کو بنیاد بنا کر اس میں دینی تعلیم کو اس حد تک سمو دینا چاہتے ہیں کہ اس نصاب سے گزرنے والا طالب علم قرآن پاک سے استفادہ کی اہلیت حاصل کر سکے اور دین کے بارے میں ضروری معلومات رکھنے والا مسلمان ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ درس نظامی کے فضلاء کے لیے کسی ایسے نظام

کے خواہش مند ہیں کہ ان میں سے ذہین اور باصلاحیت حضرات عصری تعلیم کے ضروری مراحل سے گزر کر قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل ہوں اور عدلیہ اور انتظامیہ میں دینی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور رجال کار کی کمی کا خلا کم سے کم کیا جا سکے۔ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی گوجرانوالہ کے قیام کا بنیادی ہدف یہی ہے جو ابھی تجربات کے مد و جزر سے گزر رہی ہے۔ ہمارے نزدیک پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، محترم پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری، مولانا محمد اکرم اعوان اور ان جیسے دیگر ارباب فکر و دانش کے قائم کردہ مختلف تعلیمی نظام اسی تیسرے عنصر کے دائرے میں شامل ہیں اور ان کے علاوہ بھی پورے ملک میں عربک سکولوں، اکیڈمیوں اور اداروں کا ایک وسیع سلسلہ دن بدن بڑھ رہا ہے اور اگر ان سب کے درمیان مفاہمت و مشاورت کا کوئی نظام قائم ہو جائے تو قومی سطح پر ایک مستقل نظام تعلیم کا مضبوط ”نیٹ ورک“ سامنے آسکتا ہے۔

آخر میں ہم ایک اور عنصر کی نشان دہی بھی ضروری سمجھتے ہیں اور وہ دینی مدارس کے وہ فضلاء ہیں جو وفاق ہائے دینی مدارس کی اسناد کی نیم دلانہ سرکاری حیثیت کی بنیاد پر سرکاری سکولوں اور کالجوں میں گئے، وہاں مسائل کا شکار ہوئے، ماحول میں اپنے لیے اجنبیت محسوس کی، سرکاری اہل کاروں کے ہاں دوسرے درجے کے ملازمین قرار پائے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایسوسی ایشنیں قائم کر لیں۔ یہ حضرات دینی مدارس کے فضلاء ہیں، دینی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہیں، ملازمت کے حوالے سے دینی مقاصد اور مشنری جذبہ رکھتے ہیں، لیکن مشکلات اور رکاوٹوں کا شکار ہیں۔ مختلف شہروں میں ان کی تنظیمیں قائم ہیں۔ گزشتہ ماہ ڈیرہ غازی خان میں ایسے ہی دوستوں کی ایک تنظیم ”رابطہ فضلائے اسلامی“ کے کنونشن میں ہمیں بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کے کنوینر مولانا محمد ادریس (پوسٹ بکس ۵۴ ڈیرہ غازی خان) ہیں جو دینی خدمت اور فضلائے درس نظامی کو متحد و منظم کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ کنونشن میں ہم نے دینی مدارس کے بارے میں بہت سی گزارشات کیں جن کا ایک حصہ اس مضمون میں آگیا ہے اور یہ بھی گزارش کی کہ اس رخ پر کام کرنے والی فضلاء کی تنظیموں کو باہمی مشاورت و رابطہ کے ساتھ ملکی سطح پر اپنا کوئی مشاورتی نظام قائم کرنا چاہیے۔ اب پھر ان سطور میں ہم اس گزارش کو دہرا رہے ہیں کہ دینی مدارس کے فضلاء کی مختلف شہروں میں کام کرنے والی

تنظیمیں قومی سطح پر اپنا کوئی نظم قائم کر سکیں تو یہ نہ صرف ان کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے مفید بات ہو گی بلکہ عمومی دینی جدوجہد میں بھی وہ ایک مؤثر اور فعال عنصر کے طور پر شریک ہو سکیں گے۔

یہ ہے ایک ہلکا سا نقشہ قومی زندگی میں دینی تعلیم کے سلسلہ میں مختلف سطحوں پر پائی جانے والی فکری و عملی کشمکش کا جس کا قارئین کے سامنے آنا ضروری تھا اور ان معروضات کا اختتام ہم اس گزارش پر کر رہے ہیں کہ دینی تعلیم کے لیے کام کرنے والے حضرات جس رخ پر بھی کام کریں اور جو طریق کار بھی اپنائیں، یہ ان کی صوابدید کی بات ہے لیکن باہمی رابطہ و مشاورت کی فضا ضرور قائم کریں۔ اس سے ان کے کام کی افادیت اور وزن دونوں میں اضافہ ہو گا اور وہ معاشرہ میں دینی تعلیم و تربیت کے فروغ کے مشترکہ مقصد میں زیادہ اعتماد اور دلجمعی کے ساتھ پیشرفت کر سکیں گے۔

(ماہنامہ الشریعہ، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۶ء)

دینی مدارس کی اسناد: ایک پہلو یہ بھی ہے

میرے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث کر کے ۱۹۴۳ء میں گکھڑ آئے اور تب سے یہیں ہیں۔ وہ یہ واقعہ خود سناتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد جب پہلی بار انتخابات کا مرحلہ آیا اور ووٹروں کی فہرستیں مرتب ہوئیں تو ان کا نام ووٹر لسٹ میں نہیں تھا۔ پوچھا گیا تو پتہ چلا کہ چونکہ آپ سرکاری قانون کی رو سے ''ان پڑھ'' ہیں اور انتخابی قواعد کی رو سے ووٹ دینے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اس لیے آپ کا ووٹر لسٹ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں ''پڑھا لکھا'' متصور ہونے کے لیے پرائمری سطح کی سکول کی تعلیم شرط تھی۔ حضرت والد صاحب نے کسی پرائمری سکول سے یہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور ان کے پاس کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھا، اس لیے ان کا شمار اس دور میں ''ان پڑھوں'' میں ہوتا تھا جب کہ وہ اس وقت تک نصف درجن کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف ہو چکے تھے، ان کا تدریسی تجربہ دس سال سے تجاوز کر چکا تھا اور سینکڑوں حضرات ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ رہ چکے تھے جن میں صدر پاکستان جسٹس محمد رفیق تارڑ، آئی جی ریلوے پولیس احمد نسیم چودھری اور بریگیڈیئر (ر) محمد علی چغتائی جیسے جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی شامل ہیں، مگر ان سب کا استاذ ہونے کے باوجود حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا شمار سرکاری کاغذات میں تعلیم یافتہ حضرات کی فہرست میں نہیں ہوتا تھا اور ان کا نام صرف اس وجہ سے پاکستان کے اولین انتخابات کی ووٹر لسٹ میں نہیں تھا کہ وہ پرائمری پاس نہیں تھے۔

یہ انگریز کے قانون اور نظام کے اثرات تھے جو قیام پاکستان کے بعد بھی ہمارے سسٹم میں باقی رہے اور اب تک باقی چلے آ رہے ہیں۔ دینی مدارس کی اسناد کو سرکاری سطح پر تسلیم کرانے کی مہم ۱۹۷۳ء میں شروع ہوئی جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے، جو قومی اسمبلی میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کے پارلیمانی گروپ کے لیڈر اور متحدہ حزب اختلاف کے قائد ہونے کے ساتھ ساتھ دیوبندی مکتب فکر

کے دینی مدارس کے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل بھی تھے، جمعیت کے حلقوں میں اس بات پر صلاح مشورہ کیا کہ قومی اسمبلی میں اس نوعیت کی قرارداد آنی چاہیے کہ جس میں سفارش کی گئی ہو کہ دینی مدارس کی اعلیٰ سند کو ایم اے اسلامیات کے برابر تسلیم کیا جائے کیونکہ سرکاری یونیورسٹیوں میں ایم اے اسلامیات کے لیے جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، ہمارے ہاں کا نصاب اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور معیار بھی اس سے بلند تر ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ دینی مدارس کے فضلاء کو ایم اے اسلامیات کے مساوی تسلیم نہ کیا جائے۔ ایک مرحلہ میں اس مشورہ میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ میری رائے اس سے مختلف تھی۔ میں نے گزارش کی کہ فاضل درس نظامی کو براہ راست ایم اے کا درجہ دلوانے کے بجائے اگر آپ اسے اسلامیات یا عربی میں کسی یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان دینے کا حق دلا سکیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا، مگر حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا اور اس بات کی کوشش شروع ہوگئی کہ قومی اسمبلی سے اس مقصد کے لیے سفارش کی قرارداد منظور کرائی جائے۔

مشورہ میں ایک موقع پر یہ بات بھی آئی کہ ہم تو قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ قرارداد غیر سرکاری طور پر کسی ممبر کی طرف سے پرائیویٹ تحریک کی صورت میں آسکتی ہے لیکن اس کے لیے سرکاری بنچوں میں بھی کوئی حمایت تلاش کرنی چاہیے تاکہ اس کی منظوری میں آسانی ہو جائے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ نے، جو اس وقت جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے مرکزی ناظم تھے، میرے ذمے لگایا کہ میں گوجرانوالہ سے پیپلز پارٹی کے ایم این اے میاں منظور حسن مرحوم سے بات کروں۔ میاں منظور حسن مرحوم گوجرانوالہ کے سینئر وکلاء میں سے تھے۔ پرانے مسلم لیگی تھے۔ مقامی سیاست کی دھڑے بندی کی وجہ سے انہوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا تھا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے۔ تحریک ختم نبوت میں سرگرم کردار ادا کر چکے تھے۔ دین کے ساتھ محبت رکھتے تھے، نمازی آدمی تھے، علماء کا احترام کرتے تھے اور گوجرانوالہ میں ختم نبوت یا کسی اور دینی حوالے سے علماء کرام کے خلاف کوئی کیس بنتا تھا تو اس کی پیروی میاں صاحب مرحوم بلا معاوضہ کیا کرتے تھے۔ میرے بھی ایک دو کیس اس زمانے میں میاں صاحب مرحوم نے لڑے تھے۔ میں نے ان سے بات کی تو بہت خوش ہوئے کہ اس سلسلہ میں علماء کے حلقوں نے مجھ

پر اعتماد کیا ہے اور وہ اس اعتماد پر پورا اتریں گے۔ میں نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے گزارش کی کہ وہ اجلاس کے موقع پر میاں منظور حسن سے اپنے طور پر بھی بات کر لیں، وہ قرارداد کی منظوری میں تعاون کریں گے۔ چنانچہ میری یادداشت کے مطابق یہ قرارداد قومی اسمبلی میں حضرت مولانا عبد الحکیم ایم این اے کی طرف سے آئی۔ میاں منظور حسن نے اس پر بڑی خوبصورت تائیدی تقریر کی اور قومی اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے سے حکومت سے سفارش کر دی کہ فضلائے درس نظامی کی آخری سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کیا جائے۔

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم قومی اسمبلی میں قائد ایوان تھے اور اس طرح قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کار خیر کی سعادت بھی ان کے حصے میں آئی کہ ان کی قیادت میں قومی اسمبلی کے ایوان نے دینی مدارس کی سند کو سرکاری سطح پر تسلیم کرنے کی باقاعدہ سفارش کی۔ اس کے بعد یہ مسئلہ ''یونیورسٹی گرانٹس کمیشن'' کے پاس آیا جو اس سلسلے میں مجاز اتھارٹی ہے۔ کئی برس تک گفتگو، یادداشتوں اور وضاحتوں کا معاملہ چلتا رہا اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور دیگر وفاقوں کے ساتھ طویل گفت و شنید اور بحث و تمحیص کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دینی مدارس کے نصاب کی درجہ بندی کرا کے ان کی مختلف سندات کو میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے برابر قرار دینے کا باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کر دیا جس کی بنیاد پر مختلف یونیورسٹیوں میں بہت سے فضلاء نے ایم فل، پی ایچ ڈی اور دیگر امتحانات کی طرف پیشرفت کی اور ڈگریاں حاصل کر کے متعدّد شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

اس پس منظر میں جب گزشتہ انتخابات کے موقع پر یہ مسئلہ پیش آیا کہ صدر پرویز مشرف نے ایل ایف او کے تحت الیکشن لڑنے کے لیے بی اے کی شرط کو لازمی قرار دے دیا ہے تو کیا دینی مدارس کے فضلاء اس الیکشن میں حصہ لے سکیں گے؟ چیف الیکشن کمیشن نے اس سلسلے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے باضابطہ دریافت کیا کہ کیا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دینی مدارس کی اسناد کو تسلیم کرتا ہے، تو یو جی سی نے الیکشن کمیشن کے جواب میں واضح طور پر کہا کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی اعلیٰ اسناد کو ایم اے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے جس پر چیف الیکشن کمشنر نے درس نظامی کے فضلاء کو گریجویٹ تسلیم کرتے ہوئے انہیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے دی، لیکن اب یہ مسئلہ کھڑا کر دیا گیا ہے کہ درس

نظامی کے فضلاء کی سند کو صرف تعلیمی مقاصد کے لیے تسلیم کیا گیا ہے اور ان اسناد کو کسی دوسرے شعبے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مجاز ادارہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ہے جس نے چیف الیکشن کمشنر کے استفسار پر کہا کہ دینی مدارس کے فضلاء کی اعلیٰ اسناد کو ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر یہ اسناد صرف تعلیمی شعبہ کے لیے کارآمد ہیں اور الیکشن کے مقاصد کے لیے انہیں تسلیم نہیں کیا گیا تو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے چیف الیکشن کمشنر کے استفسار کے جواب میں یہ واضح کیوں نہیں کیا کہ جناب! یہ اسناد آپ کے کام کی نہیں ہیں؟ اور پھر جب الیکشن کمیشن نے الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی اور سینکڑوں علماء نے اس سند کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لیا تو یہ سب کچھ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، اس نے اس کا نوٹس کیوں نہیں لیا؟ اور اب جبکہ متحدہ مجلس عمل ملک کے بنیادی مسائل پر سرکار کے ایجنڈے کو قبول کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آ رہی تو اس پر سیاسی دباؤ کے لیے یا اسے بالآخر میدان سے آؤٹ کرنے کے لیے یہ سوال کیوں کھڑا کر دیا گیا ہے؟

یہ یقیناً متحدہ مجلس عمل کو سیاسی دباؤ میں رکھنے یا علماء کرام کو قومی سیاست سے آؤٹ کرنے کی پالیسی کا حصہ ہے، لیکن میرے خیال میں اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ دینی مدارس کے تمام وفاق اس سلسلے میں اب تک متفقہ اور مشترکہ موقف کے طور پر دینی مدارس کے معاملات میں سرکاری مداخلت کی تجاویز کو مسترد کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر دینی مدارس کے یہ وفاق اپنے موقف پر قائم رہتے ہیں اور ان کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوتی تو دینی مدارس کے نظام و نصاب کی اصلاح کے لیے کروڑوں ڈالر کی جو امداد امریکہ بہادر نے دی ہے، اس کا مصرف کیا ہو گا؟ اور دینی مدارس کے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اور شیعہ وفاقوں کے مضبوط موقف اور اتحاد کی موجودگی میں دینی مدارس کی کتنی تعداد کو ڈالروں کا لالچ دے کر سرکاری کیمپ میں شامل کرنے کے لیے توڑا جا سکے گا؟

میرا خیال ہے کہ اس خرید و فروخت کی راہ ہموار کرنے کے لیے وفاقوں کو غیر مؤثر کرنا ضروری سمجھا گیا ہے اور اس کی یہ صورت زیادہ بہتر تصور کی گئی ہے کہ چونکہ ان اسناد کو سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کی وجہ سے ہی دینی مدارس کی ایک بڑی تعداد ان وفاقوں سے وابستہ ہے، اس لیے اس وجہ کو ختم

کیا جائے اور دینی مدارس کی اسناد کو تسلیم کیے جانے کے عمل کو ہی سبوتاژ کر دیا جائے تاکہ مدارس پر وفاقوں کی گرفت ڈھیلی ہو اور انہیں امریکی ڈالروں کے جال میں آسانی کے ساتھ پھانسا جا سکے۔ بہرحال جو صورت بھی ہو، یہ وہی حربہ ہے جو انگریزوں نے اپنے دور میں علماء کرام کو معاشرتی طور پر غیر مؤثر بنانے کے لیے انہیں تعلیم یافتہ تسلیم نہ کر کے اختیار کیا تھا اور اب اسی فارمولے کے مطابق علماء کرام سے تعلیم یافتہ ہونے کا ٹائٹل واپس لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر دینی مدارس کے وفاق اپنے موقف پر قائم رہے اور ان میں رخنہ ڈالنے کی کوئی کوشش آگے نہ بڑھی تو پہلے کی طرح یہ بحران بھی بالآخر ان کی کامیابی پر ہی ان شاء اللہ العزیز منتج ہو گا، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ وفاقوں کا باہمی رابطہ و مشاورت مسلسل جاری رہے، وہ اپنے موقف سے رائے عامہ اور خاص طور پر دینی مدارس کے منتظمین و معاونین کو آگاہ کرتے رہیں اور ملک کی دینی قیادت کو ہر مرحلہ پر اعتماد میں لے کر ان کے مشوروں سے اپنی حکمت عملی اور پروگرام وضع کریں۔

(روزنامہ اسلام، ۶؍ جولائی ۲۰۰۳ء)

دینی مدارس کی اسناد کا مسئلہ

دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ اور رجسٹریشن کے حوالے سے صدارتی آرڈیننس بیک وقت سامنے آگئے ہیں اور دین کی تعلیم دینے والی درس گاہیں ایک بار پھر ملک بھر میں گفتگو اور تبصروں کا موضوع بن گئی ہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس سے قبل عبوری فیصلے میں دینی مدارس کی اسناد رکھنے والوں کو بلدیاتی الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دے دی تھی مگر الیکشن کے پہلے مرحلے سے صرف دو روز قبل حتمی فیصلہ صادر کر کے یہ قرار دے دیا کہ دینی مدارس کے وفاقوں سے شہادۃ ثانیہ رکھنے والے افراد نے چونکہ مطالعہ پاکستان، انگلش اور اردو کے لازمی مضامین کا میٹرک کے درجہ میں امتحان نہیں دیا، اس لیے اس سند کو میٹرک کے مساوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس سند کے حاملین بلدیاتی الیکشن میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ اگرچہ اس فیصلے کا فوری اطلاق ان حضرات پر ہوا ہے جو اس رٹ میں فریق تھے، لیکن اٹارنی جنرل کا یہ کہنا اہمیت رکھتا ہے کہ جن لوگوں نے دینی مدارس کی اسناد کی بنیاد پر بلدیاتی الیکشن میں حصہ لیا ہے، وہ کامیاب ہونے کے باوجود اس فیصلے کی رو سے نااہل ہو جائیں گے بلکہ یہ فیصلہ سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ان ارکان پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے جنہوں نے دینی مدارس کی اسناد کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لیا ہے اور منتخب ہوئے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے کم و بیش دو سو ارکان اس فیصلے کی زد میں آسکتے ہیں۔ چنانچہ ایک معروف قانون دان محمد اسلم خاکی نے اپنی ایک سابقہ رٹ کو جلد از جلد زیر بحث لانے کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان میں درخواست دے دی ہے۔ ان کی رٹ میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ دینی مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے چونکہ صرف تعلیمی مقاصد کے لیے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے برابر تسلیم کیا ہے، اس لیے تعلیمی مقاصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے ان اسناد کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور چیف الیکشن کمشنر نے گزشتہ انتخابات میں شہادۃ العالمیہ کی سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کرتے ہوئے اس کے حاملین کو قومی اور

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے کی جو اجازت دی تھی، وہ درست نہیں تھی، اس لیے عدالت عظمیٰ اس اجازت نامے کو منسوخ کرتے ہوئے دینی اسناد پر منتخب ہونے والے اسمبلیوں کے ارکان کو نااہل قرار دے۔ رٹ ابھی موجود ہے اور اس پر فیصلہ ہونا باقی ہے، اس لیے رٹ کے محرک نے دوبارہ درخواست دائر کر دی ہے کہ اس رٹ کو جلد از جلد زیر بحث لایا جائے اور اس پر فیصلہ صادر کیا جائے۔

دوسری طرف بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں گومگو اور تذبذب کی فضا قائم رکھنا موجودہ حکومت کی طے شدہ پالیسی کا حصہ ہے تاکہ متحدہ مجلس عمل کو دباؤ میں رکھا جائے اور اسے حکومت کے خلاف کسی عملی تحریک کا حصہ بننے سے روکا جائے۔ ان سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ چونکہ متحدہ مجلس عمل نے اے آر ڈی کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف گرینڈ الائنس قائم کرنے اور احتجاجی تحریک منظم کرنے کا حال ہی میں فیصلہ کر لیا ہے، اس لیے دینی مدارس کی اسناد کی قانونی حیثیت کا مسئلہ دوبارہ سامنے آ گیا ہے تاکہ متحدہ مجلس عمل حکومت کے خلاف عملی تحریک کا حصہ نہ بنے اور اگر وہ حکومت کے خلاف تحریک کے فیصلے میں سنجیدہ ہے تو اسمبلیوں میں اپنے کم وبیش دو سو ارکان کے نااہل قرار دیے جانے کے فیصلے کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔ اس طرح دینی مدارس کی اسناد کا مسئلہ فنی اور تعلیمی دائرے سے نکل کر سیاسی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے جو بہرحال ایک توجہ طلب بات ہے اور اس پر دینی مدارس کے وفاقوں کی اعلیٰ قیادت اور اس کے ساتھ ہی متحدہ مجلس عمل کی ہائی کمان کو بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

جہاں تک فنی مسئلہ کی بات ہے، ہمارے خیال میں جب دینی مدارس کے وفاقوں نے میٹرک کی سطح تک مطالعہ پاکستان، اردو اور انگلش کے مضامین کو اپنے نصاب میں شامل کر کے اس پر عملدرآمد شروع کر رکھا ہے تو اس تبدیلی کو سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے میں بالکل نظر انداز کیے جانے کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ہمارے خیال میں یہ بات سپریم کورٹ کے علم میں سرے سے لائی ہی نہیں گئی اور دینی مدارس کی اسناد کا دفاع کرنے والے وکلاء اس سلسلے میں پورے حقائق عدالت عظمیٰ کے سامنے نہیں رکھ سکے، ورنہ شاید فیصلے کی حتمی صورت یہ نہ ہوتی۔ اب بھی تمام وفاقوں کی قیادت سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ عدالت عظمیٰ میں اس کیس کی خود پیروی کریں اور مذکورہ فیصلے پر نظر ثانی کی اپیل

کے لیے ملک کے نامور وکلاء سے صلاح مشورہ کر کے دینی مدارس کی اسناد کے دفاع کے لیے پیشرفت کریں۔

جہاں تک رجسٹریشن کا تعلق ہے، ہمارے خیال میں یہ بات اطمینان بخش ہے کہ دینی مدارس کی رجسٹریشن سابقہ سوسائٹی ایکٹ کے تحت کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو خود دینی مدارس کا مطالبہ تھا اور وہ اس ایکٹ کے تحت رجسٹریشن کے لیے نہ صرف تیار تھے بلکہ ہزاروں مدارس نے اس سے قبل سوسائٹی ایکٹ کے تحت اپنی رجسٹریشن کرا رکھی ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ۱۸۶۰ء کے سوسائٹی ایکٹ میں ایک نئی شق کا اضافہ قابلِ غور ہے جس کے تحت دینی مدارس کے لیے رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور سالانہ کارکردگی اور آڈٹ شدہ حسابات کی رپورٹ کی کاپی رجسٹریشن آفس میں جمع کرنے کا انہیں پابند کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان تینوں امور میں بظاہر کوئی حرج کی بات نہیں اور یہ باتیں نتائج کے حوالے سے دینی مدارس کے لیے فائدہ کا باعث ہی ہوں گی، البتہ دینی مدارس میں فرقہ وارانہ تعلیم کی ممانعت کی شق مبہم ہے، اس لیے کہ فرقہ وارانہ تعلیم کا ایک پہلو یہ ہے کہ ملک میں مختلف مذہبی فرقے آباد ہیں اور ان کے دینی مدارس کام کر رہے ہیں، اس لیے ان فرقوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے، امن عامہ کے مسائل کھڑے کرنے اور قومی وحدت کو مجروح کرنے کی سرگرمیوں کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور ایسی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور ان کی روک تھام کرنا حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو علمی و تحقیقی وضاحت سے متعلق ہے جس میں اپنے مسلک کی علمی وضاحت اور دلائل کی بنیاد پر اس کی ترجیح کی طرز اختیار کی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف پاکستان کے دینی مدارس میں ہوتا ہے بلکہ دنیا بھر میں تمام مذاہب کی مذہبی درس گاہوں میں اس کا صدیوں سے اہتمام چلا آ رہا ہے، لہٰذا اس نئے آرڈیننس میں ان دونوں پہلوؤں کے درمیان فرق کی وضاحت ضروری ہے، ورنہ یہ مسئلہ بھی وہی صورت اختیار کر سکتا ہے جو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی صورت میں اس وقت دنیا کو درپیش ہے کہ دہشت گردی کی کسی سطح پر کوئی تعریف متعیّن نہیں ہے اور اسے مکمل طور پر ابہام میں رکھا گیا ہے جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والے اس ابہام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جس مخالف کو چاہتے ہیں، دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف جنگ کا محاذ کھول دیتے ہیں۔ اسی طرح فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ سرگرمیوں کی حدود اگر واضح طور پر طے نہ

کی گئیں تو نہ صرف یہ کہ علم و تحقیق کے راستے مسدود ہو جائیں گے بلکہ یہ بات مکمل طور پر حکومت اور متعلقہ افسران کی صوابدید پر ہوگی کہ وہ جس مدرسہ کو چاہیں فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں ملوث قرار دے کر اسے بند کرنے کا حکم جاری کر دیں۔

ہمارے خیال میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور دینی مدارس کے دیگر وفاقوں کی قیادتوں کو اس مسئلے کے حوالے سے صورت حال کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور حکومت کے ساتھ مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے سے اس کا فوری طور پر حل نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے، ورنہ یہ بیوروکریسی کے ہاتھ میں دینی مدارس کے خلاف ایک ایسا ہتھیار ثابت ہوگا جس سے ملک کی تمام دینی درس گاہیں مکمل طور پر متعلقہ محکموں اور افسروں کے رحم و کرم پر ہوں گی اور دینی مدارس کی جس آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کی ایک عرصہ سے جنگ لڑی جا رہی ہے، وہ فرقہ وارانہ تعلیم پر پابندی کی اس مبہم شق کے باعث بیوروکریسی کے ہاتھ میں گروی ہو کر رہ جائے گی۔

(روزنامہ اسلام لاہور ۲۰/ اگست ۲۰۰۵ء)

دینی مدارس کے نصاب کے مندرجات پر ایک نظر

دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے حالیہ فیصلے کے بعد یہ سوال ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ دینی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کا معیار کیا ہے اور وہ قوم اور معاشرے کی کون سی ضروریات پوری کرتے ہیں؟ اس لیے کہ عدالت عظمیٰ کے فیصلے میں یہ کہا گیا ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء معیار میں اسکولوں اور کالجوں کے فضلاء کے معیار پر پورا نہیں اترتے، اس لیے ان کی اسناد کو تعلیمی ضروریات کے علاوہ اور کسی مقصد کے لیے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس سلسلے میں کسی تفصیلی بحث میں جانے کے بجائے دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب کا ایک خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے انہیں یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو گی کہ دینی مدارس میں اس وقت جو مواد زیر درس ہے، اس کی نوعیت کیا ہے اور قومی و معاشرتی ضروریات کے ساتھ اس تعلیمی مواد کا کیا تعلق ہے؟

اس وقت ملک بھر میں قائم دینی مدارس کی غالب اکثریت پانچ وفاقوں کے ساتھ وابستہ ہے جس کی تقسیم مسلکی حوالے سے ہے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان اہل سنت حنفی، دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتا ہے، تنظیم المدارس اہل سنت حنفی، بریلوی مسلک کے مدارس پر مشتمل ہے، وفاق المدارس السلفیہ کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے ہے، رابطۃ المدارس العربیہ میں جماعت اسلامی سے فکری تعلق رکھنے والے مدارس شامل ہیں، جبکہ وفاق المدارس الشیعہ شیعہ مذہب کے دینی مدارس پر مشتمل ہے۔ ان میں مدارس کی تعداد کے لحاظ سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان سب سے بڑا وفاق ہے اور وفاقوں کے اتحاد میں سرگرم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے سربراہ جامعہ فاروقیہ کراچی کے سربراہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور سیکرٹری جنرل جامعہ خیر المدارس ملتان کے سربراہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری ہیں۔ ان وفاقوں میں جن نصابوں کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کی تفصیلات و جزئیات میں جا بجا فرق موجود ہے، لیکن جوہری حوالے سے ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں بلکہ مضامین کے

ساتھ ساتھ ان نصابوں کی اکثر کتابیں بھی مشترکہ ہیں اور اہداف کے حوالے سے بھی ان سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ معاشرے کے عام لوگوں کا تعلق قرآن و سنت اور دینی تعلیمات کے ساتھ قائم رہے اور دینی علوم کی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ ترویج ہو۔ البتہ تعبیر و تشریح میں مسلکی ترجیحات بہرحال غالب ہیں جو بسا اوقات زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہیں اور باہر سے دیکھنے والوں کو وہ فرقہ واریت ہی کی عملی شکل دکھائی دیتی ہیں۔

اس وقت وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا نصاب ہمارے سامنے ہے جو وفاق کے ترجمان سہ ماہی ''وفاق'' میں ۲۰۰۳ء کے دوران میں شائع ہوا ہے اور اس کی مرحلہ وار تفصیلات ہم قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

طلبا اور طالبات کے لیے وفاق المدارس کے نصاب الگ الگ ہیں اور طلبا کا نصاب مجموعی طور پر سترہ سال پر مشتمل ہے جسے درج ذیل درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلا درجہ پرائمری اور مڈل کے آٹھ سالوں پر مشتمل ہے اور اسے ابتدائیہ اور متوسطہ کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ ثانویہ عامہ کے نام سے میٹرک کے تین سالوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ تیسرا درجہ ثانویہ خاصہ کے عنوان سے ایف اے کے دو سالوں کو محیط ہے۔

۴۔ چوتھا درجہ عالیہ کے نام سے بی اے کے دو سالوں پر مشتمل ہے۔

۵۔ پانچواں درجہ عالمیہ کے عنوان سے ایم اے کے دو سالوں کو محیط ہے۔

① درجہ ابتدائیہ اور متوسطہ کے آٹھ سالوں کے نصاب میں شامل مضامین کی تفصیل یہ ہے:

- قرآن کریم نورانی قاعدہ سے لے کر مکمل ناظرہ قرآن کریم مع تجوید اور آخری پارہ حفظ۔ یہ نصاب مرحلہ وار آٹھ سالوں میں مکمل کرایا جاتا ہے۔
- ضروریاتِ دین میں کلمہ طیبہ و کلمہ شہادت یاد کرانے سے لے کر نماز حنفی، تعلیم الاسلام مکمل، سیرت خاتم الانبیاء اور بہشتی گوہر تک کے نصاب کو آٹھ سالوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔
- اردو میں جماعت اول سے جماعت ہشتم تک کا نصاب شامل کیا گیا ہے۔

- حساب اور ریاضی میں گنتی اور پہاڑوں سے لے کر آٹھویں جماعت تک کی ریاضی نصاب میں شامل ہے۔
- انگریزی اول جماعت سے آٹھویں جماعت تک شامل نصاب ہے۔
- معاشرتی علوم کو سال سوم سے سال ہشتم تک نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔
- سال پنجم میں سائنس شامل نصاب ہے، جبکہ اس کے بعد فارسی کے چند رسالے شامل نصاب ہیں۔
- اس سلسلے میں یہ لازم کیا گیا ہے کہ اردو، انگلش، سائنس، ریاضی اور معاشرتی علوم میں ساتویں سال تک پشاور بورڈ، لاہور بورڈ، کراچی بورڈ اور کوئٹہ بورڈ کا منظور کردہ نصاب پڑھایا جائے گا،
- جبکہ آٹھویں سال کے لیے ان مضامین کے حوالے سے وفاق نے اپنا نصاب خود مرتب کیا ہے۔

② میٹرک کو وفاق نے مڈل کے بعد تین سالوں تک وسیع کر دیا ہے جس میں سال اول کے دوران میں صرف سرکاری بورڈ کے نصاب کے مطابق انگلش، سائنس، ریاضی، اردو، اسلامیات، معاشرتی علوم، اور مطالعہ پاکستان کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور نہم دہم دونوں سالوں کا نصاب ایک سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو سالوں میں عربی صرف و نحو، عربی لغت، تجوید و قراءت، تفسیر و حدیث، فقہ اور منطق کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور انشا کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس درجے یعنی میٹرک کے امتحان کے لیے مدارس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ خود امتحان لیں یا کسی متعلقہ سرکاری بورڈ سے امتحان دلوادیں۔

③ ثانویہ خاصہ یعنی ایف اے کے دو سالوں میں تفسیر و حدیث، فقہ اور اصول فقہ، عربی نحو، سیرت و تاریخ، منطق، علم بلاغت اور ادب و انشا کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

④ عالیہ یعنی بی اے کے درجے میں دو سال کے دوران میں تفسیر و حدیث، فقہ و اصول فقہ، بلاغت، فلسفہ و عقائد، لغت عربیہ، تاریخ، فرائض یعنی وراثت کے احکام، فلکیات اور عروض و قوافی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

⑤ عالمیہ کا درجہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا آخری درجہ ہے جسے ایم اے کے مساوی سمجھا جاتا ہے اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بھی اسے ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے برابر تسلیم کیا ہوا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ کہ یہ صرف تعلیمی مقاصد کے لیے ہے۔ دوسرے مقاصد کے لیے اس سند کو تسلیم کرنے کے لیے اسکولوں اور کالجوں کے چند لازمی مضامین (مثلاً اردو، اسلامیات، مطالعہ پاکستان، انگلش وغیرہ) کا امتحان دینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

عالمیہ کے سال اول میں قرآن کریم کی عربی تفسیر بیضاوی شریف کا پہلا پارہ پڑھایا جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم کا ترجمہ اس سے قبل طالب علم مکمل کر چکا ہوتا ہے۔ اس سال کے نصاب میں دو اور مضامین کا اضافہ کر دیا گیا ہے: ایک معیشت کا جس میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت و تجارت“ سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے اور دوسرا مقارنۃ الادیان یعنی دوسرے معاصر مذاہب کا تعارف۔

جبکہ سال دوم میں حدیث نبوی کی نو بڑی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں: ۱۔ بخاری شریف، ۲۔ مسلم شریف، ۳۔ ترمذی شریف، ۴۔ ابوداؤد شریف، ۵۔ نسائی شریف، ۶۔ ابن ماجہ شریف، ۷۔ شمائل ترمذی، ۸۔ موطا امام مالک، اور ۹۔ طحاوی شریف۔

آخری سال درس نظامی کا سب سے اہم سال ہوتا ہے جس میں ہزاروں احادیث نبویہ طالب علم کی نظر سے گزرتی ہیں اور وہ عقائد و عبادات سے لے کر نکاح و طلاق، تجارت و معیشت، زراعت، خلافت، جہاد، معاملات و معاشرت، اخلاق و آداب، امارت و سیاست اور علامات قیامت سمیت سینکڑوں عنوانات و مضامین کے حوالے سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وارشادات کا علم حاصل کرتے ہیں اور یہی درس نظامی کا اصلی مقصد ہے، کیونکہ اس سے قبل مسلسل پندرہ سال تک جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ قرآن کریم اور سنت نبوی کے مفہوم تک رسائی کی استعداد پیدا کرنے کے لیے دی جاتی ہیں اور جب یہ استعداد ایک خاص درجے تک پہنچ جاتی ہے تو پھر طالب علم کو تفسیر قرآن کریم اور احادیث کے ذخیرے سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اگر حدیث نبوی کی ان نو کتابوں کے مضامین اور عنوانات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس قدر متنوع اور ہمہ گیر نصاب ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے اور پہلو کا احاطہ کرتا ہے اور قدیم و جدید کا کوئی مسئلہ

ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو ان احادیث کے ضمن میں طالب علم کے سامنے نہ آجاتا ہو، البتہ اس جامعیت اور تنوع کا احاطہ استاد اور شاگرد کے ذوق اور استعداد پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک اس کا ادراک رکھتے ہیں اور کس حد تک اس کا فہم حاصل کر پاتے ہیں۔

آخری سال کا نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ دورۂ حدیث کے سال طالب علم کو پورا سال سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی، مگر اس کے باوجود راقم الحروف نے گزشتہ دو سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں، جہاں دورہ حدیث کے منتہی اسباق میرے ذمے ہوتے ہیں، ایک اور اہم مضمون کا اضافہ کر رکھا ہے جس میں طلبہ کو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے حوالے سے اسلام اور مغرب کی تعلیمات کا فرق سمجھایا جاتا ہے، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کا تاریخی اور معاشرتی پس منظر بتایا جاتا ہے، اس کی ایک ایک دفعہ پر قرآن و سنت کی روشنی میں تبصرہ کیا جاتا ہے اور انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور اسلامی احکام و قوانین سے جہاں جہاں متصادم ہے، اس کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

یہ ہے ان مضامین اور تعلیمی مواد کا ایک ہلکا سا خاکہ جو سترہ سال کے دوران میں دینی مدارس کے طلبا کو پڑھایا جاتا ہے اور جسے مرحلہ وار پڑھ کر شہادۃ العالمیہ کے عنوان سے وہ اس ڈگری کے مستحق قرار پاتے ہیں جو آج کل قومی حلقوں میں متنازعہ حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۵ر ستمبر ۲۰۰۵ء)

پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی

لندن کے بم دھماکوں کے بعد عالمی حلقوں میں جو ارتعاش پیدا ہوا ہے، اس نے ایک بار پھر دینی مدارس کو بین الاقوامی میڈیا میں گفتگو کا موضوع بنا دیا ہے اور نہ صرف پاکستان میں متعدّد دینی مدارس پر چھاپوں کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا ہے بلکہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے ایجنڈے میں بھی دینی مدارس اب پہلے نمبر پر نظر آ رہے ہیں۔

لندن کے بم دھماکوں کی دنیا کے ہر باشعور شخص نے مذمت کی ہے کہ اس طرح کسی ملک کے پر امن شہریوں کی جانوں سے کھیلنے کا بہر حال کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی جو خودکش حملوں کو آزادی اور قومی وقار کی جنگ لڑنے والے مجاہدین کے لیے میدان جنگ کا آخری ہتھیار سمجھتے ہیں اور استعماری قوتوں کے خلاف بر سر پیکار حریت پسندوں کے لیے بوقت ضرورت اس ہتھیار کے استعمال کو ان کا جائز اور ناگزیر حق تصور کرتے ہیں، ان کے لیے بھی اس قسم کے اقدامات کی حمایت ممکن نہیں ہے، لیکن ان دھماکوں کے بعد جن امور پر بحث و مباحثہ کا عالمی سطح پر از سر نو آغاز ہو گیا ہے، ان میں پاکستان کے دینی مدارس کے کردار اور افادیت کا مسئلہ خصوصی اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔

دھماکوں کے فوراً بعد برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے جس رد عمل کا اظہار کیا تھا، اس میں دنیا کے انصاف پسند حلقوں کے لیے یہ حوصلہ افزا پہلو موجود تھا کہ انھوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مبینہ دہشت گردی کے اسباب کا جائزہ لینے اور ان کے سدِ باب کی ضرورت پر زور دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ صرف سیکیورٹی کے انتظامات ہی دہشت گردی کا حل نہیں ہیں بلکہ یہ دہشت گردی جن اسباب و عوامل کے نتیجے میں رونما ہوئی ہے، ان کے خاتمے کے لیے بھی اقدامات ضروری ہیں اور اس کے بغیر دہشت گردی پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ مسٹر ٹونی بلیئر کے اس حقیقت پسندانہ طرز عمل پر دنیا کے منصف مزاج لوگوں کو یہ توقع ہونے لگی تھی کہ اب شاید بعض مسلمان حلقوں کی اس مسلح مزاحمتی جدوجہد، جسے دہشت گردی قرار دے کر اس کے خلاف امریکا کی قیادت میں جنگ لڑی جا رہی ہے،

کے اسباب و محرکات کی نشاندہی اور ان کے سدِباب کے لیے اقدامات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے لیکن اس کے چند روز بعد برطانوی وزیر اعظم نے حکمران لیبر پارٹی کی پالیسی کانفرنس میں جو تفصیلی خطاب کیا ہے، اس نے اس توقع کا گلا گھونٹ دیا ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ ٹونی بلیئر امریکی صدر جارج بش سے بھی زیادہ جارحانہ لہجے میں بات کہنے پر اتر آئے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے اس خطاب میں مختلف مسلم ممالک کی مزاحمتی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ وہ ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور وہ اس مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ہر قیمت پر جیتنا چاہتے ہیں۔

مسٹر بلیئر نے اس خطاب میں ایک طرف تہذیبوں کے درمیان تصادم کی نفی کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف یہ جنگ دراصل ان کے نظریات کے خلاف جنگ ہے اور وہ اس کے ذریعے سے اپنے طرز زندگی کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ دہشت گرد اسرائیل کو ختم کرنا چاہتے ہیں، عالم اسلام میں خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور مسلم ممالک میں شرعی قوانین نافذ کرنا چاہتے ہیں جبکہ یہ امور مسٹر ٹونی بلیئر کے نزدیک اس قدر سنگین جرائم ہیں کہ انہوں نے اسے "بدی کا نظریہ" قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں گفتگو اور مذاکرات کا امکان بھی مسترد کر دیا ہے۔

برطانوی وزیر اعظم نے اس "بدی کے نظریہ" کا سرچشمہ پاکستان کے دینی مدارس کو قرار دیا ہے اور ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ ان مدارس کے خلاف کارروائی کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف لندن کے دھماکوں کے سلسلے میں جن افراد کو خودکش حملوں کا مرتکب قرار دیا گیا ہے، ان کا پاکستان کے بعض دینی مدارس کے ساتھ تعلق ظاہر کرتے ہوئے ان کے خلاف کریک ڈاؤن کی تیاری ہو رہی ہے اور ان سطور کی اشاعت تک اس سلسلے میں خاصی پیشرفت ہو چکی ہوگی۔

جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے، یہ بات ایک سے زائد بار واضح ہو چکی ہے کہ ان پر طلبہ کو دہشت گردی کی تربیت دینے کا الزام قطعی طور پر غلط ہے اور اب تک جتنے چھاپے بھی مختلف مدارس کے خلاف مارے گئے ہیں، کسی ایک مدرسہ میں بھی ایسے آلات یا ماحول نہیں پایا گیا جسے دہشت گردی کی تربیت کے الزام کے لیے بنیاد بنایا جا سکے۔ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ اور سابق وزیر داخلہ

چودھری شجاعت حسین ابھی چند ہفتے قبل ایک بھرپور کنونشن میں یہ بات کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے دور وزارت میں پورے ملک کے دینی مدارس کی چھان بین کرائی تھی اور ملک بھر میں ایک مدرسہ بھی دہشت گردی کی تربیت میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک میں دینی مدارس کے سب سے بڑے فورم وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت کئی بار کھلا کھلم کہہ چکی ہے کہ ملک کے کسی ایک مدرسے کی نشاندہی کی جائے جس میں دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہو۔ اگر کوئی مدرسہ ایسا پایا گیا تو وفاق المدارس اس کے خلاف کارروائی میں حکومت کے ساتھ شریک ہوگا مگر اس کے باوجود ان دینی مدارس کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری ہے اور نہ صرف عالمی میڈیا بلکہ برطانوی وزیر اعظم بھی دینی مدارس کی کردارکشی کی اس مہم میں شریک ہیں۔

کہا جا رہا ہے کہ لندن میں جن افراد نے خودکش حملے کیے ہیں، انہوں نے کسی دور میں بعض دینی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ اگر یہ بات درست بھی ہو تو کسی درس گاہ میں تعلیم پانے والے کسی شخص کے کسی جرم کا اس درس گاہ کو ذمہ دار ٹھہرانا کس طرح قرین انصاف قرار پا سکتا ہے؟ کیونکہ اگر اسے ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو دنیا بھر میں سنگین ترین جرائم کے مرتکب افراد کے جرائم کی ذمہ داری ان تعلیمی اداروں پر ڈالی جانی چاہیے جن میں انہوں نے کبھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس طرح ہارورڈ، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں بھی اس الزام کا سامنا کرنے پر مجبور ہوں گی کہ ان کے ہاں تعلیم پانے والے بہت سے افراد مختلف ممالک میں بدعنوانیوں، کرپشن، آمریت، ڈکٹیٹر شپ، قتل و غارت، ڈکیتی اور دیگر سنگین جرائم میں ملوث ہیں، اس لیے وہ ان جرائم کے بدی کے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مدارس میں تو اسلحہ کی ٹریننگ نہیں دی جاتی اور ملک میں کسی ایک مدرسہ کی اب تک نشان دہی نہیں کی جا سکی جو اپنے طلبہ کو جدید اسلحہ کی اس انداز سے ٹریننگ دیتا ہو جبکہ ملک کی جیلوں اور عدالتوں کا ریکارڈ چھان کر ایسے سینکڑوں افراد کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جنہوں نے پاک فوج کی تربیت گاہوں میں اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کی اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد یا فوج سے بھگوڑے ہو کر جرائم پیشہ بن گئے۔ ظاہر بات ہے کہ صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے ٹریننگ پاک فوج کے انتظام کے تحت حاصل کی تھی، ان کے جرائم کی ذمہ داری پاک فوج پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

دینی مدارس کو اگر اس ''جرم'' کا قصوروار ٹھہرایا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اسلامی

عقیدے کی تعلیم دیتے ہیں، خلافت کا سبق پڑھاتے ہیں، شرعی قوانین کی تعلیم دیتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں قرآن و سنت کے احکام و قوانین سکھاتے ہیں، کیونکہ ان دینی مدارس کے وجود کا مقصد ہی یہ ہے اور وہ اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر مسٹر ٹونی بلیئر کے نزدیک یہ ''جرم'' ہے تو اس جرم کے ارتکاب سے یہ دینی مدارس کسی طرح باز نہیں آسکتے مگر انہیں دہشت گردی کی تربیت کے مراکز قرار دے کر انتقام کا نشانہ بنانا کسی طرح بھی حقیقت پسندانہ طرز عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(روزنامہ اسلام، ۲۲/ جولائی ۲۰۰۵ء)

دینی مدارس کے حوالے سے چار اہم خبریں

دینی مدارس کے حوالے سے اس ہفتے کے دوران کی چار اہم خبریں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ پہلی خبر یہ ہے کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے اسلام آباد میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''دینی مدارس'' پر چھاپوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور دہشت گردوں کی تلاش میں اب شہروں میں بھی دینی مدارس پر چھاپے مارے جائیں گے''۔ دوسری خبر یہ ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے دینی مدارس کی اسناد کے بارے میں تفصیلی فیصلہ جاری کر دیا ہے جس میں یہ بات واضح طور پر کہہ دی گئی ہے کہ چونکہ دینی مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے صرف تعلیمی مقاصد کے لیے کالج اور یونیورسٹی کی اسناد کے برابر قرار دیا ہے، اس لیے تعلیمی مقاصد سے ہٹ کر کسی اور شعبہ بالخصوص انتخابات کے لیے ان اسناد کو کارآمد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تیسری خبر یہ ہے کہ تنظیم المدارس نے اسلام آباد کے کنونشن سینٹر میں منعقدہ دینی مدارس کے عالمی کنونشن میں دینی مدارس کے تحفظ کے عزم کا اعادہ کیا ہے اور اس سلسلے میں حکومتی دباؤ کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے، جبکہ چوتھی خبر ''آن لائن'' کے حوالے سے ایک قومی اخبار نے یہ نشر کی ہے کہ ملائشیا سے تعلق رکھنے والے دو سو طلبہ جو پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اب وہ پاکستانی حکومت کے فیصلے کے مطابق وطن واپس جا رہے ہیں، ملائیشیا کی حکومت نے اپنے ملک کی یونیورسٹیوں میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ چاروں خبریں ایک ہفتے بلکہ دو تین روز کے دوران کی ہیں اور ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس اس وقت کس سطح پر قومی اور عالمی حلقوں میں گفتگو اور بحث و مباحثہ کا موضوع بنے ہوئے ہیں اور اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت کو کس درجے کے تدبر، حوصلہ اور فہم و فراست سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک صدر پرویز مشرف کے اس اعلان کا تعلق ہے کہ دہشت گردوں کی تلاش میں دینی

مدارس پر چھاپوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور اب شہروں میں بھی دینی مدارس پر چھاپے مارے جائیں گے، ہمارے نزدیک یہ بات خود صدر پرویز مشرف کی حکومت کے ذمہ دار افراد کے ان اعلانات کی نفی کے مترادف ہے کہ دینی مدارس میں دہشت گردی کی ٹریننگ نہیں دی جاتی اور اس سلسلے میں اب تک کی تمام تحقیقات میں دینی مدارس پر لگائے گئے اس الزام کی نفی ہوتی ہے۔

سابق وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اور موجودہ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے اسلام آباد میں ہزاروں علماء کرام کے کنونشن میں کھلے بندوں اعلان کیا تھا کہ انہوں نے اپنے دور حکومت میں دینی مدارس کے حوالے سے ملک گیر سطح پر تحقیقات کرائی تھیں اور کوئی مدرسہ دہشت گردی میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔ وفاقی وزیر مذہبی امور اعجاز الحق نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی دینی مدرسہ دہشت گردی کی ٹریننگ میں ملوث پایا گیا تو وہ اپنے منصب سے مستعفی ہو جائیں گے۔ سندھ کے گورنر عشرت العباد کا یہ بیان قومی پریس کے ریکارڈ میں موجود ہے کہ صوبہ سندھ میں اب تک دہشت گردی کے الزام میں جتنے لوگ پکڑے گئے ہیں، ان میں ستر فیصد وہ ہیں جنہوں نے دینی مدرسہ دیکھا تک نہیں۔ موجودہ وفاقی وزیر تعلیم جاوید اشرف قاضی متعدّد بار اعلان کر چکے ہیں کہ پاکستان کے دینی مدارس میں دہشت گردی کی ٹریننگ کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اس سب کچھ کے باوجود صدر پرویز مشرف کے نزدیک دینی مدارس ہی دہشت گردی کے مراکز ہیں اور وہ دہشت گردوں کی تلاش میں دینی مدارس پر چھاپے مارنا چاہتے ہیں تو یہ بات دینی مدارس کے قائدین کے لیے تو یقیناً قابلِ غور ہے ہی مگر ان سے کہیں زیادہ مذکورہ بالا حضرات کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ صدر پرویز مشرف کے اس اعلان کے بعد ان حضرات کے مذکورہ بیانات کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے اور جس عالمی برادری کو مطمئن کرنے کے لیے وہ دینی مدارس کی صفائی پیش کر رہے ہیں، اس برادری کے نزدیک صدر پرویز مشرف کے اپنے بیان کے سامنے ان کی اس صفائی کا کیا وزن ہے؟

جہاں تک دینی مدارس میں دہشت گردی کی ٹریننگ یا دہشت گردوں کی موجودگی کا تعلق ہے، اس سلسلے میں دینی مدارس کے تمام وفاقوں کے اس واضح موقف کے بعد اس الزام کو دہرانے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز باقی نہیں رہ جاتا کہ جن مدارس میں بعض حکومتی حلقوں کے نزدیک دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے، ان کی نشان دہی کی جائے۔ ان کے خلاف کارروائی میں دینی مدارس کی

قیادت حکومت کے ساتھ ہوگی، مگر کسی ثبوت اور نشاندہی کے بغیر مدارس پر چھاپے مارنے کا سلسلہ درست نہیں کیونکہ یہ دینی مدارس کے تعلیمی سلسلے میں رکاوٹ ڈالنے اور انہیں ہراساں کرنے کے مترادف ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے بارے میں ہم اس کالم میں اس سے قبل اظہار کر چکے ہیں کہ اس کیس میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے سامنے حقائق نہیں لائے گئے، خصوصاً دینی مدارس کے وفاقوں نے اپنے نصاب میں تبدیلی اور میٹرک کی سطح تک عصری مضامین کو شامل کرنے کے بارے میں جو فیصلے کیے ہیں اور ان پر عملدرآمد بھی ہو رہا ہے، اس لیے عدالت عظمیٰ سے اسی فیصلے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں وفاقوں کی قیادت اس سلسلے میں صرف عوامی دباؤ اور سیاسی جدوجہد پر انحصار کیے ہوئے ہے اور عدالت عظمیٰ میں سنجیدگی کے ساتھ اس کیس کی پیروی کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی، ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ ہم سیاسی دباؤ اور عوامی ردعمل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کو منظم طریقے سے آگے بڑھانے کے حق میں ہیں لیکن عدالت میں کیس کو سنجیدگی کے ساتھ نہ لڑنے اور اسے صحیح توجہ نہ دینے کے طرز عمل کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ ابھی عدالت عظمیٰ کے حتمی فیصلے تک ایک مرحلہ باقی ہے جس کا وہ حوالہ اس تفصیلی فیصلے میں بھی موجود ہے۔ ہماری رائے میں وفاقوں کی قیادت کو اس مقدمہ میں فریق بننا چاہیے، پوری توجہ کے ساتھ یہ کیس لڑنا چاہیے اور اس سلسلے میں تمام حقائق عدالت عظمیٰ کے فورم پر قوم کے سامنے لانے چاہئیں۔ اگر خدانخواستہ عدالت عظمیٰ کا حتمی فیصلہ مدارس کے خلاف بھی ہوا تو کم از کم حقائق اور اصل صورت حال تو عوام کے سامنے ہوگی اور عدالت عظمیٰ میں مقدمہ خدانخواستہ ہار جانے کی صورت میں بھی دینی مدارس کی قیادت عوامی محاذ پر سرخرو رہے گی۔

تنظیم المدارس کے عالمی کنونشن میں جس جرات اور حوصلہ کے ساتھ دینی مدارس کے بارے میں وفاقوں کے اجتماعی موقف کا اعادہ کیا گیا ہے، وہ انتہائی خوش آئند ہے اور بالخصوص مولانا مفتی منیب الرحمٰن نے دینی مدارس کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے جس پر وہ مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس سے قبل وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے اسی کنونشن سینٹر میں دینی مدارس کے موقف اور پالیسی کے قومی سطح پر اظہار کا اہتمام کیا تھا جس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب تنظیم المدارس کے

کنونشن سے بات مزید آگے بڑھی ہے اور نہ صرف پاکستان کے عوام کے سامنے بلکہ عالمی سطح پر بھی دینی مدارس کی صحیح پوزیشن کی وضاحت میں اس سے مدد ملی ہے۔ اگر دیگر وفاق بھی اس طرح کے اجتماعات کا اہتمام کریں تو اس سے نہ صرف مدارس کی باہمی ہم آہنگی میں اضافہ ہوگا بلکہ دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کی جدوجہد بھی مزید مضبوط ہوگی۔

پاکستان کے دینی مدارس سے نکالے گئے ملائشین طلبہ کو ملائشیا کے تعلیمی اداروں میں داخلہ دینے پر پابندی کی خبر بھی اس لحاظ سے توجہ طلب ہے کہ اس سے نہ صرف دو سو طلبہ کا تعلیمی مستقبل تاریک ہو جائے گا بلکہ دینی تعلیم کے حصول کے رجحانات کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی جو شاید ایسا کرنے والوں کا اصل مقصد ہے، مگر عالمی سطح پر دینی مدارس کا مقدمہ لڑنے کے لیے سرے سے کوئی فورم ہی موجود نہیں ہے تو ان غریب طلبہ کے تعلیمی مستقبل کے تحفظ کی فکر آخر کیسے ہوگی؟

(روزنامہ اسلام، ۲/ستمبر ۲۰۰۵ء)

پرویز حکومت اور دینی مدارس

صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ روز اسلام آباد میں علماء کرام کے دو گروپوں سے ملاقات کے دوران میں اس امر کی یقین دہائی کرائی ہے کہ حکومت دینی مدارس میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور نہ ہی انہیں بند کیا جا رہا ہے، البتہ ہم دینی مدارس کو جدید ترین نظام تعلیم کے دھارے میں شامل کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے موجودہ نصاب میں تبدیلی کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہ غلط فہمی ہے کہ حکومت دینی مدارس کے خلاف ایکشن لے رہی ہے۔ ایسی کوئی تجویز زیر غور نہیں بلکہ حکومت کی کوشش اور خواہش ہے کہ لاکھوں طلبہ جو دینی مدارس میں زیر تعلیم ہیں، ان کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے علوم سے بھی روشناس کرایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ملک سے فرقہ واریت ختم کرنے کے لیے مرکزی، صوبائی اور ضلعی سطح پر علماء کے بورڈ تشکیل دیے جائیں گے جن میں تمام مکاتب فکر کے نمائندوں کو شریک کیا جائے گا۔

صدر جنرل پرویز مشرف کی یہ یقین دہانی ملک کی اس عمومی فضا میں ایک اچھی خبر ہے کہ ایک طرف ملک بھر میں پولیس تھانوں کے ذریعے سے مساجد و مدارس کے کوائف جمع کرنے کے لیے فارم تقسیم کیے جا رہے ہیں اور بعض مقامات پر انہیں فوری طور پر کر کے واپس کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور دوسری طرف دینی مدارس کے خلاف وفاقی وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کے تند و تیز بیانات کا سلسلہ بھی جاری ہے اور وہ دینی جماعتوں اور دینی مدارس کے خلاف بات کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہے۔

گزشتہ دنوں گوجرانوالہ کے بعض علاقوں میں پولیس تھانوں کے ذریعہ ایک پروفارما تقسیم کیا گیا جس میں مسجد کا سن تعمیر، ذرائع آمدنی، انتظامیہ، اخراجات، اس سے ملحقہ دینی مدرسہ کے کمروں کی تعداد، عملہ، مسلک اور دیگر امور کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔ بعض مساجد کے منتظمین نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ دینی مدارس کے تمام بڑے وفاقوں کا ۶/ جنوری ۲۰۰۲ء کو جامعہ نعیمیہ

لاہور میں مشترکہ کنونشن ہو رہا ہے، اس کے فیصلوں کا انتظار کر لیا جائے اور پولیس اہل کاروں سے کہا جائے کہ وہ ۶/ جنوری کے کنونشن کے فیصلوں کی روشنی میں پروفارما پر کریں گے مگر ان دوستوں نے جب پولیس اہل کاروں سے یہ بات کہی تو انہیں کہا گیا کہ ہمیں فوری طور پر اس کا جواب چاہیے، اس لیے ۲۴ گھنٹے کے اندر جوابات تھانے پہنچائے جائیں۔

۲۷/ دسمبر کو لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی یہی صورت حال ہے بلکہ ایک پولیس اہل کار کو اتنی جلدی تھی کہ اس نے مسجد و مدرسہ کے کسی ذمہ دار شخص تک پہنچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مسجد میں جو صاحب موجود ملے، انہی سے دو چار سوال کیے اور خود ہی پروفارما پر کر کے واپس چلتا بنا۔ جامعہ حنفیہ قادریہ چوک یادگار شہیداں لاہور کے استاذ مولانا حافظ ذکاء الرحمٰن اختر نے بتایا کہ ایک پولیس اہل کار کسی مدرسہ میں گیا اور وہاں موجود ایک صاحب سے مدرسہ و مسجد کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ان صاحب نے کہا کہ باہر مین گیٹ پر جو بورڈ نصب ہے، اس میں بہت کچھ لکھا ہے تو اس پولیس اہل کار نے بورڈ ہی سے معلومات پروفارما پر نقل کرنا شروع کر دیں۔ وزیر داخلہ کے مسلسل بیانات اور اس کے بعد پولیس تھانوں کی اس کارگزاری کے پس منظر میں اگر پاکستان کے دینی مدارس کے بارے میں بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں اور امریکہ بہادر کے مطالبات کو سامنے رکھا جائے اور اس پس منظر پر بھی ایک بار پھر نظر ڈال لی جائے جو ہماری قومی پالیسیوں میں امریکی مداخلت اور امریکی تقاضوں اور مطالبات کے سامنے ہمارے لیڈروں کے مسلسل سرنڈر کرتے چلے جانے سے ہر شخص کو واضح طور پر دکھائی دینے لگا ہے تو دینی مدارس کی اس تشویش کو محض ''غلط فہمی'' قرار دینے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی کہ حکومت دینی مدارس کے نظام پر سرکاری کنٹرول کی کوئی صورت پیدا کرنا چاہتی ہے اور ان کے معاملات میں مداخلت کے راستے تلاش کر رہی ہے۔

پھر صدر پرویز مشرف نے علماء کرام کے دو گروپوں سے بات چیت کرتے ہوئے دینی مدارس میں مداخلت کے پروگرام کی نفی کرتے ہوئے دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور انہیں اجتماعی دھارے میں لانے کی جس حکومتی خواہش اور کوشش کا ذکر کیا ہے، وہ بجائے خود دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کے ارادے کی غمازی کرتی ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں دینی مدارس کے موجودہ نظام اور ان کے

معاشرتی کردار کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم ان سطور میں متعدّد بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں عام مسلمان کا دین سے اعتقادی و عملی تعلق قائم رکھنے، قرآن و سنت اور دیگر دینی علوم کی تعلیم و تدریس کے تسلسل کو باقی رکھنے اور مساجد و مکاتب کو آباد رکھنے میں دینی مدارس کے جس کردار کو بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے اور اسی کو مغربی قوتیں اور ادارے اپنی تہذیب و ثقافت اور فکر و نظریہ کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں، اس کردار کی بنیادی وجہ دینی مدارس کا آزادانہ نظام اور ان کا تشخص و امتیاز ہے۔ اگر یہ مدارس اس امتیازی کردار، تعلیمی تشخص اور انتظامی و مالیاتی خود مختاری سے بہرہ ور نہ ہوتے تو آج جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں دینداروں اور دینی عقائد و اعمال کے ساتھ عام مسلمان کی جذباتی وابستگی کی فضا موجود نہ ہوتی اور آج بھی اگر ان دینی مدارس کو امتیازی تشخص و کردار سے محروم کر کے اجتماعی دھارے میں شامل کر دیا جائے تو دینی بیداری کے اس ماحول کو ختم کرنے کے لیے مزید کسی اقدام کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی اور وہ بتدریج مغربی فلسفہ و ثقافت سے متاثر اور مرغوب اجتماعی ماحول میں تحلیل ہوتا چلا جائے گا، اس لیے اگر دینی مدارس کو اپنا وہ کردار باقی رکھنا ہے جو گزشتہ ڈیڑھ صدی سے وہ ادا کرتے آ رہے ہیں تو اس کے لیے ان کے جداگانہ تشخص کی بقا اور اجتماعی دھارے سے ان کا فاصلہ قائم رکھنا ضروری ہے۔

جہاں تک دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کا تعلق ہے، اس کے بھی دو مختلف پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو وہی ہے جس کا تعلق ان کی اجتماعی دھارے میں شمولیت سے ہے کہ دینی مدارس کے کسی فاضل کو محض ایک مولوی، حافظ، قاری یا مفتی و معلم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے اس کے ساتھ انجینئر، ڈاکٹر، وکیل یا سائنس دان بھی ہونا چاہیے اور اس نقطہ نظر کی بنیاد پر دینی مدارس کے نصاب میں ردوبدل کیا جانا چاہیے۔ یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔ دینی تعلیم و تربیت، تحقیق اور ریسرچ اور عام مسلمانوں کی دینی راہ نمائی ایک مستقل دینی کام اور معاشرتی ضرورت ہے اور اس کے لیے مستقل افراد کار ضروری ہیں جن کا کسی دوسرے فن میں ماہر ہونا قطعی ضروری نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے عام لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ایک مستقل معاشرتی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جج صاحبان کا ایک مستقل طبقہ ضروری ہے جو تعلیم و تربیت کے حوالہ سے جداگانہ تشخص رکھتا ہو، چنانچہ

ایک جج کے لیے صرف قانون اور انصاف سے متعلقہ علوم کا حاصل کرنا ہی ضروری سمجھا جاتا ہے اور کسی جج کے لیے ڈاکٹر، سائنس دان یا انجینئر ہونا ضروری قرار نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح کسی مفتی، دینی معلم اور حافظ و قاری کے لیے بھی دیگر شعبوں کے علوم کا حاصل کرنا لازمی نہیں ہے۔ اس لیے جب کوئی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ علماء کرام کو جدید سائنسی علوم سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیے اور روزگار کا کوئی اور ذریعہ تلاش کر کے دینی کام رضاکارانہ طور پر ثانوی حیثیت سے کرنا چاہیے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے جج صاحبان سے کہا جا رہا ہے کہ وہ انصاف اور قانون کے علم کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی علوم بھی حاصل کریں اور انصاف پر تنخواہ وصول کرنے کے بجائے روزگار کا کوئی اور ذریعہ اختیار کریں اور لوگوں کو انصاف مہیا کرنے کا کام رضاکارانہ طور پر ثانوی حیثیت سے سرانجام دیا کریں۔ اس لیے دینی مدارس کے نصاب میں اس قسم کی کسی تبدیلی کی حمایت تو ہرگز نہیں کی جا سکتی البتہ کمپیوٹر، عالمی زبانوں، تاریخ اور عالمی حالات سے واقفیت جیسے ضروری علوم کو خود ہم بھی دینی مدارس کے نصاب میں شامل کرنے کے حق میں ہیں اور اس کے لیے مسلسل آواز اٹھا رہے ہیں۔ صدر پرویز مشرف بھی اگر یہی چاہتے ہیں تو سر آنکھوں پر! ہم ان کے ارشادات کی حمایت کرتے ہیں لیکن دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کی قیمت پر نہیں!

(روزنامہ اوصاف، ۲ جنوری ۲۰۰۲ء)

دینی مدارس اور حکومتی اقدامات

دینی مدارس کے تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے پانچوں وفاقوں نے ان حکومتی اقدامات کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے جن کی منظوری وفاقی کابینہ نے دی ہے اور جن کے تحت دینی مدارس کو چھ ماہ کے اندر رجسٹریشن کا پابند کرتے ہوئے سرکاری سطح پر مدرسہ تعلیمی بورڈ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ رجسٹریشن نہ کرانے والے مدارس کو بند کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے دینی مدارس کو بیرون ملک سے ملنے والی امداد کو مدرسہ تعلیمی بورڈ کی کلیئرنس کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دینی مدارس کے نصاب میں انگلش، ریاضی اور سائنس کے مضامین کے اضافے کو لازمی قرار دینے کے علاوہ دہشت گردی اور فرقہ واریت میں ملوث دینی مدارس کے ناظم صاحبان کو دو سال قید کی سزا اور جرمانہ کے قانون کے نفاذ کا عندیہ دیا گیا ہے۔

اگرچہ وفاقی وزیر مذہبی امور ڈاکٹر محمود احمد غازی نے وضاحت کی ہے کہ ابھی مدارس کے بارے میں آرڈیننس کی حتمی شکل طے نہیں ہوئی، مگر وفاقی کابینہ کے اجلاس کے بعد وزیر اطلاعات جناب نثار اے میمن کی پریس بریفنگ میں مذکورہ بالا امور کے سامنے آجانے کے بعد آرڈیننس کے بنیادی مشمولات کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا اور حکومت ایک عرصہ سے دینی مدارس کے بارے میں جن عزائم اور اقدامات کا اظہار کرتی آرہی ہے، اس کی عملی شکل کا بنیادی ڈھانچہ واضح ہو گیا ہے۔

وزیر مذہبی امور نے اپنی پریس کانفرنس میں دینی مدارس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لیے حکومت کی طرف سے تیرہ ارب روپے کی امداد کی خوشخبری بھی دی ہے جو تین سال میں مدارس کو دی جائے گی، لیکن اس کے باوجود نہ صرف دینی مدارس نے متفقہ طور پر ان اقدامات کو مسترد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بلکہ لاہور ہائی کورٹ بار نے ایک قرارداد میں دینی مدارس کے خلاف ان حکومتی اقدامات کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی طرف سے حکومتی اقدامات کو یکسر مسترد کرنے کے مضمرات اور پس منظر کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جانا

چاہیے۔ اس سلسلہ میں تین باتوں کا بطور خاص جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ایک یہ کہ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں رفتار زمانہ کے ساتھ جس قسم کی اصلاحات ناگزیر ہیں، ان کی ضرورت سے کسی ذی شعور کو انکار نہیں ہے اور ہم خود ایک عرصہ سے دینی مدارس کے منتظمین کو اس طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ ہماری رائے میں دینی مدارس کے نصاب میں نہ صرف انگلش زبان کے اضافے کی ضرورت ہے، بلکہ عربی بول چال، تحریر و تقریر اور اس کے ساتھ ساتھ تقابلِ ادیان و مذاہب، تاریخ، پبلک ریلیشننگ اور کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ جیسے اہم مضامین کے اضافہ کو بھی ہم وقت کا تقاضا سمجھتے ہیں، لیکن یہ تبدیلی اور اضافہ حکومتی اقدامات، اسٹیبلشمنٹ کی ترجیحات اور امریکہ کے مطالبات کے دائرہ میں نہیں، بلکہ خود دینی حلقوں کی داخلی ضروریات اور ملی و معاشرتی تقاضوں کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح جیسے ہم دینی مدارس کے نصاب میں ان مضامین کے اضافوں کو ناگزیر سمجھتے ہیں، بالکل اسی درجہ میں دینی مدارس کے نصاب میں سائنس اور ریاضی کے اضافہ کو قطعی طور پر غلط اور نامعقول تصور کرتے ہیں اور دینی تعلیم کے ساتھ ریاضی اور سائنس کی تعلیم کو لازمی قرار دینا اسی طرح غیر معقول حرکت ہے جیسے لا کالج کے نصاب میں سائنس اور ریاضی کو لازمی مضامین کا درجہ دے دیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ اگر حکومت اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتی ہے تو اس کی حیثیت ایک خیر خواہ مشیر اور رہنما کی ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ حکومت کوئی رول ادا کرنا چاہے گی تو اسے دینی مدارس کے داخلی معاملات میں مداخلت اور ان کی خود مختاری پر حملہ تصور کیا جائے گا جسے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ دینی مدارس کا موجودہ کردار جس کے مفید پہلوؤں کا خود جنرل پرویز مشرف کئی بار اعتراف کر چکے ہیں اور دینی مدارس کے جس دینی و معاشرتی کردار کا تذکرہ وفاقی وزیر مذہبی امور وفاقی وزیر داخلہ اور گورنر پنجاب کے بیانات میں مسلسل ملتا ہے، اس کردار کی گاڑی مالیاتی و انتظامی خود مختاری اور تعلیمی نصاب و نظام کی آزادی کے دو پہیوں پر چلتی آ رہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک پہیے کی ہوا نکال دی گئی تو دینی مدارس کے اس ملی کردار کا وجود باقی نہیں رہے گا جس کا اعتراف ہمارے حکمران بار بار کر رہے ہیں اور جس ملی کردار سے خائف ہو کر عالمی استعماری قوتیں اور بین الاقوامی ادارے ان دینی مدارس کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی

کر رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حکومت جس فضا اور حالات میں دینی مدارس کے گرد پابندیوں کا حصار قائم کرنے اور تیرہ ارب کی امداد کا لالچ دے کر انہیں اس دائرہ میں گرنے کی ترغیب دے رہی ہے، اس فضا میں تو کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے اور ایسے حالات میں حکومت دینی مدارس کے بارے میں جو بھی عملی قدم اٹھائے گی، اس سے حکومتی اور دینی حلقوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے امریکہ کی زیر قیادت عالمی اتحاد کے ساتھ مل کر دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ طالبان حکومت دینی مدارس کی ڈیڑھ صدی کی کمائی تھی اور دینی مدارس افغانستان میں خالصتاً نظریہ اور دینی بنیادوں پر قائم طالبان حکومت کو دیکھ کر مطمئن تھے کہ ان کی ڈیڑھ صدی کی محنت رنگ لے آئی ہے اور اسلام کی جن تعلیمات کو انہوں نے گزشتہ دو سو برس سے محنت، قناعت، فاقہ کشی اور قربانیوں کے ساتھ زمانے کی دستبرد سے بچا کر رکھا ہوا تھا، وہ نہ صرف محفوظ ہے، بلکہ عملی اور اجتماعی زندگی میں ان کی عمل داری کے امکانات بھی نظر آنے لگے ہیں، لیکن امریکی اتحاد نے حکومت کے تعاون سے طاقت کے بل پر اس حکومت کا خاتمہ ہی نہیں کیا، بلکہ اس کے علمی اور فکری سرچشمہ دینی مدارس کے خلاف وسیع تر انتقامی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا ہے جن کا سلسلہ افغانستان سے آگے بڑھتا ہوا پاکستان کے مختلف شہروں تک پھیلتا جا رہا ہے۔ دینی مدارس پر چھاپے مارے جا رہے ہیں، علماء اور کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں آ رہی ہیں، خوف و ہراس کی فضا قائم کی جا رہی ہے اور دینی مدارس کے ساتھ تعاون کرنے والے اصحاب خیر کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ امریکی کمانڈوز کی رہنمائی میں پاکستانی فورسز اس وقت پاکستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس کے خلاف جو کارروائیاں کر رہی ہیں اور جس طرح دینی حلقوں کو خوف زدہ اور ہراساں کیا جا رہا ہے، اس فضا میں دینی مدارس کے لیے تیرہ ارب روپے کی امداد اور ان کی اصلاح و ترقی کے سرکاری اقدامات کو ایک سنگین مذاق اور زخموں پر نمک چھڑکنے کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔

موجودہ حکومت اگر دینی مدارس کے نظام و نصاب کی اصلاح میں مخلص ہے اور خلوص دل کے ساتھ ان کی امداد کرنا چاہتی ہے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ملک بھر میں دینی مدارس کے خلاف کی

جانے والی کارروائیاں فی الفور بند کر دی جائیں، امریکی کمانڈوز سے دوٹوک طور پر کہہ دیا جائے کہ القاعدہ کے ارکان کی تلاش کی آڑ میں ہم اپنے دینی تعلیم کے نظام اور ماحول کو ڈسٹرب نہیں کر سکتے، دینی مدارس کو مالیاتی و انتظامی خود مختاری کے تحفظ کی دوٹوک گارنٹی دی جائے، نصاب و نظام کے معاملہ میں انہیں ڈکٹیشن دینے کے بجائے مشاورت کے ذریعے سے ضروری اصلاحات کی راہ ان کے وفاقوں کے ذریعے سے ہموار کی جائے اور دینی حلقوں اور مدارس کے بارے میں امریکہ اور بھارت کے ایجنڈے سے لاتعلقی کا واضح طور پر اعلان کیا جائے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاوندوں سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو غلاموں کی طرح زدوکوب نہ کیا کریں، کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں ہوگی کہ دن کے وقت وہ انہیں تھپڑ مار رہے ہوں اور شام کو پھر انہیں گلے لگانے کے لیے بھی آگے بڑھیں۔ حکمران بھی گھر کے سربراہ کی طرح ہوتا ہے، اسے بھی اگر گھر کے افراد کے تعاون کی ضرورت ہے تو اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ یہ تو کوئی شرافت کی بات نہیں سمجھی جائے گی کہ ایک طرف دینی مدارس چھاپوں کی زد میں ہوں، رات کی تاریکی میں ان کی دیواریں پھلانگی جا رہی ہوں، اساتذہ و طلبہ کو زدوکوب کیا جا رہا ہو اور جیل کی کال کوٹھڑیوں کو مولویوں سے بھرا جا رہا ہو اور دوسری طرف وفاقی وزیر مذہبی امور تیرہ ارب روپے کے نوٹ تھالی میں رکھ کر دینی مدارس کے دروازوں پر دستک دے رہے ہوں۔ ان حالات میں تو امداد اور نصیحت کی بات کوئی عام آدمی بھی قبول نہیں کرتا، حکومت نے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے اس کی توقع کیسے کر لی؟

(روزنامہ پاکستان، ۲۷ جون ۲۰۰۲ء)

مدرسہ آرڈیننس کے مضمرات

گزشتہ روز ملتان میں وفاق المدارس العربیہؒ پاکستان کی مجلس عاملہ کے ایک ہنگامی اجلاس میں وفاق کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی خصوصی دعوت پر شرکت کا موقع ملا۔ اگرچہ وفاق میں شامل ایک تعلیمی ادارہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں کئی سالوں سے تدریس کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں، مگر وفاق المدارس کے کسی اجلاس میں حاضری کا پہلی بار اتفاق ہوا۔ وفاق کا قیام حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا شمس الحق افغانی اور حضرت مولانا مفتی محمود رحمہم اللہ کی مساعی سے عمل میں آیا تھا جو ان بزرگوں کی مخلصانہ کوشش اور خلوص وللّٰہیت کی وجہ سے بحمد اللہ تعالیٰ اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے کہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے بقول اس سال وفاق کے سالانہ امتحانات میں اٹھانوے ہزار سے زائد طلبہ اور طالبات شریک ہو رہے ہیں۔ مدارس کے نظام و نصاب میں ہم آہنگی، باہمی ربط و تعاون اور امتحانات میں یکسانی کی غرض سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مسلسل محنت اور پیشرفت دیکھ کر دیگر مذہبی مکاتب فکر بھی متوجہ ہوئے اور ان کے ہاں بھی اس قسم کے وفاقوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ اس وقت تمام مکاتب فکر کے پانچ وفاق کام کر رہے ہیں اور ان کے تحت کم و بیش سترہ ہزار مدارس مصروف کار ہیں جن میں سب سے بڑی تعداد وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مدارس کی ہے۔

وفاق نے نصاب تعلیم کے معیار کو بڑھانے اور امتحانات کی نگرانی کے لیے جو متوازن طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے، اس کی وجہ سے نہ صرف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے وفاق المدارس العربیہ کی سندات کو مختلف درجات و مراحل میں تسلیم کیا ہوا ہے بلکہ ملک کی یونیورسٹیاں بھی اس کے معیار کو قبول کرتی ہیں۔ چنانچہ وفاق کے سربراہ شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان نے اس سفر کے دوران میں ایک ملاقات میں بتایا کہ انہوں نے چند سال قبل کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو دعوت دی کہ وہ خود تشریف لا کر وفاق کے امتحانات کا معائنہ کریں اور امتحانات کے دوران میں کسی روز وفاق کے

نظام امتحانات کو چیک کریں۔ وہ خود تو تشریف نہ لائے البتہ شعبہ عربی اور شعبہ اسلامیات کے سربراہوں کو اس مقصد کے لیے بھیجا جنھوں نے طلبہ کو امتحانات کے مراکز میں پرچے حل کرتے دیکھا اور اپنے تاثرات یوں بیان کیے کہ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دینی مدارس میں امتحانات کا اس قدر مضبوط و مربوط نظام ہو گا اور نگران حضرات کی کڑی نگرانی میں طلبہ اس خاموشی اور متانت کے ساتھ پرچے حل کر رہے ہوں گے۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم انسانوں میں نہیں بلکہ فرشتوں کے درمیان بیٹھے ہیں اور ہم اس نظام سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

میں نے اس موقع پر وفاق کے صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان اور سیکرٹری جنرل حضرت مولانا قاری محمد حنیف جالندھری سے یہ عرض کیا کہ دینی مدارس کے نظام اور معیار تعلیم وغیرہ کے حوالے سے بین الاقوامی حلقوں میں جو شدید منافرت اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور جسے مخصوص عالمی لابیاں اپنے مقاصد کے لیے مسلسل بڑھاتی جا رہی ہیں، ان کو کم کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وفاق المدارس تعلیم سے تعلق رکھنے والے بین الاقوامی اداروں کو خود دعوت دے کہ وہ پاکستان کے بڑے مدارس کا دورہ کریں، ان کے تعلیمی نظام کا براہ راست جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ امتحانات کے موقع پر مانیٹرنگ بھی کریں تاکہ ان کو اس بات کا صحیح طور پر علم ہو کہ پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف عالمی سطح پر پھیلائی جانے والی کردارکشی کی باتوں میں کس حد تک صداقت ہے اور اس قسم کا پراپیگنڈا کرنے والوں کا اصل مقصد کیا ہے؟ وفاق کے دونوں ذمہ دار حضرات نے میری اس گزارش سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ وہ اس تجویز کا سنجیدگی سے جائزہ لیں گے۔

وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں دینی مدارس کی رجسٹریشن اور ریگولیشن کے حوالے سے حکومت کا مجوزہ آرڈیننس زیر بحث آیا جس کے بارے میں صدر جنرل پرویز مشرف اور ان کے وزراء کی طرف سے بارہا یہ یقین دہانی کرائی جاتی رہی ہے کہ اس آرڈیننس کا مقصد دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کرنا نہیں اور نہ ہی کوئی آرڈیننس دینی مدارس کے وفاقوں کی مشاورت کے بغیر نافذ کیا جائے گا، حتیٰ کہ جنرل پرویز مشرف نے اپنی ۱۲ جنوری ۲۰۰۳ء کی نشری تقریر میں پوری قوم کے سامنے یہ بات کہی تھی کہ وہ دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں لے کر انہیں خراب نہیں کرنا چاہتے، لیکن جب ۶ جولائی کے مذاکرات میں دینی مدارس کے وفاقوں کو وفاقی کابینہ کا منظور کردہ مسودہ دیا گیا تو

وہ ان دونوں یقین دہانیوں کے برعکس تھا۔ اسے وفاقی کابینہ میں منظور کرنے سے قبل دینی مدارس کی قیادت کو اس کے حوالے سے اعتماد میں لینے کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا اور دینی مدارس کے داخلی نظام میں مداخلت نہ کرنے کے بار بار اعلانات کے برعکس اس آرڈیننس کو دینی مدارس کے لیے ایک ایسا شکنجہ بنا دیا گیا ہے کہ خدانخواستہ اس آرڈیننس کے نفاذ کی صورت میں ملک کا کوئی دینی مدرسہ اپنے تعلیمی کام کے تسلسل کو آزادانہ ماحول میں جاری نہیں رکھ سکتا۔ اس آرڈیننس کی رو سے ملک میں اس وقت موجود تمام دینی مدارس کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ خود کو حکومت کے قائم کردہ "مدرسہ تعلیمی بورڈ" کے ساتھ ملحق کریں اور جو مدرسہ اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد چھ ماہ تک اپنا الحاق اس بورڈ سے نہیں کرائے گا، اسے بند کر دیا جائے گا اور بورڈ کو اختیار ہوگا کہ وہ اس مدرسے کی انتظامیہ کو برطرف کر کے اپنی طرف سے انتظامیہ قائم کر دے یا اس مدرسے کو بند کر کے اس کے اثاثے اور جائیداد اپنی صوابدید پر کسی دوسرے مدرسے کو منتقل کر دے۔

اس آرڈیننس کی رو سے "سرکاری مدرسہ تعلیمی بورڈ" دینی مدارس کے نصاب میں اضافہ تجویز کرے گا جن کو قبول کرنا لازمی ہوگا۔ بورڈ امتحانات کا طریق کار وضع کرے گا، دینی مدارس کے لیے قواعد و ضوابط طے کرے گا، اساتذہ کی اہلیت کے معیار کا تعین کرے گا، امتحانات کی نگرانی کرے گا اور مختلف درجات کی سندات کے لیے نصاب کا معیار اور مواد بھی بورڈ ہی تجویز کرے گا۔ جو مدرسہ بورڈ کے طے کردہ قواعد و ضوابط اور ہدایات کی پابندی نہیں کرے گا، اس کے ذمہ دار حضرات کے لیے دو سال قید یا پچاس ہزار روپے جرمانہ کی سزا کے ساتھ مدرسے کے انتظام سے ان کی علیحدگی بھی ضروری ہو جائے گی۔

آرڈیننس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر مدرسہ اپنی آمدنی کے ذرائع اور چندہ دینے والوں کے کوائف بورڈ کو دینے کا پابند ہوگا اور بیرون ملک سے آنے والی کسی بھی قسم کی رقوم کو بورڈ کی اجازت کے بغیر وصول نہیں کر سکے گا۔ اس کے علاوہ ہر مدرسہ اپنا اکاؤنٹ بھی بورڈ کے منظور کردہ بینک میں کھلوا سکے گا، بورڈ ہی کے مقرر کردہ آڈیٹر سے حسابات چیک کرانے کا پابند ہوگا اور بورڈ کے مقرر کردہ افسر مجاز کی طرف سے مالی بدعنوانی یا بورڈ کی ہدایات کی خلاف ورزی کی شکایت پر مدرسے کی انتظامیہ کو برطرف کر کے بورڈ کی صوابدید پر نئی انتظامیہ مقرر کی جا سکے گی۔ گویا اس آرڈیننس کی رو سے حکومت نے ملک

کے تمام دینی مدارس کو اپنے کنٹرول میں لینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود جنرل پرویز مشرف کے بقول ان کے نظام کو خراب کیا جائے اور ان کے اس معاشرتی و دینی کردار کا خاتمہ کر دیا جائے جس کا خود ہمارے موجودہ حکمران بھی کئی بار کھلے بندوں اعتراف کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ نے اس آرڈیننس کو ''انسداد دینی مدارس آرڈیننس'' قرار دیتے ہوئے یکسر مسترد کر دیا ہے، جبکہ اس سے اگلے روز تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے پانچوں وفاقوں نے لاہور میں اجلاس کر کے مشترکہ طور پر اس آرڈیننس کو مسترد کرنے کا اعلان کیا ہے اور اس سلسلے میں رائے عامہ کو منظّم کرنے اور دینی و سیاسی حلقوں کو اعتماد میں لینے کے لیے مختلف شہروں میں علماء اور دینی کارکنوں کے کنونشن منعقد کرنے اور ۷ر اگست کو لاہور میں کل جماعتی کانفرنس طلب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وفاق المدارس العربیہ اور ملک کے دیگر وفاقوں کا یہ مشترکہ موقف اور پروگرام وقت کی اہم ضرورت ہے، کیونکہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری اسی طرح ضروری ہے جس طرح نماز کے لیے وضو ضروری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز جب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے تو بعض دوستوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ صوبے کے حکمران ہیں، اس لیے انہیں صوبائی حکومت کی طرف سے دینی مدارس کی امداد کے لیے کوئی نظام وضع کرنا چاہیے۔ مفتی محمود صاحب خود اس وقت وفاق المدارس العربیہ کے سربراہ تھے، لیکن انہوں نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا اور فرمایا کہ میں نے ہمیشہ حکمران نہیں رہنا۔ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور ان کے مفادات اور ترجیحات بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لیے دینی مدارس کے نظام کو ان تبدیلیوں کے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے اور ان کی آزادی کی حفاظت ہر چیز پر مقدم ہے۔

جنرل پرویز مشرف سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، کیونکہ دینی مدارس کی جن اچھائیوں کا وہ خود اعتراف کر رہے ہیں، ان اچھائیوں کی بنیاد ان کی آزادی اور خود مختاری پر ہے جس کے لیے انہیں سرکاری اہل کاروں کی مداخلت اور بیوروکریسی کے کنٹرول سے بچانا ضروری ہے، ورنہ ان کی کابینہ کے منظور کردہ آرڈیننس کے (خدانخواستہ) نفاذ کی صورت میں دینی

مدارس کا حشر کیا ہوگا، اس کا حال معلوم کرنے کے لیے وہ جامعہ عباسیہ بہاولپور اور جامعہ عثمانیہ گول چوک اوکاڑہ کی فائلیں منگوا کر پڑھ لیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ملک کے تمام دینی مدارس کو جامعہ عباسیہ اور جامعہ عثمانیہ بنانا پسند نہیں کریں گے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۵/ جولائی ۲۰۰۲ء)

مدارس آرڈیننس نافذ کرنے کا نیا سرکاری پروگرام

دینی مدارس کے بارے میں صدر پرویز مشرف اور وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی کے اعلانات کے باوجود تذبذب اور گومگو کی فضا ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور مختلف حوالوں سے یہ خبریں سامنے آ رہی ہیں کہ حکومت ریگولیشن اور رجسٹریشن کے نام پر اس آرڈیننس کو ایک بار پھر جھاڑ پھونک کر نفاذ کے مرحلہ تک لانے کی تیاریاں کر رہی ہے جسے دینی مدارس کے تمام وفاقوں نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا تھا۔ باخبر ذرائع کے مطابق صوبہ سرحد کی حکومت نے پچھلے دنوں وفاقی حکومت سے استفسار کیا کہ جو مدارس رجسٹرڈ نہیں ہیں، کیا انہیں پہلے سے چلے آنے والے رجسٹریشن کے قانون کے تحت رجسٹرڈ کر لیا جائے؟ اس کے جواب میں وفاق نے صوبائی حکومت کو یہ کہہ کر اس کام سے روک دیا کہ اس سلسلہ میں ایک آرڈیننس کا مسودہ زیر غور ہے، اس کے نفاذ تک کسی مدرسہ کی رجسٹریشن نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی سرحد حکومت کو وفاقی حکومت کی طرف سے اسی آرڈیننس کی کاپی بھجوا دی گئی جسے ملک کے دینی حلقوں اور مدارس کے تمام مکاتب فکر کے وفاقوں نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی بعض اخبارات میں پنجاب حکومت کے حوالے سے شائع ہونے والی یہ خبر بھی توجہ طلب ہے کہ اس نے دینی مدارس کے بارے میں کوئی نیا قانون آرڈیننس کی شکل میں نافذ کرنے سے اختلاف کیا ہے۔ خبر کے مطابق وفاقی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو مذکورہ آرڈیننس کا مسودہ بھجوا کر اس کے نفاذ کے سلسلہ میں ان سے رائے طلب کی ہے جس کے جواب میں پنجاب حکومت نے کہا ہے کہ تمام مکاتب فکر کے نمایاں افراد کو اعتماد میں لیے بغیر اس سلسلہ میں کیا جانے والا کوئی فیصلہ خطرناک اور دھماکہ خیز ہو سکتا ہے اس لیے اس قانون کو آرڈیننس کی صورت میں لانے کے بجائے بل کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا جائے۔ پنجاب حکومت نے یہ رائے بھی دی ہے کہ جو معروف مدارس پہلے سے رجسٹرڈ چلے آ رہے ہیں، ان کے لیے نئی رجسٹریشن کی شرط ضروری قرار نہ

دی جائے اور قواعد میں نرمی کر کے انہیں حسب سابق رجسٹرڈ تصور کیا جائے۔ نیز نئے مسودہ قانون کی اس شق پر نظر ثانی کی جائے کہ کسی مدرسہ کی مختلف شاخوں کو الگ الگ خود مختار تعلیمی اداروں کی صورت میں رجسٹرڈ کیا جائے گا، بلکہ انہیں الگ حیثیت دینے کے بجائے اسی مرکز کا حصہ تصور کیا جائے جس کی وہ شاخیں ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب حکومت نے اپنے جوابی خط میں چند اور تجاویز بھی پیش کی ہیں جن کا تعلق انتظامی امور سے ہے۔

ان خبروں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مدارس کے بارے میں کوئی نیا آرڈیننس نافذ کرنے کا سرکاری پروگرام ختم نہیں ہوا بلکہ وقتی طور دینی حلقوں کے احتجاج کی وجہ سے اسے مؤخر کر دیا گیا تھا اور اب اسے نئے سرے سے سامنے لانے کی صورت نکالی جا رہی ہے، لیکن اس دفعہ طریق کار میں یہ فرق ہے کہ اس سے قبل دینی مدارس کے وفاقوں کو اس معاملہ میں اعتماد میں لیا جاتا تھا اور ان کے نمائندوں سے مشاورت کی جاتی تھی، لیکن اب اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی اور حکومت اپنے طور پر ہی اس کام کو نمٹانے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہے، حتیٰ کہ تمام دینی مکاتب فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کے مشترکہ اجلاس میں جو گزشتہ روز جامعہ نعیمیہ لاہور میں ہوا اور جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی، اور اہل تشیع سے تعلق رکھنے والے تمام وفاقوں کے ذمہ دار حضرات شریک ہوئے، بتایا گیا کہ کچھ عرصہ قبل وفاقی وزراء اور دیگر اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے ساتھ دینی مدارس کے وفاقوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں نو رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اور طے کیا گیا تھا کہ دینی مدارس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ اس نو رکنی مشترکہ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ پھر ستمبر کے وسط میں وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال نے ایک اجلاس میں دینی مدارس کی نمائندہ قیادت کے ساتھ وعدہ کیا کہ ایک ماہ کے اندر مشترکہ اجلاس اس مقصد کے لیے طلب کیا جائے گا، لیکن ان دونوں باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور دینی مدارس کی قیادت کو ایک طرف رکھتے ہوئے حکومت ان کے بارے میں آرڈیننس کے نفاذ کی تیاریوں میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔

مذکورہ آرڈیننس دینی مدارس نے اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ اس کے نفاذ کی صورت میں ان کی آزادی اور خود مختاری سلب ہو کر رہ جائے گی جو خود صدر جنرل پرویز مشرف کے اس اعلان کے منافی

ہے کہ وہ مدارس کے نظام میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انہیں کنٹرول میں لینا چاہتے ہیں۔ یہ اعلان صدر جنرل پرویز مشرف نے گزشتہ ہفتے اسلام آباد میں علماء کرام کے ایک اجلاس میں پھر دہرایا ہے کہ ان کا دینی مدارس کے معاملات میں مداخلت اور کنٹرول کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور وہ صرف ان کے نصاب میں جدید علوم کو شامل کرانا چاہتے ہیں تاکہ انہیں قومی دھارے میں لایا جاسکے۔ اسی طرح پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی نے رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کے موقع پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دینی مدارس کے نظام میں مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ وارثان انبیائے کرام علیہم السلام کے مراکز ہیں جبکہ جس آرڈیننس کو از سر نو ملک میں نافذ کرنے کی سرگرمیاں دکھائی دے رہی ہیں، وہ دینی مدارس کے نظام کو مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں لینے کا قانون ہے اور وفاقی وزیر داخلہ کئی بار یہ کہہ چکے ہیں کہ اس آرڈیننس کے نفاذ کے لیے پیشرفت ہو رہی ہے۔

اس وقت اس سلسلے میں عجیب سی صورت حال ہے۔ ایک طرف صدر محترم سمیت ذمہ داران حکومت کے یہ اعلانات ہیں کہ دینی مدارس کو کنٹرول کرنے اور ان کے نظام میں مداخلت کرنے کا کوئی سرکاری پروگرام نہیں ہے۔ دوسری طرف اس آرڈیننس کا مسودہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے مختلف محکموں میں مشاورت کے لیے گھوم رہا ہے جس کے بارے میں دینی حلقوں کا کہنا ہے کہ اس کے نفاذ سے دینی مدارس کی آزادی سلب ہو جائے گی اور وہ مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں چلے جائیں گے، جبکہ تیسری طرف امریکہ کا یہ اعلان اس صورت حال کو اور زیادہ گھمبیر بنا رہا ہے کہ وہ پاکستان کے دینی مدارس کی ''اصلاح'' چاہتا ہے اور اس نے اس مقصد کے لیے حکومت پاکستان کو کروڑوں روپے کی مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت بارہ ارب روپے کی وہ خطیر رقم اس وقت فٹ بال بنی ہوئی ہے جو امریکہ نے فراہم کی ہے اور حکومت پاکستان اسے امداد کے نام سے دینی مدارس میں تقسیم کرنا چاہتی ہے، لیکن دینی مدارس نے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور جامعہ نعیمیہ لاہور میں منعقد ہونے والے مذکورہ اجلاس میں تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کی اعلیٰ قیادت نے متفقہ طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ وہ نہ صرف امریکہ کی اس رقم کو مسترد کرتے ہیں بلکہ وہ کسی قسم کی سرکاری امداد قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ دینی مدارس کا یہ آزادانہ ماحول آج کی عالمی برادری اور مغربی قیادت کے لیے ناقابلِ برداشت ہے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ کسی ترمیم اور تحفظات کے بغیر قرآن و سنت کی مکمل تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ مغربی قیادت کا تقاضا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے وہ حصے جو بالادست مغربی تہذیب اور عالمی نظام سے متصادم ہیں، وہ نہ پڑھائے جائیں اور ان کے لیے نئی نسل کی ذہن سازی نہ کی جائے کیونکہ اس سے نئی نسل میں مروجہ عالمی نظام اور مغربی تہذیب و ثقافت کے خلاف بغاوت کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ مدارس کو اس کام سے روکنے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اگر رضاکارانہ طور پر مغربی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انہیں کسی نہ کسی طرح سرکاری کنٹرول میں لیا جائے اور قومی دھارے میں شامل کر کے دیگر قومی اور حکومتی شعبوں کی طرح دینی مدارس کے شعبہ کو بھی عالمی نظام کے شکنجے میں جکڑ لیا جائے۔ مگر دینی مدارس کی قیادت بیدار ہے اور مغربی نظام کے اس مقصد کا پوری طرح ادراک رکھتی ہے، اس لیے وہ مدارس کی آزادی اور خود مختاری کو ہر حالت میں قائم رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے اور اس کے خلاف کسی اقدام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس غرض کے لیے دینی مدارس کا ایک متبادل سرکاری نظام ''مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' کے نام سے قائم کیا گیا اور محکمہ تعلیم نے انٹرمیڈیٹ کے تمام بورڈز میں ''درس نظامی گروپ'' قائم کیے لیکن اساتذہ اور طلبہ نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پھر اربوں روپے کی مالی امداد کا لالچ دے کر مدارس کو اس ڈھب پر لانے کی کوشش کی گئی مگر دینی مدارس نے اربوں روپے کی اس رقم کو اس شان بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا کہ جرمنی کے سفیر محترم کو دارالعلوم سرحد پشاور جا کر سوال کرنا پڑا کہ آپ لوگ امریکہ کی مالی امداد کو قبول کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ اس کے بعد ایک ہی حربہ باقی رہ گیا ہے کہ جبر سے کام لیا جائے اور یک طرفہ طور پر ان کے خلاف اقدامات کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے لیے دینی مدارس کے وفاقوں کو غیر مؤثر بنانا اور مدارس پر ان کی گرفت کمزور کرنا ضروری ہے اور نمائندہ وفاقوں کو نظر انداز کر کے الگ طور پر علماء کرام کے اجلاس طلب کرنے، ملک بھر میں مدارس کو براہ راست امداد کی پیش کش کرنے اور رجسٹریشن اور ریگولیشن کے نام پر مجوزہ آرڈیننس کی تیاری میں دینی مدارس کی نمائندہ قیادت کے ساتھ مشاورت کا سلسلہ یک لخت ترک کر دینے کے پیچھے یہی حکمت عملی کارفرما

ہے۔

مجھ سے ایک دوست نے پوچھا کہ کیا حکومت پنجاب کی طرف سے دینی مدارس کی رجسٹریشن کے مذکورہ متنازعہ قانون کو آرڈیننس کی شکل میں جبراً نافذ کرنے کی مخالفت کے باوجود وفاقی حکومت اتنے بڑے اقدام کا ''رسک'' لے گی؟ میں نے عرض کیا کہ ہم ''یو ٹرن'' کے عادی ہیں، بلکہ ہم نے ''اباؤٹ ٹرن'' کی مشق بھی اچھی طرح کر رکھی ہے جس کے لیے صرف ایڑی کے بل گھوم جانا ہوتا ہے، اس لیے کوئی اقدام بھی غیر متوقع نہیں ہے۔ البتہ اگر دینی مدارس کے وفاق باہمی رابطہ واعتماد کی موجودہ فضا کو قائم رکھ سکیں، ملحقہ مدارس پر اپنی اپنی گرفت برقرار رکھنے کے ضروری تقاضے پورے کر لیں اور رائے عامہ کے ساتھ ان کا تعلق مستحکم ہو جائے تو ''جبر کا حربہ'' بھی اسی طرح ناکام ہو جائے گا جس طرح ''لالچ'' کے حربے کو منہ کی کھانی پڑی ہے۔ اصل بات ملک بھر کے دینی مدارس کے ارباب بست وکشاد کی دینی حمیت اور بیداری، اپنے اپنے وفاقوں کی قیادت پر بھرپور اعتماد اور پھر تمام وفاقوں کی قیادتوں کا باہمی رابطہ ومشاورت ہے۔ یہ بات قائم رہی تو ان شاء اللہ تعالیٰ دینی مدارس اس امتحان میں بھی سرخرو ہوں گے۔

(روزنامہ اسلام، ۱۱ر دسمبر ۲۰۰۳ء)

دینی مدارس اور حکومتی امداد

سرکاری سطح پر ''مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' نے کام شروع کر دیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب مدرسہ بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ اسلام آباد کے حاجی کیمپ میں اس کا ہیڈ آفس قائم ہو گیا ہے اور ڈاکٹر صاحب محترم کی طرف سے اخبارات میں ایک اشتہار کے ذریعے سے دینی مدارس سے اس بورڈ کے ساتھ الحاق کے لیے درخواستیں طلب کرنے کا اعلان بھی ہو گیا ہے۔ گزشتہ دنوں گوجرانوالہ میں ایک حساس ادارے کے ذمہ دار افسر نے مجھ سے دریافت کیا کہ سرکاری بورڈ کے ساتھ الحاق کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرا چونکہ دینی مدارس کے ساتھ تعلق ہے، اس لیے میری رائے وہی ہوگی جو دینی مدارس اپنے اپنے وفاقوں کے ذریعے سے اجتماعی طور پر قائم کریں گے۔ انہوں نے بتایا کہ گوجرانوالہ میں بعض مدارس نے الحاق کے لیے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حوالے سے حساس ادارے بھی متحرک ہیں اور مختلف شہروں میں انفرادی طور پر دینی مدارس کو ''مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' کے ساتھ الحاق کے لیے آمادہ کرنے پر محنت ہو رہی ہے۔

اسی دوران میں اے پی پی کی ایک خبر کے مطابق وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال نے کوئٹہ میں دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیتی ورکشاپ کی اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی راہ میں کوئی اندرونی یا بیرونی رکاوٹ برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت نے قومی دھارے میں شامل کرنے کے عنوان سے دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی تشخص کو ہر قیمت پر ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ وہی نقطہ نظر ہے جسے ہمارے ہاں داخلی طور پر دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کا نام دیا گیا ہے اور بین الاقوامی حلقوں میں اسے دینی مدارس کی اصلاح کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے جس کے لیے امریکہ نے حکومت پاکستان کو اربوں روپے کی امداد دی ہے اور یورپی یونین نے بھی گزشتہ روز اعلان کیا ہے کہ وہ

پاکستان کو دینی مدارس کی اصلاح کے لیے مالی امداد دینے کو تیار ہے۔

محترمہ زبیدہ جلال نے اپنے کوئٹہ کے مذکورہ خطاب میں یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ دینی مدارس میں دنیاوی علوم کے فروغ کا مقصد دینی مدارس کے طلبہ کو ملک اور قوم کا ایک کارآمد شہری بنانا ہے۔ اس طرح اس تاثر کا ایک بار پھر اعادہ کیا جا رہا ہے کہ دینی مدارس جس رخ پر کام کر رہے ہیں، وہ صحیح رخ نہیں ہے اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء جن شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، ملک و قوم کے لیے ان کا کارآمد ہونا محل نظر ہے۔ اس حوالے سے یہ الگ بحث ہے جو مستقل گفتگو کی متقاضی ہے کہ دینی مدارس اس معاشرے کی جو خدمت کر رہے ہیں، اس کی اہمیت و افادیت کی سطح اور حجم کیا ہے اور ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کرام، حفاظ، قاری، مفتی، خطیب، مدرس، امام اور مبلغ کی حیثیت سے جن شعبوں میں کام کر رہے ہیں، وہ ملک و قوم کے لیے کارآمد ہیں یا نہیں، مگر سرِدست اس بحث سے قطع نظر عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمام تر مبینہ کمزوریوں، اعتراضات اور طعن و تشنیع کے باوجود دینی مدارس کو اپنا جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار ہمیشہ عزیز رہا ہے اور باوجودیکہ قومی دھارے میں شامل ہونے کی صورت میں انہیں اخراجات کے لیے رقوم جمع کرنے کے حوالے سے بہت سے جھنجھٹوں سے نجات مل سکتی ہے، مگر وہ اپنے مشن کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے عام آدمی کا تعلق دین کے ساتھ قائم رکھنا ہے اور قرآن و سنت کی تعلیم کو کسی مداخلت کے بغیر اگلی نسلوں تک صحیح حالت میں پہنچانا ہے تو ان کا حکومتی نظام اور قومی دھارے سے الگ رہنا لازمی ہے۔ اپنا جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار باقی رکھ کر ہی وہ ان دینی مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں جن کی خاطر ان دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

اس سلسلے میں دینی مدارس کس قدر حساس ہیں؟ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۶۵ء میں جب دیوبند کے قصبہ میں دینی درس گاہ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے جنوبی ایشیا کی علمی و دینی جدوجہد کا عنوان بنا تو اس کے اساسی اصولوں میں حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے یہ بات ہمیشہ کے لیے لکھ دی کہ اس کے اخراجات عام مسلمانوں کے رضاکارانہ مالی تعاون کے ذریعے سے ہی پورے کیے جائیں گے اور اس کے لیے کسی حکومت یا ریاست سے کوئی مستقل امداد قبول نہیں کی جائے گی، چنانچہ ایک سو چالیس سال کے لگ بھگ عرصہ گزر چکا ہے کہ

دار العلوم نے بڑی بڑی پیشکشوں کے باوجود آج تک کسی حکومت کی گرانٹ قبول نہیں کی۔ اسی وجہ سے یہ دینی ادارے پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دینی و ملی مقاصد کے لیے مصروف عمل ہے۔

اسی طرح اس خطے کے ایک دوسرے بڑے علمی و فکری ادارے ''ندوۃ العلماء لکھنو'' کا ایک واقعہ بھی خاصا فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں مولانا مسعود عالم ندویؒ کے تذکرہ میں بیان کیا ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزادؒ بھارت کے وزیر تعلیم بنے تو انہوں نے حکومت کی سرپرستی میں ایک معیاری عربی درس گاہ قائم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا کہ حکومت اسے اپنی سرپرستی میں ایک جدید معیاری عربی تعلیمی ادارے کی شکل دے کر ملک بھر کے دیگر اداروں کے لیے مثال بنائے گی۔ اس مقصد کے لیے ندوۃ العلماء لکھنو کو پیشکش کی گئی کہ اگر ندوہ اس کردار کو قبول کرلے تو حکومت اس کی عمارتوں کی تکمیل کرا دے گی اور اخراجات میں سرپرستی کرے گی۔ مولانا سید ابوالحسن ندویؒ لکھتے ہیں کہ ندوہ والے اس پیشکش پر الجھن میں پڑ گئے۔ ایک طرف مولانا آزادؒ کی شخصیت تھی جو بھارتی مسلمانوں کے قومی لیڈر رہونے کے ساتھ ساتھ وفاقی وزیر تعلیم بھی تھے، ندوۃ العلماء لکھنو کے قدیمی معاونین اور سرپرستوں میں سے تھے اور ایک عرصہ سے ندوہ کی انتظامیہ اور شوریٰ کا حصہ چلے آرہے تھے اور دوسری طرف یہ بات پیش نظر تھی کہ سرکاری سرپرستی قبول کرکے ندوہ اپنا تشخص کھو دے گا اور وہ مختلف ملی و دینی شعبوں میں جو خدمات سرانجام دے رہا ہے، ان سے محروم ہو جائے گا۔ اس لیے یہ پیشکش قبول کرنا ندوہ والوں کے لیے بے حد مشکل بات تھی، چنانچہ اس مقصد کے لیے مولانا مسعود عالم ندویؒ کا انتخاب ہوا کہ وہ مولانا آزادؒ سے مل کر بات کریں۔ مولانا ندوی دہلی گئے، مولانا آزادؒ سے ملے اور ان سے جو بات کی، اس کا خلاصہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے ملاحظہ فرمالیجیے:

> ''مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ملاقات کے لیے آنے پر مولانا مسعود عالم ندویؒ کو فوراً بلا لیا اور اپنے معمول کے مطابق کہا کہ مولانا مسعود کیسے آئے؟ (مولانا مسعودؒ) کہنے لگے کہ کچھ بزرگوں کے لوح مزار کی عبارت کے بارے میں غور و خوض ہو رہا ہے۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ کے لوح مزار پر بانی ندوۃ العلماء لکھنا تجویز ہوا ہے، اسی طرح مولانا شبلی نعمانیؒ کی لوح مزار کی کوئی عبارت بتائی جس سے ان کی ندوۃ العلماء کی تحریک کو ترقی دینے کا اظہار

ہوتا تھا۔ کہنے لگے کہ اندیشہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے لوح مزار پر ”قاتل ندوۃ العلماء“ لکھا جائے گا۔ مولانا آزادؒ نے بڑے استعجاب سے پوچھا کہ کیوں؟ معاملہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ آپ نے جو تجویز پیش کی ہے، اس کا مآل تو یہی ہے کہ ندوۃ العلماء تو ختم ہو جائے اور ہم اور آپ اس کے قاتل ٹھہریں۔ آج تو آپ منصب وزارت پر ہیں اور آپ کی موجودگی میں اس کا خطرہ نہیں، لیکن آئندہ کون آتا ہے اور کیا ہوتا ہے؟ مولانا کی شہرہ آفاق ذہانت کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ وہ دور تک بات کو سمجھ گئے اور فرمایا کہ آپ لوگوں کا فیصلہ صحیح ہے اور اس تجویز پر کوئی اصرار نہ کیا۔“

اسی قسم کی صورت حال ہمارے ہاں اس وقت پیش آئی تھی جب ۱۹۷۲ء میں مولانا مفتی محمود صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ان کی حکومت پر ملک کے دینی حلقوں میں بڑی خوشی محسوس کی گئی تھی جو فطری بات ہے۔ مفتی صاحب اس وقت وفاق المدارس کے ذمہ دار حضرات میں سے تھے۔ ان سے بعض دینی مدارس نے صوبائی حکومت کی طرف سے امداد کی درخواست کی اور ایک مجلس میں یہ بات بطور مشورہ زیر غور آئی کہ مفتی صاحب کی حکومت کو دینی مدارس کی مالی امداد کرنی چاہیے یا نہیں؟ بعض دوستوں کی رائے اس کے حق میں تھی، مگر مفتی صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں یہ روایت قائم نہیں کرنا چاہتا۔ آج میں وزیر اعلیٰ ہوں، کل کوئی اور ہوگا اور اگر میں دینی مدارس میں سرکاری امداد کا راستہ کھول دوں گا تو کل آنے والا مداخلت بھی کرے گا اور دینی مدارس کا نظام اپنے مقصد سے ہٹ جائے گا، اس لیے دینی مدارس کی امداد کے لیے صوبائی حکومت کی طرف سے کوئی فنڈ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظریاتی اور مشنری دینی ادارے اس معاملے میں کس قدر حساس ہیں اور ان کے تحفظات کیا ہیں؟ یہ درست ہے کہ سرکاری مدرسہ بورڈ کو بھی بہت سے مدارس مل جائیں گے اور امریکی امداد اور یورپی امداد کے مصرف کے طور پر بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں مدارس حکومت کو میسر آ جائیں گے، لیکن جو مدارس ایک مشن اور نظریہ کے طور پر کام کر رہے ہیں، وہ پہلے کی طرح اب بھی اس سے الگ ہی رہیں گے۔ اس کا تجربہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں سرکاری سطح پر مدارس میں زکوٰۃ کی رقم تقسیم کرنے کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔ اب بھی اس تجربے کے نتائج مختلف نہیں ہوں گے، تاہم دینی مدارس کے وفاقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ آنے والے حالات پر نظر

رکھیں اور دینی مدارس کو گھیرنے کے اس نئے پروگرام کے بارے میں رائے عامہ کی راہ نمائی اور اپنے موقف اور پوزیشن کی وضاحت کا محاذ خالی نہ رہنے دیں۔ دینی مدارس کے وفاقوں کو ایک بار پھر مشترکہ اجتماعات کا اہتمام کرنا چاہیے اور درپیش خطرات و خدشات کے پیش نظر دینی مدارس، علماء کرام، دینی کارکنوں اور رائے عامہ کی راہنمائی کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۶/ اگست ۲۰۰۳ء)

وفاق المدارس العربیہ کا کنونشن

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام ۱۵؍ مئی ۲۰۰۵ء کو کنونشن سینٹر اسلام آباد میں منعقد ہونے والا دینی مدارس کنونشن اس حوالے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے حالیہ اجلاس کے بعد دینی مدارس کے بارے میں حکومت کی نئی پالیسی اور حکمت عملی سامنے آ گئی ہے۔ چنانچہ ۱۵؍ مئی کے مذکورہ کنونشن کی کارروائی اس لیے بھی ملک بھر کے عوام کی توجہ کا مرکز ہو گی کہ نئی حکومتی پالیسی کا ردعمل دینی مدارس کے اس سب سے قدیمی اور سب سے بڑے وفاق کی طرف سے کیا سامنے آتا ہے؟

''دینی مدارس کنونشن'' بظاہر وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے سالانہ امتحانات میں گزشتہ سال اور اس سے پیوستہ سال اول، دوم، سوم آنے والے فضلاء اور فاضلات میں انعامات کی تقسیم کے لیے انعقاد پذیر ہو رہا ہے اور اس میں ملک کے مقتدر طبقات اور مختلف مکاتب فکر کے زعماء کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے، جبکہ وفاق کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد حنیف جالندھری نے ایک اخباری اشتہار میں کنونشن کے لیے جن عنوانات کا اعلان کیا ہے اور ان پر ملک بھر کے ارباب علم و دانش کو اپنے مضامین کے ذریعے سے خامہ فرسائی کی دعوت دی ہے، ان عنوانات کا تنوع اور ان کی وسعت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ وفاق کی قیادت ملک کے مقتدر حلقوں اور بین الاقوامی لابیوں کے سامنے اپنے پروگرام اور پالیسیوں کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ واضح کرنا چاہتی ہے اور اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے کردار اور سرگرمیوں کے بارے میں اعلیٰ حلقوں میں جو ابہام پایا جاتا ہے، وہ دور ہو اور جو مختلف قسم کے شکوک و شبہات پھیلائے جاتے ہیں، ان کا ازالہ ہو۔ اس لیے اس اجتماع کے لیے اسلام آباد شہر اور ملک کے سب سے مہنگے کانفرنس ہال کا انتخاب کیا گیا ہے اور میرے خیال میں اگر وفاق المدارس اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے اور ان حلقوں تک اپنا پیغام براہ راست پہنچانے کا یہ ہدف کسی بھی سطح پر پا لیتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ وقت کی ضروریات میں شمار ہو گا اور

وفاق کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا، مگر اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے اور صرف کنونشن سینٹر کی بکنگ، دعوت ناموں، اشتہارات اور خبروں پر قناعت کرنے کے بجائے ذاتی رابطوں اور مختلف طبقات کی اہم شخصیات کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے ہوم ورک پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ملک میں دینی مدارس کو ایک فورم پر متحد کرنے، ان کے تعلیمی وامتحانی نظام کو مربوط بنانے اور ان کی آزادی وخود مختاری کے تحفظ کے لیے ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ وفاق دیوبندی مکتب فکر کے مدارس پر مشتمل ہے جس نے اس سمت میں جدوجہد کا آغاز کیا جبکہ اس کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے مکاتب فکر نے بھی اپنے وفاق قائم کیے اور دینی مدارس کی تنظیم وارتباط کا سلسلہ دن بدن وسیع ہوتا چلا گیا۔ پھر وفاق المدارس العربیہ نے یہ کریڈٹ بھی حاصل کیا کہ دینی مدارس کی آزادی وخود مختاری کے لیے خطرات کی بو سونگھتے ہوئے اس نے مختلف مکاتب فکر کے وفاقوں کو ایک فورم پر متحد کرنے میں پہل کی اور آج تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس تمام تر باہمی اختلافات کے باوجود ''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ'' کے نام سے متحد ہیں اور ان کے اتحاد اور باہمی اعتماد وتعاون ہی کا ثمرہ ہے کہ عالمی استعماری حلقے ان مدارس کے آزادانہ تعلیمی کردار اور مالیاتی وانتظامی خود مختاری ختم کرنے کے ہر حربے میں ناکام ہوئے ہیں۔ وفاق المدارس العربیہ کا یہ امتیاز بھی ہے کہ اس کے ساتھ مدارس کی سب سے بڑی تعداد منسلک ہے اور شاید اس بات میں مبالغہ نہ ہوگا کہ وفاق المدارس سے الحاق رکھنے والے مدارس کی تعداد دوسرے تمام وفاقوں سے منسلک مدارس کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے اس سطح پر تقسیم انعامات کی تقریب منعقد کرنے کا فیصلہ پہلی بار کیا ہے اور اس طرح ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے جس سے ''دینی مدارس کنونشن'' نے خاصی اہمیت اختیار کر لی ہے، مگر میرے خیال میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کی ان سفارشات نے اس کنونشن کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے جو حال ہی میں سامنے آئی ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت، لاہور کی ۹ر مئی کی اشاعت میں شامل ایک رپورٹ کے مطابق نیشنل سیکیورٹی کونسل کے گزشتہ اجلاس میں ملک میں مذہبی انتہا پسندی کو کنٹرول کرنے اور اعتدال پسندی کو

فروغ دینے کے عنوان سے دینی مدارس کے کردار کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور متعدّد سفارشات مرتب کی گئی ہیں جو عملدرآمد کے لیے صوبائی حکومتوں کو بھجوا دی گئی ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت نے دینی مدارس میں اصلاحات کے لیے صوبائی حکومتوں کو جو فنڈز دیے تھے، وہ روک لیے ہیں اور حکومتی انتظام کے تحت جو مدارس قائم کیے گئے تھے، انہیں بند کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں پروگرام اپنے مقاصد کے حوالے سے ناکام ہو گئے ہیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ اگر دینی مدارس کو وسیع مالی امداد دی جائے گی تو وہ حکومتی پروگرام کے تحت چلنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور اپنے آزادانہ تعلیمی کردار سے دستبرداری اختیار کر لیں گے۔ ماڈل مدارس قائم کر کے اساتذہ اور طلبہ کو جب مختلف مفادات اور مراعات کی ترغیب دی جائے گی تو وہ اپنے معاشی مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اس طرف دوڑے چلے آئیں گے، لیکن یہ دونوں توقعات نقش بر آب ثابت ہوئیں اور تمام تر ترغیبات اور دھمکیوں کے باوجود پورے ملک میں نصف درجن ماڈل مدارس بھی قائم نہیں ہو سکے اور جو چند مدارس وجود میں آ گئے، وہ خطیر رقوم صرف کرنے کے باوجود نہیں چل سکے، اس لیے حکومت کو بالآخر یہ دونوں فیصلے واپس لینے پڑے ہیں اور یہ بلاشبہ دینی مدارس کے وفاقوں کے اتحاد اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

البتہ مذکورہ بالا رپورٹ میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حکومت مالی ترغیبات اور مراعات و مفادات کی تحریص کے حربے میں ناکامی کے بعد اب رجسٹریشن کے نام سے مدارس کو قانونی شکنجے میں کسنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان کے دینی مدارس کی اکثریت سوسائٹی ایکٹ، ٹرسٹ ایکٹ، سوشل ویلفیئر اور والنٹیر ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے لیکن حکومت نے ماڈل دینی مدارس کے نام پر مدرسہ بورڈ قائم کر کے ان کی متبادل رجسٹریشن کا جو پروگرام بنایا تھا، اس کے تحت اب تک صرف ایک سو پانچ مدرسے رجسٹرڈ ہوئے ہیں، اس لیے اسے ناکام پروگرام قرار دے کر بند کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ رجسٹریشن کے حوالے سے دینی مدارس اور حکومت کے درمیان اسی نکتے پر تنازع چلا آ رہا ہے کہ حکومت مذکورہ بالا قوانین کے تحت مدارس کی رجسٹریشن کو کافی نہ سمجھتے ہوئے رجسٹریشن کا نیا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے، جس کا مقصد مدارس کے نظام میں حکومتی مداخلت کی راہ ہموار کرنا اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ دینی مدارس حکومت کی مقرر کردہ حدود سے ہٹ کر کوئی تعلیمی پروگرام جاری نہ رکھ

سکیں۔ یہ صورت حال دینی مدارس کے لیے قابلِ قبول نہیں، اس لیے کہ یہ ان کی گزشتہ ڈیڑھ سو صدی کی روایات کے خلاف ہے، اس لیے بھی کہ وہ اس صورت میں معاشرے میں دینی تعلیم کے فروغ اور اسلامی روایات و اقدار کے تحفظ کے حوالے سے اپنے اساسی مقاصد و اہداف کے حصول میں کامیابی کو مشکوک سمجھتے ہیں اور اس لیے بھی کہ دینی مدارس پر سرکاری کنٹرول کے اس پروگرام کے پیچھے انہیں عالمی استعمار کے عزائم اور ایجنڈا صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے جو سرے سے دینی مدارس کے وجود اور ان کے جداگانہ تشخص ہی کے خاتمہ کے درپے ہے۔ اس لیے دینی مدارس نے پہلے سے چلنے والے رجسٹریشن کے قوانین کے تحت خود کو رجسٹریشن کرانے سے کبھی انکار نہیں کیا، مگر سرکاری مداخلت اور کنٹرول کی راہ ہموار کرنے والے رجسٹریشن کے کسی نئے قانون کو وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا رپورٹ کے مطابق اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ رجسٹریشن کا نیا قانون آرڈیننس کے بجائے پارلیمنٹ سے منظور کرا کے نافذ کیا جائے اور اس کے عملی نفاذ میں سختی سے کام لیا جائے۔ اس سفارش میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ رجسٹریشن نہ کرانے والے مدارس کی ڈگری کو تسلیم نہیں کیا جائے گا، کسی نئے دینی مدرسہ کے لیے حکومت سے این او سی کو لازمی قرار دیا جائے گا، دینی مدارس کو فنڈز انٹر مدارس بورڈ کے ذریعے سے دیے جائیں گے اور قانوناً تمام مدارس کو رجسٹریشن کا پابند بنایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سفارش یہ بھی ہے کہ جن علاقوں میں دینی مدارس زیادہ ہیں، وہاں ان کے قریب ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے بنائے جائیں تاکہ علاقہ کے لوگوں کو متبادل تعلیم کے ذرائع میسر آسکیں۔

ان سفارشات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہ بھولے بادشاہ ابھی تک اسی غلط فہمی میں ہیں کہ دینی مدارس میں پڑھنے اور پڑھانے والے غربت کی وجہ سے مجبوراً ایسا کر رہے ہیں، اس لیے اگر انہیں ڈگری کا لالچ دیا جائے تو وہ حکومتی پروگرام کو قبول کر لیں گے اور اگر انہیں متبادل ٹیکنیکل تعلیم فراہم کر دی جائے تو وہ دینی تعلیم سے دستبرداری اختیار کر لیں گے۔ خدا جانے ہمارے یہ بزرجمہر کس فضا میں بیٹھے یہ باتیں سوچتے رہتے ہیں اور کون انہیں یہ احمقانہ مشورے دیتا ہے۔ ان خدا کے بندوں کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ دینی تعلیم غربت یا ڈگری کا مسئلہ نہیں، ایمان اور عقیدے کا مسئلہ ہے

اور جسے یہ بھولے بادشاہ مذہبی انتہا پسندی سے تعبیر کر رہے ہیں، اس کی جڑیں مسلمانوں کی حمیت و غیرت میں پیوست ہیں بلکہ جوں جوں امریکی استعمار اور اس کے ہمنواؤں کی طرف سے اس کی مخالفت بڑھ رہی ہے، اس کے فطری رد عمل کے طور پر دینی تعلیم کے رجحان میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور جوں جوں دین کے ساتھ وفادارانہ وابستگی کو انتہا پسندی کا نام دے کر اس کی نفی کی جا رہی ہے، دین کے ساتھ مسلمانوں کی کمٹمنٹ میں مزید مضبوطی اور استحکام پیدا ہو رہا ہے۔ یہ فطری رد عمل ہے جسے ڈگری کے لالچ اور ٹیکنیکل تعلیم کے ذریعے سے روکا نہیں جا سکتا۔

بہرحال اس فضا میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام ۱۵ر مئی کو کنونشن سینٹر اسلام آباد میں منعقد ہونے والا ”دینی مدارس کنونشن“ خاصی اہمیت کا حامل ہے جو دینی مدارس کی جدوجہد میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا اور دینی مدارس کا یہ قافلہ معاشرہ میں دینی تعلیم کے فروغ اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کے لیے نئے حوصلے اور اعتماد سے سرشار ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، ۱۳ر مئی ۲۰۰۵ء)

وفاق المدارس کا کامیاب کنونشن

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ”دینی مدارس کنونشن“ ہماری توقعات سے بڑھ کر کامیاب رہا اور وفاق کی قیادت نہ صرف اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب رہی بلکہ اس نے اپنی دوٹوک پالیسی اور موقف کا ایک بار پھر کھلم کھلا اظہار کر کے دنیا کو یہ پیغام دینے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے کہ دینی تعلیم اور اس کے آزادانہ نظام کے بارے میں عالمی سطح پر ہونے والے منفی پروپیگنڈے اور کردارکشی کی مسلسل مہم نے دینی مدارس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے کے بجائے ان کے لیے مہمیز کا کام دیا اور وہ پہلے سے زیادہ حوصلہ و عزم اور جوش و جذبہ کے ساتھ اپنے مشن پر کاربند ہیں۔

کنونشن میں حکمران مسلم لیگ کے قائد چودھری شجاعت حسین اور قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کی شمولیت و خطاب نے اسے قومی رنگ دیا ہے اور وفاقی وزراء اعجاز الحق اور شیخ رشید احمد نیز صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ محمد اکرم درانی کی شرکت سے دنیا کو یقیناً یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پاکستان میں دینی تعلیم کے فروغ اور اس کے لیے ڈیڑھ صدی سے چلے آنے والے ”آزادانہ نظام“ کے بارے میں حکومت اور اپوزیشن دونوں کے بڑے حلقوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس بات سے معاشرہ میں دینی مدارس کے اثر و رسوخ کی سطح معلوم کی جا سکتی ہے۔

کنونشن میں وفاق المدارس کی کارکردگی اور موقف و پالیسی کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے خطابات بہت جاندار تھے۔ مولانا تقی عثمانی نے دینی مدارس کے مقصد وجود کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کا جائزہ لیا اور مدارس کی پوزیشن واضح کی جبکہ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے حکومت کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کی تفصیل بیان کی جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ دینی مدارس کے آزادانہ تعلیمی کردار اور خود مختاری کے بارے میں وفاق المدارس کی قیادت اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور حکومتی حلقے دینی مدارس کے وفاقوں میں اس حوالے سے

کوئی رخنہ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کنونشن نے جو متفقہ اعلامیہ جاری کیا اس میں بھی اس امر کا واضح اظہار ہے کہ دینی مدارس پر کنٹرول کی کوئی سرکاری کوشش قبول نہیں کی جائے گی اور نہ ہی حکومت سے کوئی مالی امداد وصول کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی کنونشن نے سرکاری مدرسہ بورڈ کو مسترد کرنے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔

کنونشن میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ملک کے چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور وفاقی علاقوں سے پانچ ہزار کے لگ بھگ علماء کرام، طلبہ اور دانشوروں نے شرکت کی اور کنونشن سینٹر کے منتظمین کی طرف سے یہ بات ہال میں گشت کرتی رہی کہ یہ ہال جب سے تعمیر ہوا ہے، پہلی بار فل ہوا ہے حالانکہ کنونشن کے منتظمین کی طرف سے وفاق المدارس کے تحت تمام مدارس کو دعوت نامے جاری نہیں کیے گئے تھے اور انہیں جگہ کی قلت کے باعث وفاق سے ملحق مدارس میں سے دعوت نامے بھجوانے کے لیے انتخاب کرنا پڑا تھا۔

اپوزیشن لیڈر مولانا فضل الرحمٰن نے دینی مدارس کی اہمیت و کردار پر روشنی ڈالی اور پاکستان میں دستور سازی کے لیے علماء کرام کی خدمات اور کردار کا جائزہ پیش کیا۔ ان کے علاوہ سینٹر مولانا سمیع الحق، آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل (ر) حمید گل، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، ممتاز کالم نگار عرفان صدیقی، مکہ مکرمہ سے آئے ہوئے بزرگ مولانا عبدالحفیظ مکی اور دیگر زعماء کے خطابات ہوئے۔

چودھری شجاعت حسین نے کنونشن میں بتایا کہ جب وہ وزیر داخلہ تھے تو انہوں نے دینی مدارس میں دہشت گردی کی تربیت کے الزام کے بارے میں انکوائری کی تھی مگر ملک میں ایک مدرسہ بھی دہشت گردی کی تربیت میں ملوث نہیں پایا گیا اور وہ دینی مدارس کے کردار کی اہمیت سے آگاہ ہیں اور ان کے تحفظ پر یقین رکھتے ہیں۔

وفاقی وزیر برائے مذہبی امور اعجاز الحق نے کنونشن کے شرکاء کو بتایا کہ حکومت نے ماڈل دینی مدارس کے نام سے متبادل دینی درس گاہوں کے قیام کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ ناکام ہو گیا ہے اور کروڑوں روپے کے خرچ سے جو تین ماڈل مدرسے بنائے گئے تھے، ان کی ناکامی کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے، اور میں نے مقتدر حلقوں پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ دینی مدارس علماء ہی بہتر طور پر چلا سکتے ہیں، یہ کام حکومت کے بس کا نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت دینی مدارس کے نظام

میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گی بلکہ اگر کسی وقت حکومت نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو وہ اقتدار سے باہر آکر دینی مدارس کی آزادی کے تحفظ کے لیے آواز بلند کریں گے۔

راقم الحروف سے بھی کچھ معروضات پیش کرنے کے لیے کہا گیا اور میں نے جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ نذر قارئین ہے:

"دینی مدارس نے اپنے سفر کا آغاز ۱۸۶۵ء میں ایک مسجد میں انار کے درخت کے سائے میں کیا تھا۔ اس کا ایک مرحلہ مکمل ہو گیا ہے اور اس سفر کے دوسرے مرحلے کا آغاز آج اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے اس "کنونشن سینٹر" سے ہو رہا ہے۔ یہ یقیناً ایک نئے دور کا آغاز ہے اور اس پر وفاق کی قیادت مبارک باد کی مستحق ہے۔ یہ دینی مدرسہ مسلمانوں کے عقیدہ و ایمان، فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کا مورچہ ہے اور اسلامی تعلیمات کے تحفظ و فروغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسے اپنے اس کردار کے تحفظ کے لیے جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار اور وسطی ایشیا میں روسی استعمار کے جبر کا مسلسل سامنا کرنا پڑا مگر ان دونوں معرکوں میں یہ مدرسہ سرخرو رہا ہے۔ اب اسے ایک نئے استعمار کا سامنا ہے جو میرے نزدیک اس کشمکش کا آخری راؤنڈ ہے اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اس یقین کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مدرسہ کو آخری راؤنڈ میں بھی سرخروئی نصیب ہوگی، ان شاء اللہ۔

میں اس تاریخی کنونشن کے موقع پر اس فورم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ یہ مدرسہ مسلمانوں کی ضرورت تو یقیناً ہے، لیکن مغرب سنجیدگی سے غور کرے تو جنوبی ایشیا کا یہ آزاد دینی مدرسہ خود مغرب کی بھی ضرورت ہے۔ وہ اس طرح کہ مغرب نے اب سے تین صدیاں قبل آسمانی تعلیمات سے بغاوت اور وحی الٰہی کی پابندی سے آزادی کے جس فکر و فلسفہ کی بنیاد رکھی تھی اور ایک نئی آزاد ثقافت کا آغاز کیا تھا، اس کے تلخ ثمرات دنیا کے سامنے آ رہے ہیں اور خود مغرب کی درس گاہوں میں آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کے راستے تلاش کیے جا رہے ہیں۔ یہ ایک موجود حقیقت ہے جس پر کئی شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی ہم مسلمانوں کے ہاں تو واحد آپشن کی حیثیت رکھتا ہی ہے مگر مغرب کے لیے بھی وہ ایک آپشن ہے اور

جلد یا بدیر مغرب کو اس آپشن کو اختیار کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، بلکہ مجھے تو تاریخ کی پیشانی پر مستقبل کے حوالے سے یہ فیصلہ لکھا ہوا صاف نظر آتا ہے کہ نسل انسانی کا مستقبل آسمانی تعلیمات سے وابستہ ہے اور انسانی سوسائٹی کو بالآخر وحی الٰہی کی طرف واپس پلٹنا ہو گا اور جب تاریخ اس مرحلے پر پہنچے گی تو آسمانی تعلیمات کا اوریجنل اور محفوظ ذخیرہ اسے ان مدارس کے سوا کہیں اور سے نہیں ملے گا اور یہی مدارس نسل انسانی کی راہنمائی کے فکری سرچشمے ثابت ہوں گے۔ اس حوالے سے مغرب سے میری گزارش ہے اور اس کے لیے میرا پیغام ہے کہ وہ آنے والے دور کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس دینی مدرسے کی کردار کی ضرورت کو محسوس کرے اور اس آپشن کا دروازہ بند کرنے کی کوششوں میں وقت ضائع نہ کرے، کیونکہ یہ دینی مدرسہ صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ مستقبل کے ایک آپشن کے حوالے سے خود مغرب کی بھی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب پوری دنیائے انسانیت ان دینی مدارس کے اس کردار کی معترف اور شکر گزار ہوگی کہ انہوں نے انسانی سوسائٹی کے لیے آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کے محفوظ اور اوریجنل ذخیرہ کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اسے نسل در نسل منتقل کرنے کا کردار بھی کامیابی کے ساتھ ادا کیا، اور یہی آج کے عالمی تناظر میں اس مدرسہ کا صحیح کردار ہے۔"

بہر حال وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا یہ کنونشن اپنے عنوان کے حوالے سے گزشتہ دو سالوں کے دوران میں وفاق کے امتحانات میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات میں تقسیم انعامات کی تقریب تھی مگر جیسا کہ ہم اس کالم میں کنونشن کے انعقاد سے قبل عرض کر چکے ہیں، موجودہ معروضی حالات اور عالمی تناظر میں اس کنونشن کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور وہ یقیناً دینی مدارس کی جدوجہد میں ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز ثابت ہو گا۔

(روزنامہ اسلام، ۲۰/ مئی ۲۰۰۵ء)

وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کا ایک خوش آئند فیصلہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس شوریٰ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کو مزید پانچ سال کے لیے وفاق کا صدر اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کو سیکرٹری جنرل منتخب کرلیا ہے۔ وفاق کی مجلس شوریٰ کے اجلاس سے قبل بعض حلقوں کی طرف سے دونوں رہنماؤں کے خلاف ایک مہم بھی چلائی گئی تھی جس کا مقصد انہیں سنگین الزامات کا ہدف بنا کر وفاق کی قیادت میں تبدیلی لانا نظر آتا تھا۔ اس مہم کا دائرہ ملک گیر سطح پر خط و کتابت کے ساتھ ساتھ بعض اخبارات تک وسیع ہوا اور بعض دوستوں نے مجھ سے بھی رابطہ قائم کر کے مشورہ چاہا۔ میں نے گزارش کی کہ شکایات و اعتراضات پر اجلاس میں کھل کر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اس مرحلہ پر جبکہ دینی مدارس کے خلاف عالمی مہم مختلف پینترے بدل رہی ہے اور اس بین الاقوامی یلغار کا وفاق کی موجودہ قیادت بڑی حکمت عملی کے ساتھ کامیابی سے سامنا کر رہی ہے، اس موقع پر وفاق کی قیادت میں کوئی تبدیلی اب تک کی کامیابیوں کو مشکوک بنا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسی کسی مہم کا اخبارات تک اپنے دائرہ کو وسیع کرنا بھی اچھے نتائج کا حامل نہیں ہوگا اور اس کا دینی مدارس کے مجموعی ماحول کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال مجلس شوریٰ نے قیادت کے سابق تسلسل کو قائم رکھنے کا جو فیصلہ کیا ہے، وہ حکمت اور تدبر کا حامل ہے اور اس پر وفاق المدارس العربیہ کی قیادت اور مجلس شوریٰ دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا قیام حضرت علامہ شمس الحق افغانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ جیسے اکابر کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا اور ابتدا میں اس کا مقصد یہ تھا کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام اور امتحانات کے یکساں معیار کے حوالہ سے باہمی ربط و مشاورت کا کوئی نظم قائم ہوجائے، چنانچہ دونوں مقاصد میں وفاق نے مسلسل پیشرفت کی اور نصاب میں ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ مشترکہ امتحانی نظام کی داغ بیل بھی ڈالی گئی

جس کے لیے حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کی کاوشیں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں اور یہ نظام رفتہ رفتہ ترقی کر کے آج ایک معیاری اور منظم و مربوط امتحانی نیٹ ورک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان دیوبندی مکتب فکر کے مدارس و مکاتب کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ اس کے بعد بریلوی مکتب فکر، اہل حدیث مکتب فکر، اور شیعہ مکتب فکر کے مدارس نے اسی طرز پر اپنے اپنے وفاق قائم کیے اور جماعت اسلامی نے بھی اپنے حلقہ کے مدارس کو ایک الگ وفاق کی صورت میں باہم مربوط کر لیا۔ ان وفاقوں کا بنیادی مقصد تعلیمی نصاب و نظام میں ہم آہنگی کا مشترکہ معیار و نظم تھا۔ بعد میں ایک مرحلہ پر مدارس کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کی جدوجہد بھی ان وفاقوں کے ایجنڈے میں شامل ہو گئی۔ ۱۹۷۴ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن جاری کیا اور مدرسہ معراج العلوم بنوں کے خلاف بھی اسی نوعیت کی کارروائی عمل میں لائی گئی تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ حکومت ان دو مدارس کو تحویل میں لینے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے لیے دوسرے مدارس کو سرکاری تحویل میں لینا آسان ہو جائے گا اور دینی مدارس کے آزادانہ کردار و تشخص کو ختم کرنے کی راہ ہموار ہو گی۔ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے دوسرے مکاتب فکر کے مدارس کے وفاقوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور اس وقت موجود تمام وفاقوں نے متحد ہو کر دینی مدارس کی انتظامی و مالی خود مختاری اور آزادانہ و جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر گوجرانوالہ میں بھی یہ تحریک جاری رہی اور سینکڑوں علماء کرام اور کارکنوں نے احتجاجی گرفتاریاں پیش کیں۔ راقم الحروف بھی اس تحریک میں کم و بیش ساڑھے تین ماہ گوجرانوالہ جیل میں رہا۔ مدرسہ معراج العلوم بنوں نے بھی مولانا صدر الشہید ایم این اے کی قیادت میں، جو اس دینی درس گاہ کے بانی و مہتمم تھے، مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ مولانا مفتی محمود نے قومی اسمبلی میں اور علامہ رحمت اللہ ارشد نے پنجاب اسمبلی میں مؤثر آواز اٹھائی جس کے نتیجے میں حکومت کو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ اس سلسلے میں مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں نے جو متحدہ محاذ قائم کیا، اس کے سربراہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور سیکرٹری جنرل جامع نظامیہ رضویہ لاہور کے مولانا مفتی عبد

القیوم ہزاروی چنے گئے اور لاہور میں ایک بڑا کنونشن ہوا۔

اس پس منظر میں جب موجودہ حکومت کی طرف سے دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے نام پر سرکاری کنٹرول میں لینے کی بات کی گئی ور عالمی سطح پر بھی دینی مدارس کے آزادانہ کردار اور جداگانہ تشخص کو ہدف تنقید بنایا جانے لگا تو وفاق المدارس العربیہ نے دینی مدارس کے تمام وفاقوں کو پھر یک جا کر لیا اور ''اتحاد تنظیمات مدارس'' وجود میں آیا جس نے دینی مدارس کی آزادی اور خودمختاری کے خلاف قومی اور عالمی سطح پر سامنے آنے والی اس نئی یلغار کا کامیابی کے ساتھ سامنا کیا اور بالآخر حکومت کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میرے خیال میں اس کامیابی کی پشت پر جہاں تمام وفاقوں کا اتحاد اور اشتراک عمل ایک مضبوط قوت کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں حضرت مولانا سلیم اللہ خان دامت برکاتہم کی مدبرانہ قیادت اور مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کی شبانہ روز محنت کا بھی اس میں بہت بڑا حصہ ہے۔

اس تناظر میں اس قیادت کا مزید پانچ سال کے لیے وفاق کی باگ ڈور سنبھالنا ایک خوش آئند فیصلہ ہے جس سے ہر اس شخص کو اطمینان حاصل ہوا ہے جو وفاق کی گزشتہ تاریخ سے آگاہی رکھتا ہے اور مستقبل کے خدشات پر بھی اس کی نظر ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہم وفاق کی قیادت سے یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ آنے والا دور پہلے سے زیادہ کٹھن اور مشکل ہو گا۔ دینی مدارس کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے خلاف یلغار سرِدست رک گئی ہے، لیکن یہ صرف پینترا بدلنے والی بات ہے۔ ان قوتوں کا ایجنڈا بدستور قائم ہے اور وہ مختلف طریقوں اور حیلوں سے اس ایجنڈے کو آگے بڑھانے کی وقتاً فوقتاً کوشش کرتی رہیں گی کیونکہ جو قوتیں دینی مدارس کی اس حیثیت اور کردار کو اپنے عزائم اور پروگرام کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتی ہیں، ظاہر ہے وہ اپنے عزائم اور پروگرام سے ہٹنے کے لیے تو تیار نہیں ہوں گی اور جب بھی موقع ملا، شب خون مارنے سے گریز نہیں کریں گی، اس لیے وفاقوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا اور باہمی اعتماد و اشتراک میں اضافہ کرتے چلے جانا اس مقصد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

وفاق المدارس العربیہ کی مجلس شوریٰ نے مذکورہ اجلاس میں نصاب میں بھی کچھ جزوی تبدیلیاں کی ہیں اور چند برسوں سے یہ روایت سی بن گئی ہے کہ کم و بیش شوریٰ کے ہر اجلاس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی

نصاب کے حوالہ سے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی افادیت و ضرورت سے انکار نہیں ہے مگر اس طرح کی بار بار تبدیلیوں سے مدارس کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ تجربہ کار مدرسین پر مشتمل ایک مستقل نصابی بورڈ تشکیل دیا جائے جو پورے نصاب کا جائزہ لے اور یہ جائزہ ایک دو اجلاسوں کی صورت میں نہ ہو بلکہ کم از کم ایک سال تک اس انداز کا مباحثہ جاری رہے کہ مختلف شہروں میں پرانے مدرسین اور ماہرین تعلیم کے علاقائی سطح پر سہ روزہ اجتماعات منعقد کیے جائیں، مسائل اور ضروریات پر کھلے دل سے بحث کی جائے اور تجاویز سامنے لائی جائیں اور پھر ان تجاویز کو سامنے رکھ کر نصابی بورڈ اپنی سفارشات مرتب کرے اور مجلس شوریٰ ان میں سے جن سفارشات کو منظور کرے، ان کے مطابق نصاب میں ردوبدل کیا جائے لیکن نصاب میں جو ترمیم یا ردوبدل کیا جائے، کم از کم پانچ سال تک اس کے نتائج کا انتظار ضرور کیا جائے۔ اس طرح ہر سال تبدیلی کرنا آسانی کے بجائے مشکلات کا باعث بنتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور پرانی تجویز کا اعادہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ وفاق کو دینی مدارس کے سینئر اساتذہ کی ایک مستقل سالانہ ورکشاپ کا اہتمام کرنا چاہیے جو تعطیلات کے دوران میں کسی بڑے جامعہ میں منعقد کی جائے۔ اس کا دورانیہ چار سے سات روز کا ہو اور ملک بھر سے انتخاب کر کے کم از کم اڑھائی تین سو اساتذہ کو جمع کیا جائے، ان کے سامنے مسائل و ضروریات کی فہرست رکھی جائے، ان سے رائے لی جائے انہیں معروضی حالات اور وقت کی ضروریات کے بارے میں بریف کیا جائے اور چوٹی کے ماہرین تعلیم کو زحمت دے کر ان سے متعیّن عنوانات پر بیانات کرائے جائیں۔ اس سے اساتذہ کو حالات اور ان کے تقاضوں سے آگاہی ہوگی اور وفاق کی قیادت بھی اساتذہ کے ذہنی رجحانات اور ان کی مشکلات و مسائل سے باخبر رہے گی۔ امید ہے کہ وفاق کی قیادت ان گزارشات کا سنجیدگی سے جائزہ لے گی اور اس کی راہنمائی میں دینی مدارس اپنے مشن اور پروگرام میں مسلسل پیشرفت کرتے رہیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، ۲۴/ جنوری ۲۰۰۵ء)

نفاذ شریعت کے لیے جامعہ حفصہ کا اقدام

۲۰ فروری کو راولپنڈی پہنچ کر سواں کیمپ کے "ہمراہی ٹریول" کے اڈے سے جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر کے لیے ٹیکسی پر جا رہا تھا کہ گوجرانوالہ سے ہمارے ایک صحافی دوست طاہر قیوم چودھری نے موبائل فون پر بتایا کہ محترمہ ظل ہما عثمان کو کھلی کچہری کے دوران میں گولی مار دی گئی ہے اور انہیں انتہائی نازک حالت میں لاہور لے جایا گیا ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ خبر نہ ملی۔ بہت پریشانی ہوئی اور اسی پریشانی کے عالم میں جامعہ اسلامیہ پہنچا جہاں مولانا قاری سعید الرحمٰن اور دیگر احباب منتظر تھے۔ ان کے ساتھ جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات کی طرف سے سرکاری لائبریری پر قبضے کے تسلسل سے پیدا ہونے والی صورت حال پر گفتگو کے لیے میں نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔

جامعہ حفصہ للبنات اسلام آباد کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب مولانا عبد اللہ شہید کا قائم کردہ طالبات کا دینی مدرسہ ہے جہاں کم و بیش چھ ہزار کے لگ بھگ طالبات درس نظامی کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اس حوالے سے یہ طالبات کے مدارس میں ملک کا سب سے بڑا مدرسہ شمار ہوتا ہے جس کے مہتمم مولانا عبد اللہ شہید کے فرزند و جانشین مولانا عبد العزیز ہیں جو اپنے بھائی مولانا عبد الرشید غازی کے ساتھ مل کر جامعہ حفصہ کے ساتھ ساتھ اسلام آباد کے ایک اور بڑے دینی مدرسے جامعہ فریدیہ کا انتظام بھی چلا رہے ہیں۔ ان بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے تحریکی ذوق بھی خوب عطا کر رکھا ہے اور اس پس منظر میں وہ مختلف مواقع پر آزمائش کا سامنا بھی کر چکے ہیں۔ ان کی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ پاکستان میں جس قدر جلد ممکن ہو، اسلامی نظام مکمل طور پر نافذ ہو جائے اور اس کے لیے وہ ہمہ وقت کسی بھی آزمائش کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

کم و بیش ایک ماہ قبل اسلام آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے مسجد امیر حمزہ کو غیر قانونی قرار دے کر شہید کر دیا اور ایک دوسری مسجد کی شہادت کی کارروائی شروع کی، جبکہ بعض دیگر مساجد کو مسمار کرنے کے نوٹس بھی جاری کیے گئے۔ اس پر راولپنڈی اور اسلام آباد کے علماء کرام نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور

مسجد گرائے جانے کے دوسرے روز سینکڑوں علماء کرام مسجد امیر حمزہ کے ملبے پر جمع ہو گئے، وہاں ملبے پر نماز باجماعت ادا کی اور مسجد کو دوبارہ تعمیر نو کرنے کے لیے آپس میں چندہ کر کے تعمیر نو کا اعلان کر دیا۔ ان علماء کرام کا موقف یہ تھا کہ یہ مسجد قدیم دور سے چلی آ رہی ہے اور اسے غیر قانونی قرار دینے کے بارے میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا موقف درست نہیں ہے، اس لیے شرعاً اس مسجد کی اسی جگہ دوبارہ تعمیر ضروری ہے، چنانچہ انہوں نے سی ڈی اے کے اقدام کو مسترد کرتے ہوئے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر سی ڈی اے اور علماء کرام کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا، مگر اسی دوران میں جامعہ حفصہ کی طالبات نے مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے ساتھ واقع ایک سرکاری لائبریری پر، جو بچوں کے لیے ایک عرصہ سے قائم ہے، قبضہ کر لیا اور مولانا عبدالعزیز کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ یہ قبضہ اجتماعی طور پر کیا گیا ہے اور جب تک گرائی جانے والی مسجد دوبارہ تعمیر نہیں کی جاتی اور جن دیگر مساجد کو گرانے کے نوٹس دیے گئے ہیں، وہ واپس نہیں لیے جاتے، چلڈرن لائبریری کا قبضہ واگزار نہیں کیا جائے گا۔

نوجوان باپردہ طالبات کی ڈنڈا بردار فورس نے لائبریری کا کنٹرول سنبھال لیا اور اسے آمد ورفت کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس پر حکومتی حلقے اور اعلیٰ انتظامی افسران بھی حرکت میں آئے اور بظاہر یہ صورت نظر آنے لگی کہ حکومت بہرحال اس قبضے کو ختم کرانے کے لیے اقدام کرے گی، جبکہ اس کی مزاحمت طالبات کی طرف سے ہو گی جو ہزاروں کی تعداد میں جامعہ حفصہ کے ہاسٹل میں موجود ہیں، اس طرح تصادم کی ایک افسوس ناک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ طالبات کی طرف سے اپنے مطالبات میں اسلامی نظام کے مکمل اور فوری نفاذ کو شامل کرنے سے اس تحریک کو ملک گیر شکل مل گئی۔ مولانا عبدالعزیز کی اپیل پر ملک کے مختلف حصوں سے دینی مدارس کے طلبہ اور دینی کارکنوں نے مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کا رخ کرنا شروع کیا اور ہزاروں افراد وہاں جمع ہو گئے۔

جہاں تک اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کے بارے میں جامعہ حفصہ کی طالبات کے موقف کا تعلق ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے کی بات ہے، اس سے ملک بھر کے دینی حلقوں نے اصولی طور پر اتفاق کا اظہار کیا، لیکن وفاقی دارالحکومت میں سرکاری فورسز کے ساتھ دینی کارکنوں، طلبہ، بالخصوص طالبات کے تصادم کے جو امکانات واضح نظر آنے لگے تھے، ان سے ملک

بھر میں پریشانی اور اضطراب کا پیدا ہونا بھی ایک فطری امر تھا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کے علماء کرام نے حکومتی حلقوں سے مذاکرات کے ذریعے سے اس مسئلے کو حل کرانے کی مقدور بھر کوشش کی اور مساجد کی حد تک حکومت سے اپنا موقف منوانے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ مسجد امیر حمزہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کا اعلان کر کے وفاقی وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق نے علماء کرام اور پریس کی موجودگی میں اس کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا، جبکہ دیگر مساجد کے لیے سرکردہ علماء کرام کے ساتھ انتظامیہ اور سی ڈی اے کے اشتراک سے ایک کمیٹی کے جناب محمد اعجاز الحق کے علاوہ وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ سے طویل مذاکرات ہوئے اور سرکردہ علماء کرام کے ایک وفد نے وزیر اعظم جناب شوکت عزیز سے بھی ملاقات کی۔ اس طرح اسلام آباد کی مساجد کی حد تک وہاں کے علماء کرام کی منشا کے مطابق مسئلہ اصولی طور پر حل ہو گیا جو بلاشبہ جامعہ حفصہ کی طالبات کی جدوجہد کا ایک اچھا ثمر ہے۔

اس دوران میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی اعلیٰ قیادت اسلام آباد آئی اور مولانا سلیم اللہ خان، مولانا حسن جان، مولانا تقی عثمانی، مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا قاری سعید الرحمٰن، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ اور مولانا انوار الحق حقانی سمیت سرکردہ علماء کرام نے اس مسئلے کو حل کرانے میں سرگرم کردار ادا کیا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود مسئلے کے حل میں یہ رکاوٹ موجود رہی، جو تادم تحریر اب بھی موجود ہے، کہ جامعہ حفصہ کی طالبات نے دوسرے مطالبات کی منظوری تک، جن میں اسلامی نظام کا مکمل اور فوری نفاذ سر فہرست ہے، سرکاری لائبریری پر قبضہ واگزار کرنے سے انکار کر دیا، جبکہ مولانا عبد العزیز اس بات پر مصر چلے آ رہے ہیں کہ ملک میں مکمل شرعی نظام کے نفاذ تک وہ اس ماحول کو ختم نہیں کریں گے جسے سنجیدہ حلقے سرکاری فورسز کے ساتھ دینی کارکنوں اور طالبات کے تصادم کے شدید خطرے کا باعث سمجھ رہے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ باشعور دینی حلقوں کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ اس پس منظر میں مولانا قاری سعید الرحمٰن کے پاس برادرم مولانا عبد الحق خان بشیر امیر پاکستان شریعت کونسل پنجاب، مولانا احسان اللہ فاروقی اور حاجی جمال دین کے ہمراہ حاضری ہوئی تاکہ صورت حال معلوم کر سکیں۔ مولانا قاری سعید الرحمٰن کے علاوہ ہم نے ان مذاکرات اور تگ و دو میں شریک ایک اور بزرگ مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی سے بھی ملاقات کی اور ان سے اس حوالے سے معلومات حاصل کیں۔

ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ہم بھی اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ جہاں تک اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے کا تعلق ہے، وہ ہم سب کا متفقہ مطالبہ ہے، بلکہ قیام پاکستان کا بنیادی مقصد ہے اور دستور پاکستان نے اس کی گارنٹی دے رکھی ہے۔ لیکن اس کے لیے قانون کو ہاتھ میں لینا اور سرکاری فورسز کے ساتھ تصادم کی صورت اختیار کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ جامعہ حفصہ اسلام آباد کی طالبات اور انتظامیہ کو اس سلسلے میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت مولانا عبد الرزاق اسکندر اور حضرت مولانا شیر علی شاہ صاحب جیسے بزرگ اکابر کی اپیل قبول کرتے ہوئے سرکاری لائبریری کا قبضہ واگزار کر دینا چاہیے اور تصادم و محاذ آرائی کا ماحول ختم کر کے مذاکرات اور عوامی جدوجہد کے ذریعے سے اس سلسلے میں مزید پیشرفت کرنی چاہیے، کیونکہ بہرحال حکمت و دانش کا تقاضا یہی ہے۔

اسی دوران میں یہ خبر ملی کہ گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والی خاتون صوبائی وزیر ظل ہما عثمان، جنہیں قاتلانہ حملے کے بعد لاہور لے جایا گیا تھا، جاں بحق ہو گئی ہیں اور ان کو قتل کرنے والا شخص پکڑا گیا ہے جس نے برملا طور پر یہ کہا ہے کہ اس نے خاتون صوبائی وزیر کو اس لیے قتل کیا ہے کہ وہ عورت کی حکمرانی کو جائز نہیں سمجھتا اور اس طرح بے پردہ پھرنے کو پسند نہیں کرتا، اس لیے اس نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سے اسلام آباد کے حالات سے ذہن میں پیدا ہونے والی تشویش دو چند ہو گئی کہ اسلام کے نام پر اور اسلام کے لیے ملک کے اندر اس طرح تصادم کا ماحول پیدا کرنے اور قوت استعمال کرنے کا رجحان ہمارے ہاں کیا کیا گل کھلا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس ملک اور قوم کی حفاظت کی دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

یہ صاحب اس سے قبل بدکاری کے الزام میں کئی عورتوں کو قتل کر چکے ہیں اور اس کا اعلان ہے کہ وہ آئندہ بھی اس طرح بے ہودہ عورتوں کو قتل کرتا رہے گا۔ اس طرز عمل کو جنون اور نفسیاتی مرض کے سوا کسی اور عنوان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کسی طرح بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ کوئی شخص شریعت کے خلاف ہونے والے کسی عمل پر خود فیصلہ کرنے بیٹھ جائے اور ہتھیار اٹھا کر لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دے۔ احتجاج کی حد تک جذبات کے اظہار کے لیے معروف طریقے سے کوئی قدم اٹھانے کی بات الگ ہے کہ اس کی ہر مہذب ملک میں آج بھی

گنجائش اور جواز موجود ہے، لیکن کسی کو جان کو خطرے میں ڈالنا، قتل کرنا، زخمی کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لے لینا کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ مرحومہ ظل ہما عثمان بے پردگی کی کس حد تک مرتکب تھیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس سے کہیں آگے کے مرحلے کے لیے ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو عین بدکاری کی حالت میں دیکھے تو کیا وہ اسے قتل نہیں کرے گا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایسی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور قانون کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔

بہرحال اسلام آباد میں اسلامی نظام کے لیے سرکاری فورسز کے ساتھ تصادم کا ماحول ہو یا گوجرانوالہ میں خاتون صوبائی وزیر کا بے پردگی کے عنوان سے قتل کا افسوسناک سانحہ ہو، اس انتہا پسندی پر افسوس کا اظہار ضروری ہے اور اسے روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب نفاذ اسلام کے تمام دستوری راستے بند کر دیے گئے ہوں، پیشرفت کے بجائے ''ریورس گیئر'' کا ماحول قائم کر دیا گیا اور مغربی ثقافت کے فروغ کے لیے تمام ریاستی وسائل استعمال ہو رہے ہوں، وہاں اس قسم کی افسوس ناک انتہا پسندی کو جنم لینے سے آخر رو کا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ یہی اہل دانش و بینش کے لیے غور طلب نکتہ ہے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۲۶ر فروری ۲۰۰۷ء)

یہ راستہ شریعت کے مطابق نہیں

لال مسجد اسلام آباد کے حوالے سے درپیش مسئلہ زیادہ سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف حکومتی حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ اگر مفاہمت کا کوئی راستہ نہ نکلا تو آپریشن ناگزیر ہو جائے گا اور دوسری طرف لال مسجد کے خطیب مولانا عبد العزیز نے ملک بھر میں اپنے ہم خیال حضرات سے رابطے شروع کر دیے ہیں اور ان کی طرف سے مدارس کے طلبہ کو دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ اسلام آباد پہنچیں اور وہاں کی مختلف مساجد میں اعتکاف بیٹھیں جس سے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اسلام آباد میں جمع کر کے حکومت پر دباؤ بڑھایا جائے تاکہ وہ ایکشن سے گریز کرے۔ آج اس سلسلہ میں ایک وفد نے مولانا عبد العزیز کی طرف سے مجھ سے بھی ملاقات کی اور ایک عمومی خط کی کاپی مجھے دی جو ملک بھر کے علماء کرام کے نام ہے۔ خط کا متن درج ذیل ہے:

"بخدمت جناب مولانا ——————— صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعد صد آداب و تسلیمات گزارش ہے کہ ہمارا ملک اسلام کے لیے لاکھوں انسانوں کی قربانیوں سے بنا تھا۔ ان ساٹھ سالوں میں علماء کرام اور بزرگان دین اپنی بساط کے مطابق ملک میں اسلامی نظام لانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن جہاد کا راستہ اختیار نہ کرنے کی وجہ سے آج تک کماحقہ نتائج نہ مل سکے۔ اور آج ملک ڈاکہ، قتل و غارت گری، فحاشی و عریانی اور بدامنی کی لپیٹ میں ہے۔ ملک میں ۵ لاکھ سے زائد بدکاری کے اڈے ہیں جن میں ایک کروڑ سے زائد بہنوں کی یومیہ عصمت دری ہوتی ہے۔ شراب اور جوئے کے اڈے اس کے علاوہ ہیں۔ تو خدارا سوچیے ہمارے اس ملک کا کیا بنے گا؟ اگر ہم نے اب بھی مؤثر کردار ادا نہیں کیا اور جہاد کا راستہ اختیار نہ کیا تو کہیں اللہ کا عذاب نہ آ جائے۔

جامعہ فریدیہ کے طلبہ اور جامعہ سیدہ حفصہ کی طالبات نے اسلام آباد میں عرصہ ۱۳

سال سے قائم بدکاری کا اڈہ جس کو پولیس والے، سارے علاقہ والے جانتے ہیں اور سارے کرائم رپورٹرز کو معلوم ہے، ۱۹۹۸ء میں تھانہ آب پارہ میں اس پر مقدمہ بھی دائر ہوا اور بار بار محلہ والے درخواستیں دیتے رہے، لیکن اس پر عمل نہ ہوا۔ اس اڈے میں یومیہ ۱۵۰ سے زائد مرد آتے تھے اور بہنوں کی عصمت دری کرتے تھے۔ طالبات ان عورتوں کو سمجھانے کے لیے اندر گئیں اور طلبہ باہر رہے۔ اس عورت نے طالبات کے سمجھانے پر دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ طالبات اس کو سمجھا کر واپس آگئیں، لیکن پھر بھی وہ عورت اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی۔ اس پر طالبات نے دوبارہ کارروائی کی اور ان عورتوں کو یہاں لایا گیا اور سمجھا کر توبہ کرنے پر چھوڑ دیا گیا۔ اس بات پر حکومت کو بہت غصہ ہے۔ حکومت، بدکاری کے اڈے چلانے والے اور ان کی سرپرستی کرنے والے سارے متحد ہو گئے ہیں کہ جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن ۴/اپریل کو ضرور کریں گے۔ باطل ایک بدکار عورت کے لیے اتنا حساس ہے تو ہم دین داروں کو بھی متحد ہو جانا چاہیے، اور ہم دین والے حق پر ہوتے ہوئے بھی نہ اٹھے تو قیامت کے دن اللہ اور اس کے رسول کو کیا جواب دیں گے؟

اس لیے طلبہ و دیگر حضرات بغیر اسلحہ کے اپنا بستر و خرچہ اور جماعت بڑی ہونے کی صورت میں ایک ایک لاٹھی بھی ساتھ لے کر پندرہ اور چالیس دنوں کے لیے جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کریں اور اسلام آباد کی مساجد میں اعتکاف کریں، تاکہ نفاذ شریعت کا کام تیز کر سکیں اور بدکاری کے اڈوں کے خلاف مؤثر کارروائی کر سکیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی التماس ہے کہ اگر راستہ میں روکا جاتا ہے یا لاٹھی چارج ہوتا ہے تو اس صورت میں کسی کی ذاتی املاک]کو نقصان پہنچانے[اور گھیراؤ جلاؤ کی اجازت نہیں۔ پولیس والوں سے تھوڑی بہت مزاحمت کر سکتے ہیں، لیکن اتنی مزاحمت نہیں کہ جس سے جان کو خطرہ ہو۔ اس کی نسبت ہم جیل جانا اختیار کریں اور وہاں جہاد کی فضا بنائیں۔

جو علماء کہتے ہیں کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں، ان کے پاس بھی ان بدکاری کے اڈوں کو بند کرانے کے لیے کوئی مؤثر طریقہ نہیں۔ اسی طرح جو کہتے ہیں کہ جمہوری راستہ سے کام کرنا چاہیے، ان کے پاس بھی کوئی مؤثر طریقہ اور راستہ نہیں جس کو اختیار کرتے ہوئے ان بدکاری اور جوئے کے اڈوں کو بند کرایا جائے۔ ہم نے نفاذ اسلام اور جہاد کے لیے جامعہ

فریدیہ میں ۱۵/ یوم کی چھٹیاں کی ہیں۔ آپ حضرات سے بھی گزارش ہے کہ اپنے مدارس میں کم سے کم ۵ دنوں کی چھٹیاں کریں تاکہ طلبہ اپنے اپنے علاقے میں محنت کر کے زیادہ سے زیادہ جماعتیں لے کر نفاذ اسلام کانفرنس اور سہ روزہ اعتکاف میں شریک ہو سکیں۔

اس لیے تمام علماء کرام سے گزارش ہے کہ آپ خود بھی فوری طور پر تشریف لائیں اور طلبہ کو بھی روانہ فرمائیں، لیکن وہ جو اپنا خرچہ اپنا بستر لا سکتے ہوں۔

مولانا محمد عبدالعزیز"

(نوٹ: یہ خط انہوں نے جس کانفرنس کے لیے لکھا تھا، وہ منعقد ہو چکی ہے)

میں نے ان سے گزارش کی ہے کہ مجھے اس دعوت اور موقف سے اتفاق نہیں ہے، اس لیے میں اس سلسلہ میں کوئی تعاون نہیں کر سکتا۔ ان کے اصرار پر میں نے عرض کیا کہ اپنا موقف تفصیل کے ساتھ اپنے کالم میں لکھ چکا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام آباد کی مساجد کے تحفظ، منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر، ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، معاشرہ میں فواحش و منکرات کے سدِباب اور مغرب کی عریاں ثقافت کے فروغ کی روک تھام کا تعلق ہے، ان مقاصد سے کسی ذی شعور مسلمان اور پاکستانی کو اختلاف نہیں ہو سکتا اور اس سلسلہ میں کوئی بھی معقول کوشش ہو تو اس کی حمایت و تعاون ہمارے فرائض میں شامل ہے بلکہ اس حوالہ سے معروف طریقوں سے احتجاج کے اظہار اور رائے عامہ کو منظم کرنے کی جدوجہد کی اہمیت و افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ ملک کے شہریوں کا دستوری اور جمہوری حق ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کریں اور احتجاج و اضطراب کا ہر وہ طریقہ اختیار کریں جو ہمارے ہاں معمول اور روایت کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر قانون کو ہاتھ میں لینے، حکومت وقت کے ساتھ تصادم کا راستہ اختیار کرنے اور کوئی متوازی سسٹم قائم کرنے کی حمایت نہیں کی جا سکتی، کیونکہ یہ شرعاً خروج کہلاتا ہے جس کے لیے فقہائے کرام نے کڑی شرائط عائد کی ہیں، اس لیے لال مسجد کی طرف سے جدوجہد کا جو طریق کار طے کیا گیا ہے اور جو دائرہ اس خط میں بتایا گیا ہے، وہ قانوناً، اخلاقاً اور شرعاً درست نہیں ہے اور میری لال مسجد کے احباب سے گزارش ہے کہ وہ اس پر اصرار کرنے کے بجائے اپنے طریق کار پر نظر ثانی کریں کیونکہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ اپنے مضمرات اور نتائج دونوں حوالوں سے اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے فائدہ مند ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو گا۔

اس خط میں یہ کہا گیا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام اس لیے نافذ نہیں ہو سکا کہ اس کے لیے جہاد کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لال مسجد کے حضرات کے نزدیک ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتہائی خطرناک غلطی ہے جس کے نتائج کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں قیام پاکستان کے بعد تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیر صدارت مشترکہ اجلاس میں اسلامی دستور کے ۲۲ نکات مرتب کر کے یہ فیصلہ بالکل آغاز ہی میں کر لیا تھا کہ پاکستان میں نفاذ اسلام دستور کے ذریعے سے ہوگا اور اس کے لیے جمہوری عمل کو ذریعہ بنایا جائے گا۔ یہ چند علماء کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ اس اصول پر پاکستان کے جمہور علماء کرام کے اتفاق رائے اور اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد اسی فیصلے کی بنیاد پر نفاذ اسلام کی جدوجہد دستوری اور جمہوری عمل کے ذریعے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کے تناسب اور اس کے اسباب و عوامل کی بحث اپنی جگہ اہم ہے، لیکن کامیابی میں تاخیر یا رکاوٹوں کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک اصولی اور متفقہ فیصلے کو نظر انداز بلکہ کراس کر کے کوئی جذباتی راستہ اختیار کر لیا جائے۔ میں لال مسجد کی موجودہ مہم کی قیادت کرنے والوں اور ان کی حمایت کرنے والوں سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ جذبات کی فضا سے باہر نکل کر زمینی حقائق اور معروضی صورت حال کے ادراک کے ساتھ صورت حال کا جائزہ لیں کیونکہ ملک میں نفاذ اسلام کے لیے حکومت وقت کے خلاف جہاد کا اعلان شرعی اصطلاح میں ''خروج'' کہلاتا ہے جو نہ صرف ۳۱ علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات سے انحراف ہے بلکہ ملک کی دینی جدوجہد کے گزشتہ ساٹھ سال کے اجتماعی تعامل کی نفی کے مترادف ہے جس کی کسی بھی شخص یا ادارے کو اجازت نہیں دی جا سکتی، اس لیے لال مسجد کے دوستوں کا ملک بھر کی علمی و دینی قیادت کے موقف اور مشورہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اس جذباتی موقف پر اصرار 'اعجاب کل ذی رای برایہ' کا مصداق ہے جسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ قرار دیا ہے اور اس فتنہ سے بہرحال علماء کرام کو بچنا چاہیے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۴/ اپریل ۲۰۰۷ء)

منکرات و فواحش کا فروغ اور ارباب دانش کی ذمہ داری

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دور میں تمام لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی تھی اور دنیا کی مذہبی قیادت و سیادت سے نوازا تھا، لیکن پھر انہی کو ملعون و مغضوب قرار دے دیا اور سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۷۸، ۷۹ کے مطابق اس کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی کہ 'کانوا لا یتناہون عن منکر فعلوہ'، وہ ایک دوسرے کو اس برائی سے روکتے نہیں تھے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدّد احادیث میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ سوسائٹی میں منکرات کے ارتکاب پر باہمی روک ٹوک کا باقی رہنا ضروری ہے، ورنہ پوری سوسائٹی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت اور عذاب کی مستحق قرار پاتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جس فریضہ کا قرآن مجید نے بار بار تذکرہ کیا ہے، وہ سوسائٹی میں نیکی کے فروغ اور برائی کی روک تھام کی یہی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج کی آیت ۴۱ میں مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری کے طور پر بیان فرمایا ہے اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اسے امت کی عمومی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے، اس لیے معاشرہ میں نیکیوں کا فروغ اور برائیوں کی روک تھام جہاں حکومت کے فرائض کا حصہ ہے، وہاں عوام کے فرائض میں بھی شامل ہے اور سوسائٹی کے تمام طبقات درجہ بدرجہ اس بات کے لیے مسئول ہیں۔

جس طرح ایک انسانی جسم کے اندر فطری طور پر جو قوت مدافعت موجود ہوتی ہے، وہ اگر قائم رہے تو جسم بڑی سے بڑی بیماری کا مقابلہ کر لیتا ہے، لیکن اگر وہ قوت مدافعت مضمحل یا ختم ہو جائے تو چھوٹی سی بیماری سے نمٹنا بھی جسم کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، یہی مثال سوسائٹی میں برائیوں پر باہمی روک ٹوک کے نظام کی ہے۔ اگر معروفات کی باہمی تلقین اور منکرات پر باہمی روک ٹوک کا سسٹم موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی منکرات کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہے اور خود کو ان سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن اگر یہ سسٹم کمزور پڑ جائے تو سوسائٹی کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے اور سوسائٹی خود کو کسی برائی سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتی ہے، اور

اگر کسی سوسائٹی میں نیکیوں کی باہمی تلقین اور برائیوں پر باہمی روک ٹوک کا سسٹم سرے سے ختم ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی نے برائیوں کو اجتماعی طور پر قبول کر لیا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب کوئی قوم قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق خدائی لعنت اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول عمومی عذاب کی مستحق بن جاتی ہے۔

گزشتہ دنوں لال مسجد اسلام آباد کی انتظامیہ کے رضا کاروں نے مبینہ طور پر ایک قحبہ خانے پر چھاپہ مار کر وہاں کی انچارج خاتون کو حراست میں لے لیا اور ابھی چند روز قبل ایک مساج پارلر کے کارندوں کو حراست میں لینے کے بعد اسلام آباد انتظامیہ کی اس یقین دہانی پر انہیں آزاد کیا کہ اسلام آباد میں مساج پارلروں کو بند کر دیا جائے گا۔ اس پر ملک بھر میں یہ سوال کھڑا ہو گیا کہ کیا اس طرح پرائیویٹ طور پر احتساب کا نظام قائم کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لے کر برائی کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنا درست عمل ہے؟ ملک بھر کے سنجیدہ حلقوں نے اس طرز عمل سے اختلاف کیا اور ہم نے بھی واضح طور پر عرض کیا کہ حکومت وقت کے ساتھ تصادم کا ماحول پیدا کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً کسی بھی لحاظ سے درست طرز عمل نہیں ہے اور لال مسجد کی انتظامیہ کو زود یا بدیر اس طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی، لیکن ہمارے خیال میں ابھی تک یہ بحث یک طرفہ طور پر چل رہی ہے اور معاملہ کے صرف ایک رخ پر مسلسل بات کی جا رہی ہے کہ برائیوں کی روک تھام کے لیے پرائیویٹ سطح پر کوئی کارروائی کرنا اور قانون کو ہاتھ میں لینا درست نہیں ہے، جبکہ اس معاملے کے دوسرے رخ پر توجہ دینے سے ہمارے دانش ور ابھی تک کترا رہے ہیں کہ معاشرہ میں منکرات کی روک تھام آخر کس کی ذمہ داری ہے؟ خصوصاً جب صورت حال یہ ہو گئی ہو کہ حکومتی ادارے فحاشی اور منکرات کی روک تھام کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کے بجائے خود ان کے فروغ کا ذریعہ بن رہے ہوں، سیاسی اور دینی جماعتوں نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہو اور سماجی اداروں کے ایجنڈے میں بھی یہ بات شامل نہ ہو تو کیا عملاً یہی صورت نہیں بن جاتی کہ سوسائٹی نے برائی کو اجتماعی طور پر قبول کر لیا ہے اور اس کا کوئی طبقہ برائی کی روک تھام کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کو تیار نہیں ہے؟ ہمارا یہ سوال ان طبقات اور ارباب دانش سے ہے جو قرآن و سنت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے موجود تعلیمات سے آگاہ ہیں کہ کیا منکرات و فواحش کے مسلسل فروغ پر سوسائٹی کی اجتماعی

خاموشی کی صورت حال کو قبول کر لیا جائے اور ایسی صورت میں قرآن و سنت میں جو وعیدیں وارد ہوئی ہیں، انہیں یکسر نظر انداز کر دیا جائے؟ اور کیا ارشاد ربانی 'کالذین نسوا اللہ فانساہم انفسہم' کا عملی منظر اسی طرح کا نہیں ہوتا؟

مساج پارلروں کا معاملہ ہی سامنے رکھ لیا جائے جن میں نوجوان اور نوعمر لڑکیاں مردوں کو مساج کرتی ہیں اور مساج کے نام پر بدکاری کا ایک وسیع نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں اس قسم کے بدکاری کے اڈوں کی موجودگی، ان کا فروغ اور ان پر حکومتی اداروں، دینی و سیاسی جماعتوں کی خاموشی اور سماجی اداروں کی لاتعلقی اور بے حسی کا ایک انتہائی افسوس ناک منظر سامنے ہے۔ اس صورت حال میں اگر ہمارے دانش ور صرف لال مسجد کی انتظامیہ کو ہی کوستے چلے جائیں کہ وہ غلط کر رہے ہیں، انہیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے اور از خود کسی کارروائی سے گریز کرنا چاہیے تو ہمارے نزدیک یہ بات صحیح ہونے کے باوجود ادھوری اور یک طرفہ ہے۔

لال مسجد کی انتظامیہ کے طریق کار کو ہم بھی غلط سمجھتے ہیں جس کا ہم نے برملا اظہار کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ رد عمل ہے منکرات و فواحش کے مسلسل فروغ پر حکومتی اداروں، دینی و سیاسی جماعتوں اور سماجی اداروں کی مجرمانہ خاموشی اور بے حسی کا جو منکرات و فواحش ہی کی طرح پیہم بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہم ارباب فکر و دانش سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ لال مسجد کی انتظامیہ کو اس کے غلط طریق کار پر ضرور ٹوکیں اور انہیں سمجھائیں کہ برائی کو روکنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارے دانشوروں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ قوم کو بتائیں کہ مسلم معاشرے کو منکرات و فواحش سے پاک رکھنا کس طرح ممکن ہے اور برائیوں کی روک تھام کے لیے حکومتی اداروں، دینی و سیاسی جماعتوں اور سماجی اداروں کی ذمہ داری کیا ہے؟ ورنہ اگر برائیوں پر باہمی روک ٹوک کا نظام ختم ہونے پر بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے مستحق ہو گئے تھے تو اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے ہمارے لیے کوئی استثنا موجود نہیں ہے کہ جس جرم پر اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر لعنت نازل فرما دی تھی، اسی جرم کے ارتکاب پر ہمیں وہ سزا نہیں دی جائے گی۔ اور پھر بات ”سزا دی جائے گی“ کی بھی نہیں ہے، ہم افراد سے لے کر قوم اور پوری ملت تک جس صورت حال سے دوچار ہو چکے

ہیں، کیا اس کے بعد کسی اور لعنت کا انتظار باقی رہ گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں صورت حال کے صحیح ادراک کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا اللہ العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۲۰۰۷ء)

غازی برادران کا غلط طرز عمل اور دینی مدارس کا مستقبل

مولانا عبد العزیز کی گرفتاری کے بعد لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا حکومت کے ساتھ تنازع ایک لحاظ سے اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے اور ان کے نائب مولانا عبد الرشید غازی کی طرف سے خود کو حکومت کے حوالے کرنے کی مشروط پیش کش نے حکومت کے ساتھ ان کی مسلح مزاحمت کے باقی ماندہ امکانات کو بھی ختم کر دیا ہے۔* جب ان دونوں بھائیوں نے چند ماہ قبل اپنے بعض مطالبات کے لیے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا، اس وقت ملک کے سنجیدہ دینی حلقوں اور ان کے خیر خواہوں کی طرف سے انہیں یہ کہہ دیا گیا تھا کہ حکومت کے ساتھ اس طرح کی محاذ آرائی کا طریقہ درست اور قابلِ عمل نہیں ہے، اس لیے وہ اسے ترک کر دیں اور ملک کی علمی و دینی قیادت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی مشاورت کے ساتھ اپنے مطالبات منوانے کے لیے جدوجہد کا طریق کار از سر نو طے کریں، لیکن انہوں نے کوئی بھی معقول بات ماننے کے بجائے خود اپنے طے کردہ طریق کار پر قائم رہنے کا اعلان کر دیا اور اس پر ڈٹے رہے جس کا منطقی نتیجہ یہی ہونا تھا جو سامنے آ چکا ہے کہ دو درجن کے لگ بھگ شہریوں کی ہلاکت اور ملٹری فورسز کے آپریشن کے بعد غازی برادران کی پسپائی کا تماشا پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔

جہاں تک ان مطالبات کا تعلق ہے کہ اسلام آباد میں سرکاری طور پر گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے، ملک میں اسلامی نظام کا مکمل نفاذ عمل میں لایا جائے، فحاشی اور بدکاری کے مبینہ اڈے ختم کیے جائیں اور حدود آرڈیننس میں کی گئی حالیہ غیر شرعی ترامیم واپس لی جائیں تو ان میں سے کوئی مطالبہ بھی ایسا نہیں ہے جسے ناجائز کہا جا سکے بلکہ یہ خود دستور پاکستان کے اسلامی و نظریاتی

* ان سطور کی تحریر کے وقت صورت حال یہی تھی، لیکن بعد میں یہ امید غلط ثابت ہوئی اور وفاق المدارس کے نمائندہ علماء اور مولانا عبد الرشید غازی کے مابین مذاکرات کے نتیجے میں مسئلے کے حل کے واضح امکانات سامنے آنے کے باوجود حکومت نے عین آخری وقت پر مذاکرات کو سبوتاژ کرتے ہوئے آپریشن کرنے کا راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں مولانا عبد الرشید غازی اور ان کے افراد خانہ کے علاوہ ان کے دیگر ساتھی اور جامعہ حفصہ کے طلبہ و طالبات بھی بڑی تعداد میں شہید ہو گئے۔

تقاضوں کو پورا کرنے کے مطالبات ہیں، لیکن اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا، اس سے ملک کے ہر ذی شعور شخص نے اختلاف کیا اور اسے غلط ٹھہرایا، اس لیے کہ ایک مسلم ملک میں مسلمان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا، قانون کو ہاتھ میں لینا، متوازی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنا اور عام لوگوں کو از خود سزا دینے کا طریقہ اختیار کرنا کسی طرح بھی جائز عمل نہیں کہلا سکتا، لیکن نہ صرف یہ کہ اس پر اصرار کیا گیا بلکہ اسے ''جہاد'' قرار دیا گیا اور طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد کو اس مقصد کے لیے ڈھال بنایا گیا جس سے معاملہ بتدریج سنگین سے سنگین تر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

دوسری طرف حکومت نے لال مسجد کی انتظامیہ کے غلط طریق کار کی آڑ میں ان جائز مطالبات کو مسلسل نظر انداز کیا جن کی ملک کے دینی حلقے حمایت کر رہے ہیں اور اس مسئلے کو مذاکرات کے ذریعے سے حل کرنے کے بجائے اسے زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کی جس سے ملک کے سنجیدہ حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ یہ سارا معاملہ خود حکومت کا پیدا کردہ ہے اور حکومت اس سے نہ صرف ملک کے اندر سیاسی فوائد حاصل کر رہی ہے بلکہ اسے دنیا میں دینی مدارس کے بارے میں غلط تاثرات پھیلانے کا ذریعہ بھی بنایا جا رہا ہے۔

دینی مدارس کے بارے میں سالہا سال سے عالمی میڈیا اور ادارے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ان میں اسلحہ کی ٹریننگ دی جاتی ہے اور یہ مبینہ طور پر دہشت گردی کے مراکز ہیں، لیکن دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت نے مسلسل محنت کے ساتھ اس تاثر کو زائل کیا اور عالمی رائے عامہ کو کسی حد تک یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی کہ جنوبی ایشیا کے یہ دینی مدارس صرف تعلیم اور نظریاتی و فکری تربیت تک محدود ہیں، ان میں نہ اسلحہ کی تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں اسلحہ موجود ہے۔ اس پر پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین نے بھی، جب وہ وزیر داخلہ تھے، مضبوط اسٹینڈ لیا اور واضح طور پر دنیا کو بتایا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی اور اس کی ٹریننگ کے الزامات بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت حال اب بھی یہی ہے اور جامعہ حفصہ کی طرز کے اکا دکا مدارس کے علاوہ ملک بھر کے ہزاروں دینی مدارس میں کوئی ایک مدرسہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اسلحہ کی ٹریننگ یا اسلحہ کے استعمال کی ترغیب دی جاتی ہو، لیکن جامعہ حفصہ کی صورت حال نے اس تاثر کو الٹ دیا اور لوگوں کو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت کے ایک بڑے مدرسے میں نہ صرف طلبہ

بلکہ طالبات کے ہاتھوں میں بھی اسلحہ دکھائی دینے لگا ہے۔

ہمارے نزدیک حکومت نے معاملے کو حد سے زیادہ طول دے کر دیگر سیاسی مقاصد کے ساتھ ساتھ اس تاثر کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس پر چودھری شجاعت حسین کے ایک حالیہ بیان کو بطور شہادت پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کوششوں سے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے سے معاملات طے ہونے کے قریب پہنچ گئے تھے کہ کسی خفیہ ہاتھ نے معاملات کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض عناصر یہ منظر بہر صورت دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ملک کی مسلح فورسز ہیں اور دوسری طرف ان کے مقابلے میں ایک دینی مدرسے کے طلبہ اور طالبات ہتھیار اٹھائے مزاحمت کے لیے مورچہ زن ہیں، اور ایسا چاہنے والے عناصر اس مقصد میں بہر حال کامیاب ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس افسوس ناک صورت حال کی ذمہ داری دونوں فریقوں پر عائد ہوتی ہے۔ غازی برادران نے ایک غلط طریق کار پر بے جا اصرار کر کے جہاں ملک بھر کے دینی حلقوں کا اعتماد کھویا اور محاذ آرائی کو تصادم تک پہنچانے کا ذریعہ بنے تو دوسری طرف حکومت نے معاملات کو حد سے زیادہ طول دے کر اور مذاکرات کے لیے کوئی سنجیدہ صورت اختیار کرنے سے عمداً گریز کر کے معاملات کو یہاں تک پہنچا دیا۔ اب اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں۔ مجھے گزشتہ روز ایک ذمہ دار عالم دین نے فون پر بتایا کہ اس افسوس ناک واقعہ کی آڑ میں حکومت، اسلام آباد میں موجود دینی مدارس کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہی ہے اور اس مبینہ تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہو سکتی ہے کہ سیکیورٹی کے نام پر ان دینی مدارس کو اسلام آباد کی حدود سے باہر منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز کچھ عرصہ قبل سامنے آئی تھی جسے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت نے مسترد کر دیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کی دستوری اور قانونی دائرے میں بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔

موجودہ صورت حال میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے افسوس ناک واقعات کی آڑ میں ان عالمی حلقوں کا دباؤ بھی بڑھ سکتا ہے جو حکومت پاکستان پر پورے ملک کے دینی مدارس کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے اور اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے نام پر ان کے الگ تعلیمی نظام کو سرکاری کنٹرول

میں لینے کے لیے زور دے رہے ہیں۔ آج ہی ایک خبر نظر سے گزری ہے کہ حکومت نے ملک بھر کے دینی مدارس میں اسلحہ کی موجودگی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کی ہدایات جاری کر دی ہیں، حالانکہ ملک کے دینی مدارس کا اس حوالے سے کئی بار سروے کیا جا چکا ہے اور ہر بار اس کی رپورٹ نفی میں آئی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ صورت حال میں جب کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے معاملات ملک بھر کے دینی مدارس سے اسلحہ اور محاذ آرائی، دونوں حوالوں سے مختلف ہیں اور کئی ماہ تک دنیا یہ منظر دیکھ چکی ہے کہ اس معاملے میں اسلام آباد اور ملک کے دیگر حصوں کے دینی مدارس لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے ساتھ شریک اور معاون نہیں ہیں، اس کے باوجود اگر اس کی آڑ میں اسلام آباد کے دینی مدارس یا ملک بھر کے دینی مدارس کے بارے میں کوئی منفی طرز عمل اختیار کیا گیا تو یہ بعض حلقوں کے اس تاثر کو حقیقی ثابت کرنے کی کارروائی سمجھی جائے گی کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا ہے جس کے ایک حصے میں کامیابی سے عمل درآمد کے بعد اب اس ایجنڈے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۱۰؍ جولائی ۲۰۰۷ء)

نصاب تعلیم اور طریق تدریس

دینی مدارس کا نصاب تعلیم

دینی مدارس میں مروج نصاب تعلیم کو درس نظامی کا نصاب کہا جاتا ہے جو ملا نظام الدین سہالویؒ سے منسوب ہے۔ ملا نظام الدین سہالویؒ (المتوفی ۱۱۶۱ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاصرین میں تھے۔ ان کا قدیمی تعلق ہرات (افغانستان) کے معروف بزرگ حضرت شیخ عبد اللہ انصاریؒ سے تھا۔ اس خاندان کے شیخ نظام الدینؒ نامی بزرگ نے یوپی کے قصبہ سہالی میں کسی دور میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا اور پھر ان کے خاندان میں یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا۔ اکبر بادشاہ نے اپنے دور میں اس خاندان کو سہالی میں معقول جاگیر دے دی تھی جس کی وجہ سے خاندانی اور تدریسی نظام کسی رکاوٹ اور دقت کے بغیر چلتا رہا حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں سہالی کے شیخ زادوں نے کسی تنازع کی بنیاد پر اس خاندان کے بزرگ ملا قطب الدینؒ کو شہید کر کے ان کا گھر، سامان اور کتب خانہ جلا دیا اور اس خاندان کو سہالی کا قصبہ چھوڑنا پڑا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ۱۱۰۵ھ میں لکھنؤ میں ''فرنگی محل'' کے نام کی ایک کوٹھی انہیں الاٹ کی جو ان کی تدریسی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی اور علمائے فرنگی محل کا وہ عظیم علمی خاندان پورے برصغیر میں متعارف ہوا جس میں ملا نظام الدین سہالویؒ، مولانا عبد الحلیم فرنگی محلیؒ اور مولانا عبد الحئ فرنگی محلیؒ جیسے اکابر و مشاہیر کے نام بھی شامل ہیں۔

اس دور میں برصغیر میں فقہ اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ تھا اور فرنگی محل کے علماء ان دونوں علوم میں نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا اپنا ایک انداز تعلیم تھا اور تعلیمی نصاب بھی خود ان کا اپنا طے کردہ تھا۔ یہ نصاب تعلیم دراصل اس خاندان کے مسلسل تجربات کا نچوڑ اور حاصل تھا جسے ملا نظام الدین سہالویؒ نے مرتب شکل میں پیش کیا اور اسی وجہ سے ان سے منسوب ہو کر ''درس نظامی'' کہلایا۔ اس نصاب میں درج ذیل گیارہ علوم و فنون میں اس دور کی بہترین کتابیں شامل کی گئیں:

۱۔ صرف، ۲۔ نحو، ۳۔ منطق، ۴۔ حکمت و فلسفہ، ۵۔ ریاضی، ۶۔ بلاغت، ۷۔ فقہ، ۸۔ اصول فقہ،

۹۔ علم کلام، ۱۰۔ تفسیر قرآن، ۱۱۔ حدیث۔

اس نصاب کے ساتھ اس خاندان کا طرز تدریس روایتی اور کتابی تھا جس میں کتاب کا متن، حاشیہ اور حاشیہ در حاشیہ سمجھنے اور حل کرنے کی صلاحیت بڑھانے پر زور دیا جاتا تھا اور کتاب کے نفس مضمون کی بہ نسبت اس کے دیگر متعلقات و تفصیلات کی طرف استاذ اور شاگرد کی توجہ زیادہ ہوتی تھی۔ اس طرز تدریس کی افادیت یہ تھی کہ اس سے ذہن و فکر کو تعمق اور گہرائی حاصل ہوتی تھی اور مطالعہ و استنباط کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی اور پورے جنوبی ایشیا میں صدیوں سے چلے آنے والے ہزاروں دینی مدارس کی یک لخت بندش و خاتمہ کے بعد جب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حاجی عابد حسینؒ جیسے بزرگوں نے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں رضا کارانہ چندہ اور امداد باہمی کی بنیاد پر ۱۸۶۵ء میں مدرسہ عربیہ کے نام سے ایک نئی درس گاہ قائم کی تو اس میں درس نظامی کے اسی نصاب کو تعلیم و تدریس کے نئے سلسلہ کی بنیاد بنایا اور یہی سلسلہ آگے چل کر پورے جنوبی ایشیا میں آزاد دینی مدارس کے ایک وسیع نظام کا نقطہ آغاز قرار پا گیا۔ مگر دیوبند کے حضرات نے درس نظامی کے نصاب کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ اس میں اس وقت کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ترمیم و اضافہ بھی کیا۔ ان حضرات کا علمی و فکری تعلق حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے تھا اور جہاد بالاکوٹ کی ناکامی کے باعث ولی اللہی خاندان کے مسند نشین حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی حجاز مقدس کی طرف ہجرت کے بعد اس خاندان کے علمی ورثہ اور فکری مشن کے یہی حضرات وارث تھے، اس لیے انہوں نے دونوں علمی سرچشموں کے درمیان سنگم اور پل کی حیثیت اختیار کر لی اور درس نظامی کے مذکورہ نصاب کے ساتھ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و فلسفہ کا جوڑ لگا کر ایک ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جو تھوڑے بہت ردو بدل کے ساتھ جنوبی ایشیا کے اکثر دینی مدارس میں اس وقت بھی رائج ہے اور اب تک مختلف ادوار اور مختلف حلقوں کی ترامیم اور اضافہ کے باوجود ''درس نظامی'' ہی کہلاتا ہے۔

دار العلوم دیوبند نے جب اس نصاب کو اپنایا تو اس وقت کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں دو بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ایک یہ کہ درس نظامی کے پرانے نصاب میں حدیث کی صرف ایک کتاب، مشکوۃ شریف تھی لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات و ارشادات کو سامنے رکھتے

ہوئے دیوبند کے نصاب میں صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی کو بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ اس وقت کی اہم ضرورت تھی جسے دیوبند کے اکابر نے محسوس کرتے ہوئے نصاب کے اندر سمو دیا۔ اسی طرح جہاد بالاکوٹ کے بعد جب حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ ہجرت کر کے حجاز مقدس چلے گئے تو ان کی جگہ دہلی کی مسند حدیث پر حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ متمکن ہوئے جن کا رجحان حنفیت سے گریزاں اس مکتب فکر کی طرف تھا جو بعد میں اہل حدیث کے نام سے موسوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ حدیث کی تعلیم میں ان کے ہاں انہی احادیث و روایات کی ترجیح کا پہلو غالب ہوتا تھا جو ان کے رجحانات سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے یہ تاثر عام ہونے لگا کہ حدیث نبویؐ اور فقہ حنفی الگ الگ بلکہ ایک دوسرے کے مقابل علوم کا نام ہے۔ اس تاثر کو دور کرنے کے لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے حدیث کی تعلیم و تدریس کے دوران میں فقہ حنفی کے مسائل و احکام کے احادیث نبویہؐ سے اثبات اور ان کی ترجیح کے طرز کو اپنایا جسے بعد میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے کمال تک پہنچا دیا۔

ان دو تبدیلیوں میں سے ایک کا تعلق نصاب میں اضافہ سے ہے اور دوسری تبدیلی طرز تدریس سے تعلق رکھتی ہے جو ظاہر ہے اس وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمل میں لائی گئیں، لیکن اس کے بعد نصاب اور طرز تعلیم پر جمود کی ایسی مہر ثبت کر دی گئی کہ زمانے کی ضروریات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر لینے کو ہی عافیت کا واحد ذریعہ سمجھ لیا گیا حتیٰ کہ بڑے بڑے اکابر چیختے چلاتے رہ گئے مگر مدارس دینیہ کے ارباب حل و عقد کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اس سلسلہ میں ارباب مدارس کے بھی کچھ تحفظات اور مجبوریاں ہیں جو ہمارے پیش نظر ہیں اور ہم نے اپنے مضامین میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن ان تحفظات اور مجبوریوں کے دائرے قائم رکھتے ہوئے بھی جو ضروری ترامیم اور اضافے آسانی کے ساتھ ہو سکتے تھے، بدقسمتی سے انہیں بھی نظر انداز کر دیا گیا اور ابھی تک مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ ہمارے دور کے اکابر علماء میں سے تھے اور ان کا شمار حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ابتدائی دور کے مایہ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے جب حضرت شاہ صاحبؒ دار العلوم دیوبند میں پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا نعمانیؒ اپنی خود نوشت

میں لکھتے ہیں کہ جس سال وہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو رخصت کرنے سے قبل ایک خصوصی نشست میں ہدایات اور نصائح سے نوازا جن میں سب سے اہم نصیحت یہ تھی کہ اگر اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام صحیح طریقے سے کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے انگریزی زبان سیکھنا ضروری ہے۔ اس واقعہ کو پون صدی گزر چکی ہے مگر ہمارے مدارس اب بھی انگریزی زبان کے بارے میں تردد کا شکار ہیں کہ سرے سے اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اس مسئلے پر بہت کچھ فرمایا مگر ان کی آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ میں اس موقع پر ان کے دو تین ارشادات نقل کرنا چاہوں گا جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دینی مدارس کے نصاب ونظام میں تبدیلی کی ضرورت پر اکابر علماء کے احساسات اور اس کے ارباب اختیار کے ذہنی وفکری جمود کے درمیان کتنا فاصلہ تھا۔

حضرت تھانویؒ قرآن کریم کی تدریس کے مروجہ طرز پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”قرآن شریف کا طرز عام مصنفین کے طرز پر نہیں ہے بلکہ محاورہ بول چال کا طرز ہے۔ نہ اس میں اصطلاحی الفاظ کی پابندی۔ ناواقف لوگ اس کو عام تصانیف کے طریقہ پر منطبق کرنا چاہتے ہیں، اس لیے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کو صاحب کشاف نے بھی لکھا ہے۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ضروری صرف ونحو اور کسی قدر ادب پڑھا کر قرآن شریف کا سادہ پڑھا دینا مناسب ہے کیونکہ کتب درسیہ کی تحصیل کے بعد دماغ میں اصطلاحات رچ جاتی ہیں، پھر طالب علم قرآن شریف کو اسی طرز پر منطبق کرنے لگتا ہے۔ اس طرح قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر پھر فنون ضرور پڑھے کیونکہ بعض مقامات قرآنیہ بغیر فنون کے حل نہیں ہوتے“ (کلام الحسن ص ۳۲)

اسی مسئلہ کو ایک اور انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

”اہل مدارس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں۔ جیسے بعض متون بغیر شرح کے پڑھائی جاتی ہیں، اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بغیر کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے۔ یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً ربع پارہ اول خالی قرآن کریم میں پڑھا دیا جائے، پھر اسی قدر جلالین پڑھا دی جائے اور مدرس اپنی سہولت کے لیے خواہ جلالین اپنے پاس رکھے یا اور کوئی مبسوط تفسیر تو طلبہ کو پڑھنے میں

اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کر کے حل کرنے کی عادت پڑ جائے گی" (اصلاح انقلاب ص ۴۷)

جبکہ نصاب میں ضروری اضافوں کے حوالے سے حضرت تھانویؒ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

"یہ میری بہت پرانی رائے ہے اور اب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہو گئی اس لیے کہ کوئی عمل نہیں کرتا۔ وہ رائے یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاک خانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارس اسلامیہ کے درس میں داخل ہونے چاہئیں۔ یہ بہت پرانی رائے ہے مگر کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں۔" (الافاضات الیومیہ، جلد ششم، ص ۴۳۵)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے ان ارشادات کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام اور طرز تدریس دونوں میں تبدیلی اور وقت کی ضروریات کو ان میں سمونے کی ضرورت کا احساس بہت پرانا ہے اور اس کا اظہار بڑے بڑے اکابر نے کیا ہے، لیکن دوسری طرف مدارس کے ارباب حل و عقد کے جمود کی بھی داد دیجیے کہ حضرت تھانویؒ جیسے بزرگ کو بھی اس حسرت کے ساتھ سپر انداز ہونا پڑا ہے کہ "کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں"۔

ہمارے دور میں اس مسئلہ پر سب سے زیادہ بحث حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ العزیز نے کی ہے اور درجنوں مضامین و مقالات میں انہوں نے نصاب تعلیم اور طرز تدریس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ نصاب میں تین طرح کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے:

۱۔ **تخفیف**، یعنی بھاری بھرکم نصاب کو کچھ ہلکا کیا جائے اور ایک ہی فن میں درجنوں کتابیں الگ الگ پڑھانے کے بجائے تین چار اہم اور زیادہ مفید کتابوں کی تعلیم دی جائے۔

۲۔ **تیسیر**، یعنی مشکل پسندی کا طریقہ ترک کر کے غیر متعلقہ مباحث میں طلبہ کے ذہنوں کو الجھانے کے بجائے نفس کتاب اور نفس مضمون کی تفہیم کو ترجیح دی جائے۔

۳۔ **اثبات و ترمیم**، یعنی غیر ضروری فنون کو حذف کر کے جدید اور مفید علوم کو شامل کیا جائے۔ حضرت بنوریؒ نے اس سلسلہ میں جن نئے علوم کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، ان میں ۱۔ تاریخ اسلام، ۲۔ سیرت النبیؐ، ۳۔ جدید عربی ادب و انشا، ۴۔ جدید علم کلام، ۵۔ ریاضی اور ۶۔ معاشیات بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی بحث کی ہے اور انہوں نے ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں عربی مدارس کے نصاب کے بارے میں ایک کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ ہمارے نصاب و نظام پر ایک جامع اور مکمل تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو اس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ خطبہ صدارت ادارہ نشریات اسلام اردو بازار لاہور کے طبع کردہ ''خطبات آزاد'' میں موجود ہے اور ہم نے بھی ماہنامہ الشریعہ کے نومبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں اسے شائع کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس کے تمام ضروری مباحث اور پہلوؤں کا تذکرہ تو ممکن نہیں ہے مگر دو اقتباسات ضرور پیش کرنا چاہوں گا تاکہ وقت کی ضروریات اور تقاضوں سے ہماری بے خبری بلکہ بے پروائی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

> ''حضرات! مجھے معاف کیا جائے۔ ۱۴ تا ۱۵ برس تک لڑکے پڑھتے ہیں اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ اگر لکھیں گے تو ایسی عربی ہوگی جس کو ایک عرب نہ پہچان سکے گا۔ تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کی نیو نئے سرے سے قائم کریں۔ بہترین کتابیں موجود ہیں، بہترین مواد موجود ہے، ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے۔''

اسی خطبہ میں مولانا آزادؒ فرماتے ہیں:

> ''میں نے بھی پھٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر انہی کتابوں کو پڑھا ہے اور میری ابتدائی تعلیم کا وہ سرمایہ ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی میرے اندر مخالفت کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا مگر میرا دل اس بارے میں زخمی ہے۔ یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ آج سے ایک سو برس پہلے ہم نے اس چیز کو محسوس کیا ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہوتا کہ اب دنیا کہاں سے کہاں آگئی ہے اور اس کے بارے میں کیا تبدیلی ہمیں کرنا ہے، لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے تبدیلی نہیں کی تو کم از کم یہ تبدیلی ہم کو پچاس برس پہلے کرنا چاہیے تھی۔ لیکن آج ۱۹۴۷ء میں اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو ہم معقولات کے نام پر پڑھا رہے ہیں، وہ وہی چیزیں ہیں جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گزر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

الغرض دینی مدارس کی تمام تر خدمات، قربانیوں، ایثار اور تاریخی کردار کے باوجود آج کے دور کے

تقاضوں اور ضروریات کے حوالے سے ان کے نصاب و نظام میں ضروری ردوبدل اور مناسب ترمیم و اضافہ وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے جس کی طرف اکابر علمائے حق ہر دور میں توجہ دلاتے چلے آ رہے ہیں اور ہماری گزارش بھی یہی ہے کہ وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا جائے، دینی ضروریات کو سامنے رکھا جائے اور مستقبل کے امکانات و خطرات کا ادراک کرتے ہوئے باہمی مشاورت کے ساتھ جو تبدیلی بھی ناگزیر ہو، اسے اختیار کرنے میں تامل سے کام نہ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس کے سینئر اساتذہ اور دور حاضر کے مسائل و ضروریات پر نظر رکھنے والے ارباب علم و دانش کے درمیان وسیع پیمانے پر مذاکروں اور مباحثوں کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سنجیدگی کے ساتھ سننے اور اس کی روشنی میں تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے ارباب مدارس اس ضرورت کا جلد احساس کریں اور اسے پورا کرنے کے لیے حوصلہ اور جرأت کے ساتھ پیشرفت کر سکیں۔ آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، اپریل ۲۰۰۱ء)

دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ

بنگلہ دیش کے حالیہ سفر کے دوران میں سلہٹ کے دینی مدرسہ مدینۃ العلوم دارالسلام کی لائبریری میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تحریر فرمودہ ایک نصاب تعلیم ملا جو انہوں نے اب سے کم و بیش ستر برس قبل دینی مدارس کے لیے ترتیب دیا تھا۔ پڑھ کر تعجب ہوا کہ جن ضروریات اور تقاضوں کی طرف ہم دینی مدارس کو آج توجہ دلا رہے ہیں، وہ پون صدی قبل حضرت مدنیؒ تفصیل کے ساتھ تحریر فرما چکے ہیں مگر ان امور کو جو توجہ دینی مدارس کی طرف سے حاصل ہونی چاہیے تھی، وہ نظر نہیں آرہی۔ اور اس بات پر خوشی ہوئی کہ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں عصر حاضر کے تقاضوں کو سمونے کے لیے جو لوگ جدوجہد کر رہے ہیں، وہ کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے اکابر و اسلاف ہی کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اس نصاب تعلیم کے ساتھ جو پیش لفظ اور ہدایات حضرت مدنیؒ نے تحریر فرمائی تھیں، وہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ اس سے صحیح طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے اکابر و اسلاف دینی مدارس کے کام کو کس دائرہ میں دیکھنا چاہتے تھے اور ان کے ذہن میں دینی مدارس کے اہداف کیا تھے؟ ہماری کوشش ہے کہ حضرت مدنیؒ کا تحریر فرمودہ مکمل نصاب تعلیم بھی اشاعت پذیر ہو جائے۔

”بعد الحمد والصلوۃ۔

مواسم کی تبدیلی اگر پوشاک اور خوراک کے رد و بدل کی خواہاں ہے اور ممالک و اقطار عالم کی مزاجی کیفیتوں کا اختلاف سکان (باشندوں) کے احوال و عادات پر اثر رساں ہے اور اگر مفید خزائن علمیہ کا تجدد "الانفع فالانفع" کو اختیار کرنے کا قانون بناتا ہے اور مختصر و جوامع شروح جدید اور حواشی مفید کا روز افزوں ذخیرہ متقدمین کی مسلمہ کتابوں کی جگہ لینے کی سنت زمانہ سلف سے دکھاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمانہ موجودہ اور دیار ہندیہ میں ہم زمان اور مکان کی مختلف حادثہ (نئی وقوع پذیر) اور قدیمہ ضرورتوں سے چشم پوشی کریں اور

ان مفید اور انفع (زیادہ نفع بخش) کتابوں کو فنون ضروریہ رائجہ میں قابلِ واگزشت سمجھیں جو کہ قدیم نصاب کی کتابوں سے نفع رسانی میں نہایت اعلیٰ شان رکھتی ہیں۔

ہم کسی طرح اس امر کو قابلِ عمل قرار نہیں دے سکتے کہ پرانی کتابیں اس وجہ سے ہی ضروری ہیں کہ اسلاف کی تصنیف کردہ یا اسلاف کے زیر تدریس رہی ہیں اور جدید تصنیف کردہ شدہ کتب صرف اس وجہ سے قابلِ ترک قرار دی جائیں کہ وہ زمانہ حال یا قریب کی تصنیف کی ہوئی ہیں یا اسلاف نے ان سے نفع نہیں اٹھایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور وغیر مشہور کتابوں پر صدر الشہید رحمہ اللہ کی تصنیف نے جالے کھینچ دیے۔ صاحب ہدایہ اور صدر الشریعہ وغیرہ کی تصانیف نے اپنے سے پہلوں کی تصانیف کو زوایا خمول (گوشہ گمنامی) میں نسیًا منسیاً (بھولا بسرا) کر دیا۔ کتاب سیبویہ اور مبرد وغیرہ کی تصانیف پر ابن حاجب اور مالک کی تصانیف قضاء بالموت کا حکم نافذ کرتی رہیں اور فارابی اور ابن سینا کی تالیفات پر تصانیف میر زاہد و محب اللہ بہاری وغیرہ پردہ ڈالتی رہیں۔

اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات تحریریہ قرار دیتے ہیں کہ زید بن ثابت کو زبان عبرانی سیکھنے کا حکم فرمائیں اور اگر ملوک کا کسی خط کو بلا مہر قابلِ اعتبار نہ سمجھنا آں حضرت علیہ السلام کو آمادہ کرتا ہے کہ انگشتری اور مہر تیار کرائیں تو ہم کو زمانہ موجودہ پر نظر ڈالتے ہوئے اجنبی زبانوں اور فنون وغیرہ کو سیکھنے اور سکھانے کو یک قلم پس انداز کر دینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔

مذہبی حیثیت بھی مثل معاشی ضرورتوں کے تقاضا کرتی ہے کہ اقوام عالم کی زبان اور ان کے رسم ورواج، ان کے علوم وفنون وغیرہ سے واقفیت حاصل ہو جائے۔

مذکورہ بالا امور اور اس قسم کے مختلف اور متعدّد وقایع (واقعات) عرصہ دراز سے مجھ کو پریشان کر رہے تھے کہ موجودہ اور رائجہ نصاب زمانہ حال میں قابلِ اصلاح وترمیم ضرور ہے مگر زمانہ نے مجھ کو اب تک مہلت نہ دی۔

میں نے ایام تعلم واستفادہ میں دیوبند کا نصاب تعلیم (جس کا بڑا حصہ درس نظامی کا خوشہ چین ہے) اپنے لیے معراج ترقی اور مسلم زندگی قرار دیا اور حسب استعداد وقابلیت بڑے درجہ تک اس سے فیضیاب ہوا مگر مدینہ منورہ میں مجھ کو جامعہ ازہر (مصر) اور استنبول بخارا وغیرہ کے نصابوں سے سابقہ پڑا۔ پھر زندگانی کے مختلف شعبوں پر غور و

خوض کرنے کی نوبت بھی آئی۔ مختلف ممالک اور متعدّد حکومتوں کے احوال نظر سے گزرے۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصابوں پر بھی بڑے درجے تک عبور پہلے سے حاصل تھا۔ زمانہ حال ہی مختلف اسلامی یونیورسٹیوں (جامعہ عثمانیہ دکن، جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی، ندوۃ العلماء وغیرہ) کو بھی زیر نظر لانے کی نوبت آئی۔ حتی الوسع احباب واکابر اصحاب الرائے اور ارباب تجربہ سے مشوروں کی نوبت بھی بارہا آئی۔ بالآخر یہ موجودہ نصاب انتخاب اور غور و تدبر کے بعد قوم کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیمی حالت پر پوری روشنی ڈالنا اور مکمل اصلاح و ترمیم مجھ جیسے ناواقف اور کم مایہ طالب علم کا کام نہیں مگر جبکہ اکابر قوم کو اس طرف کما حقہ توجہ نہیں تو پھر کم مایہ ہی اشخاص کو قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ ملک میں مختلف جماعتیں موجود ہیں جنہوں نے بعض امور کو اپنا مطمح نظر بنا کر دوسرے ضروری مقاصد کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے مگر اس نصاب میں اپنی فہم و تجربہ کی بنا پر صحیح راستہ اختیار کیا گیا ہے جو کہ مسلمانوں کو اصلی اور حقیقی کامیابی کے بام ترقی پر پہنچانے والا ہے۔ اگرچہ نصاب سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ طلبا کو حافظ فنون و علوم بنایا جائے بلکہ ایک ایسی استعداد اور قابلیت پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے جس سے وہ جملہ ضروری فنون میں پوری قوت پیدا کرلیں تاکہ ضرورت یا تکمیل کے وقت ان کو کوئی نقصان سدراہ نہ ہوسکے، مگر تاہم ان کو بہت سے فنون اور بہت سی اہم تر کتابوں اور اعمال سے دوچار ہونا ضروری ہے تاکہ یہ ملکہ راسخہ حاصل ہو۔

میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تصنیف و تالیف غیر مکمل ہے اور موجودہ کتابیں ہماری ضرورتوں کے لیے ایک درجہ تک ہماری زبان میں ناکافی ہیں، مگر تاہم ان شاء اللہ اگر اکابر قوم نے پسند فرمایا اور رائج کیا تو مجھ کو قوی امید ہے کہ ہمارے قوم و ملک میں اچھے اچھے اشخاص پیدا ہوسکیں۔

میں نے اگرچہ یہ نصاب تمام قطر ہند کے لیے تیار کیا ہے مگر چونکہ صوبہ بنگال کے اکابر و عمائد کی خدمات عالیہ میں اولاً پیش کرنے کا فخر حاصل ہوا ہے اس لیے میں نے بنگلہ زبان اور یہاں کے طرز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ دوسرے صوبہ میں اس کا تغیر حسب مکان نہایت آسانی سے ہوسکے گا۔

اخیر میں اپنی بضاعت مزجاۃ میں اکابر قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے غلطیوں کی

معافی اور اصلاح کی درخواست پیش کرتا ہوں اور اگر پسند خاطر ہو تو دعا اور ترویج کا خواست گار ہوں۔

والسلام،

میں ہوں آپ کا خادم

ننگ اکابر

حسین احمد غفرلہ

اصول و قوانین کلیہ

- چونکہ یہ نصاب صوبہ بنگال اور آسام کے مسلمانوں کے لیے ہے اس لیے اس میں بنگلہ زبان کی تحریری اور تقریری ترقی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ دوسرے صوبہ والے بجائے بنگلہ اپنے صوبے کی اس زبان کو جو سوائے اردو کے اپنی استقلالی شان رکھتی ہو، قائم کریں۔
- نصاب میں علوم دینیہ اور فنون عربیہ کو نہایت زیادہ قابلِ توجہ قرار دیا گیا ہے اور حتی الوسع عربی قدیم تعلیم اور اس کی کتابوں اور فنون کی اس طرح ملحوظ رکھا گیا ہے جس طرح پہلے سے چلی آتی ہے، اس لیے یہ کوئی نئی اسکیم نہیں ہے بلکہ وہی پرانی (اولڈ) اسکیم ہے۔ ہاں پرانی (اولڈ) اسکیم میں جن فنون اور جن کتابوں کی کمی تھی اور زمانہ موجودہ میں ان کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، ان کو بھی نہایت تھوڑے تغیر سے داخل کر دیا گیا۔
- اس نصاب کے تین حصے کر دیے گئے ہیں جن کے لیے مجموعی حیثیت سے سولہ برس کی مدت ضروری خیال کی گئی ہے۔ اول مکتب (مدرسہ ابتدائیہ)، دوم مدرسہ ثانویہ (جونیئر)، سوم مدرسہ عالیہ (سینئر)۔
- موجودہ نظام تعلیم جو کہ تمام بنگال و آسام میں رائج ہے، علم حدیث و تفسیر کو ضروری اور تعلیم اسلامی کا عضو رئیس نہیں سمجھتا، ورنہ اس فن کو تکمیل میں داخل نہ کرتا حالانکہ یہ علوم نہایت ضروری اور اہم بلکہ مقاصد ذاتیہ میں سے ہیں۔ دوسرے فنون فقط آلات اور خدمت گزار ہیں۔ درس نظامی میں بھی بہت سے علوم کو

ضرورت وقت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جو کہ تضییع عمر کی باعث اور خسارہ دین و دنیا کی سبب ہے اور بہت سے ضروری فنون و کتب سے چشم پوشی بھی گوارا کرنے کی بدنمائی اس میں موجود ہے۔ اس لیے حدیث اور تفسیر وغیرہ کو اسی درجہ میں داخل کیا گیا ہے۔

- اس نصاب کا ہر درجہ تقریباً مستقل اور اپنی اپنی اغراض و مقاصد میں دوسرے حصوں سے مستغنی ہے، اس لیے مکتب (درجہ ابتدائیہ) سے فارغ ہو کر بچے اگر تعلیم سے علیحدہ ہو جائیں یا سکولوں اور کالجوں میں داخل ہو جائیں تو ان کو مکتب کے مقاصد میں کوئی نقصان سدراہ نہ ہوگا اور علیٰ ہذا القیاس درجہ ثانویہ اور عالیہ ہر ایک مستقل طور پر فیض رساں ہیں۔
- اس نصاب میں پانچ زبانوں کی تعلیم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بنگلہ (صوبہ کی زبان) اردو، فارسی، انگریزی، عربی، مگر اول الذکر (بنگلہ) کو بوجہ صوبہ کی زبان ہونے کے اور آخر الذکر (عربی) کو بوجہ مذہبی اور علمی زبان ہونے کے زیادہ تر اہمیت دی گئی ہے۔ باقی ماندہ السنہ ثلاثہ (اردو، فارسی، انگریزی) کو بقدر ضرورت لازم قرار دیا گیا ہے، البتہ اردو زبان چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور علمی زبان ہونے کا فخر بھی حاصل کر چکی ہے، اس لیے اس کا مرتبہ نسبت باقی ماندہ ہر دو زبانوں (فارسی، انگریزی) کے اعلیٰ رکھا گیا ہے۔ پھر انگریزی چونکہ حکومت کی زبان ہے اور بہت سے دنیاوی ان کاروبار کا جن سے کوئی شخص تازیست مستغنی نہیں ہو سکتا، اس سے تعلق ہے اس لیے اس کو فارسی زبان پر فوقیت دی گئی ہے۔
- اس نصاب میں قرآن شریف سے قوی تعلق پیدا کرنے کی زیادہ تر کوشش کی گئی ہے تاکہ طلبا کا کوئی زمانہ قرآن شریف سے اجنبیت نہ رکھے اور یہ امر نہایت قوی ذریعہ ان کو معانی قرآن اور تفسیر کے سمجھنے اور اس کے رنگ سے قلوب کو رنگین کرنے کے لیے ہو سکے۔ افسوس ہے کہ رائج الوقت نصاب میں اس کی طرف سے بہت زیادہ بے توجہی برتی گئی جس کا بدنما نتیجہ مخفی نہیں ہے۔
- اس نصاب میں علم تاریخ، ادب عربی، علم حدیث کو بھی بہ نسبت دیگر فنون کے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کی وجہ ارباب بصیرت پر مخفی نہیں۔ طلبا کو واقعات

زمانہ اور اخبار پر مطلع ہونا، اخبار بینی سے دلچسپی پیدا کرنا، مضامین لکھنے اور ان کی اشاعت وغیرہ کی مہارت حاصل کرنا، ابنائے زمانہ کی آرا اور ان کی ذہنیتوں کا احاطہ کرنا وغیرہ وغیرہ چونکہ نہایت ضروری امور ہیں، اس لیے ہر مدرسہ میں دارالمطالعہ ہونا ضروری ہے جس میں ہر قسم کے اخبار اور ماہواری رسائل وغیرہ موجود رہا کریں اور وقت معین پر طلبہ جا کر چپ چاپ بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیا کریں۔

- دارالمطالعہ کے لیے روزانہ ہر طالب علم (درجہ عالیہ و سافلہ کا) آدھ گھنٹہ صرف کیا کرے جس میں پاؤ گھنٹہ اوقات نظام سے ہوگا اور پاؤ گھنٹہ اوقات تعطیل نماز میں سے۔
- درجہ ثانویہ اور عالیہ کے طلبا کے لیے لازم ہوگا کہ مذکورہ ذیل دستکاریوں میں سے ایک یا چند دستکاری سیکھیں جس کے تعین میں ان کو اختیار ہوگا: چرغہ چلانا اور کپڑا بننا، حدادی (لوہے کا کام)، نجاری (بڑھئی کا کام)، خیاطت (کپڑا سینا)، گھڑی سازی، جلد سازی، چمڑا رنگنا، بوٹ وغیرہ بنانا، صیاغت (سونار کا کام) وغیرہ وغیرہ۔
- اس نصاب میں انگریزی زبان کو صرف اس درجہ تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جس سے ضروری کاروبار انجام پا سکیں۔
- اس نصاب میں فنون کو حتی الوسع ملکی زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کی گئی ہے البتہ عربی علوم و فنون کو مختلف مصالح کی بنا پر عربی زبان میں ہی تعلیم دینا ضروری خیال کیا گیا ہے۔
- عربی زبان کے سوا اور دوسری زبانیں محض بہ حیثیت زبان تعلیم دی جائیں گی۔
- عالیہ اور سافلہ میں کچھ ایسی آسان کتابیں رکھی گئی ہیں جو کہ درسیات میں شمار نہ ہوں گی مگر طلبا ان کا مطالعہ کر کے مضامین کے یاد کرنے کے مکلف ہوں گے اور امتحان میں ان کا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ ایسی کتابوں کو خانہ درسیات کے آخر میں بین القوسین ذکر کیا گیا ہے۔
- عالیہ اور سافلہ کے درجات میں حسب حیثیت مذکورہ نصاب تحریر اور تقریر کی مشق کرنی لازم ہوگی۔

- ہر زبان کی تعلیم کے ساتھ اس کے املا اور کتابت کا درست کرانا ضروری ہوگا اور ہر زبان کی خوش نویسی کا امتحان مستقل علیحدہ ہوگا۔
- روزانہ عالیہ اور سافلہ کے طلبا کو ضروری ہوگا کہ وہ جسمانی ان فنون و اعمال کی عصر کے بعد مشق کیا کریں جن سے صحت جسمانی پر نہایت مفید اثرات پڑیں اور فن سپہ گری بھی ہاتھ آئے، جیسے پٹہ، گدکا، لکڑی، بنوٹ اور تلوار وغیرہ۔
- طلبا کی حاضری اور ان کے اخلاق کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائے گا اور ہر دو امر کے متعلق مدرسین اور منتظمین کی شہادت پر ان کو خاص نمبر اور انعام سالانہ دیا جائے گا۔
- اس نصاب کے بعد تکمیل کے درجات ہوں گے جن میں مختلف شعبوں اور زبانوں کی تکمیل کا لحاظ رکھا جائے گا، مثلاً شعبہ تبلیغ، شعبہ تعلیم (ٹریننگ) وغیرہ۔ انہیں درجات تکمیل میں فتاویٰ، ادبیات عربیہ، ادبیات بنگلہ، ادبیات اردو، ادبیات فارسی، ادبیات انگریزی، الجبرا، ہندسہ و ریاضی (جیومیٹری)، علم طب، علم قراءۃ، فلسفہ قدیم و جدید، منطق تفسیر وغیرہ کی تکمیل کا لحاظ کیا جائے گا مگر ان کی تفصیل اس نصاب میں بالفعل نہیں کی گئی۔ آئندہ اس کے جاری اور منظم ہو جانے پر اس کی بھی اسکیم تیار کی جائے گی۔
- ہر تین برس میں اس نصاب پر غور کرنا ہوگا اور حسب ضرورت و اقتضائے وقت و تجربہ ضروری اصلاحات اور ترمیمات عمل میں لانا ہوگا۔
- اس نصاب میں اندازہ کیا گیا ہے کہ سال بھر میں تقریباً ساڑھے سات مہینہ تعلیم میں خرچ ہوں گے یعنی سالانہ تعطیل اور ہفتہ وار تعطیل اور ایام امتحان کو منہا کرنے کے بعد جو زمانہ بچتا ہے، وہ تعلیم کا خاص زمانہ ہے۔"

(روزنامہ اسلام، ۲۲/ جنوری ۲۰۰۴ء)

دینی مدارس کا تعلیمی نصاب اور چند ناگزیر جدید تقاضے

دو تین روز جامعہ الہدیٰ ٹونگھم کی تعلیمی مشاورت میں گزرے۔ یہ جامعہ، مدنی ٹرسٹ ٹونگھم کے زیر اہتمام مصروف عمل ہے جس کے چیئرمین میرپور آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے مولانا حکیم اختر الزمان غوری اور سیکرٹری سیاکھ آزاد کشمیر کے مولانا رضاء الحق ہیں۔ دونوں کا تعلق بڑے علمی خاندانوں سے ہے۔ غوری صاحب کے والد محترم مولانا حکیم حیات علی چشتی رحمہ اللہ تعالیٰ کشمیر کے بزرگ علماء اور مشائخ میں سے تھے۔ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ اور حضرت مولانا حافظ محمد صدیقؒ آف بھرچونڈی شریف جیسے عظیم بزرگوں کی زیارت اور ان سے استفادہ کا شرف رکھتے ہیں جبکہ مولانا رضاء الحق کے دادا محترم حضرت مولانا محمد ابراہیم سیاکھویؒ اور ان کے بھائی حضرت مولانا محمد عبداللہ سیاکھویؒ کا شمار آزاد کشمیر کے اکابر علماء کرام اور مجاہدین میں ہوتا ہے۔ مدنی ٹرسٹ میں ان کے ساتھ میرپور آزاد کشمیر کے علاقہ سے تعلق رکھنے والے ایک اور دوست بھائی محمد امین ہیں جو عالم دین تو نہیں ہیں مگر دینی تعلیم کے فروغ کے لیے ان کی محنت اور جامعۃ الہدیٰ کے لیے ان کی مسلسل خدمات بہت سے علماء کرام کے لیے قابلِ رشک ہیں۔

جامعۃ الہدیٰ کے دو حصے ہیں۔ طالبات کے لیے اس کا تعلیمی نظام ٹونگھم میں ہے جو ایک وسیع اور خوبصورت بلڈنگ میں ہے اور جہاں اسکول کی مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ معیاری دینی تعلیم کا نظم موجود ہے۔ گیارہ سال کی بچیوں کے لیے سات سالہ اور سولہ سال کی بچیوں کے لیے چار سالہ کورس ہے جس میں قرآن و حدیث، فقہ اسلامی، تاریخ، عربی زبان اور دیگر متعلقہ علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مختلف درجات میں دو سو کے لگ بھگ طالبات ہیں جو ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ لڑکوں کے لیے شیفیلڈ میں ایک اسکول کی عمارت خرید کر اس میں جامعۃ الہدیٰ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کی تعلیمی مشاورت اور امتحانی نظام میں محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی آف اسلام آباد اور حضرت مولانا سید سلمان ندوی آف لکھنو کو سرپرست کی حیثیت حاصل ہے جو وقتاً فوقتاً جامعہ میں آتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد

عیسیٰ منصوری، مولانا محمد اکرم ندوی اور راقم الحروف بھی اس مشاورتی نظام کا حصہ ہیں، اس لیے جب بھی حاضری ہوتی ہے، جامعہ کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی باقی مصروفیات کو سمیٹ کر دو تین روز کی مسلسل مشاورت کی بساط پھیلا لیتے ہیں۔ جامعہ کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جاتا ہے، کارکردگی پر بحث ہوتی ہے، نصاب کی کانٹ چھانٹ ہوتی ہے اور مستقبل کے منصوبے زیر بحث آتے ہیں۔

اس دفعہ بھی یہی ہوا اور ۲۴، ۲۵، ۲۶ ستمبر کے تینوں ایام اسی مشاورت میں گزرے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں اس طرح کی طویل نشستوں کا معمول نہیں ہے۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ چار پانچ گھنٹے کی مشاورتی محفلوں کے عادی ہیں مگر مولانا رضاء الحق برطانوی نظام تعلیم سے واقف ہیں، ان کے سسٹم کو سمجھتے ہیں اور اپنے تعلیمی کام کو جاری رکھنے کے لیے ان سے واسطہ رکھتے ہیں، اس لیے دو چار گھنٹے کی کسی نشست پر ان کی تسلی نہیں ہوتی اور کسی بھی مسئلہ کی جزئیات و تفصیلات کو اچھی طرح کھنگالے بغیر ان کا گزارا نہیں ہوتا، اس لیے سات سالہ اور چار سالہ نصابوں پر نظر ثانی میں ہمیں تین دن لگ گئے، پھر بھی سب امور پر حتمی فیصلے نہیں کر سکے اور بعض امور کو اگلے سال کی میٹنگ تک مؤخر کرنا پڑا۔ اس سال کی مشاورت میں حکیم اختر الزمان غوری، مولانا رضاء الحق، مولانا محمد اکرم ندوی، مولانا قاری عارف محمود سیاکھوی، مولانا قاری سید ابرار حسین شاہ ہزاروی اور راقم الحروف کے علاوہ اسلام آباد کے معروف تعلیمی مرکز ادارہ علوم اسلامی بھارہ کہو کے قاری محبوب الٰہی رحیمی بھی شریک تھے۔

یہاں کے تعلیمی مسائل بھی کم و بیش وہی ہیں جن سے ہمیں پاکستان میں واسطہ پڑتا ہے۔ عصری تعلیم یہاں لازمی ہے۔ اس کے ساتھ دینی علوم میں سے کون سے امور کو شامل کیا جا سکتا ہے اور دونوں میں توازن قائم رکھنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟ دونوں نصاب پورے پڑھائے جائیں تو چند ذہین بچوں کے سوا باقی طلبا و طالبات کے لیے بھاری بھرکم نصاب بوجھ بن جاتا ہے۔ اسکول کی تعلیم کے نصاب اور معیار میں کمی رہ جائے تو طلبا اور ان کے والدین مطمئن نہیں ہوتے بلکہ یہاں کے لوکل تعلیمی سسٹم کو بھی شکایت ہوتی ہے اور اگر دینی تعلیم کا معیار کمزور ہو تو ہماری تسلی نہیں ہوتی اور ایسے جامعات کے قیام کا مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ طلبہ و طالبات کے ذوق اور نفسیات کا ہے۔ انہیں جن مضامین کا امتحان دینے پر سرکاری سند یا ڈگری ملتی ہے، ان پر ان کی توجہ طبعی طور پر زیادہ ہوتی ہے اور وہ دینی علوم جن پر حاصل ہونے والی سند ان کے لیے ملازمت یا

مزید تعلیمی ترقی کے لیے زیادہ سود مند نہیں ہوتی، وہ اس درجہ کی توجہ نہیں حاصل کر پاتے۔ تیسرا مسئلہ اساتذہ کا ہے کہ تعلیمی نصاب و نظام میں جن تبدیلیوں کے ہم خواہاں ہیں، ان کے لیے اساتذہ کی ذہنی تیاری اور عملی تربیت کا ماحول موجود نہیں ہے۔ انہوں نے کسی اور ماحول میں تعلیم حاصل کی ہے اور ہم ان سے مختلف ماحول میں کام لینا چاہتے ہیں۔

پھر جامعۃ الہدیٰ میں ایک اور تجربہ سے بھی گزرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں عرب اساتذہ اور استانیاں بھی ہیں اور ہمارے جنوبی ایشیا کے مدارس سے تعلیم اور تربیت حاصل کرنے والے اساتذہ اور استانیاں بھی ہیں۔ دونوں کا تعلیمی پس منظر مختلف ہے۔ مثلاً عربی زبان کی تعلیم کو لے لیجیے۔ ہمارے ہاں زیادہ زور گریمر اور قواعد و ضوابط پر دیا جاتا ہے جبکہ عرب اساتذہ کے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہیں ہے اور وہ عربی زبان کو عرب ماحول کے مطابق بول چال کی زبان کے طور پر پڑھانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں حدیث نبوی پڑھانے کا انداز اور ہے اور عربوں کا انداز اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے ساتھ یہ الجھن بھی پیش آجاتی ہے کہ ہمارے اساتذہ اور استانیاں متصلب حنفی ہوتی ہیں جبکہ عرب اساتذہ اور استانیوں کا حنفی ہونا ضروری نہیں ہے۔ کوئی شافعی المذہب ہوگا، کوئی سلفی ہوگا اور کوئی حنبلی یا مالکی ہوگا۔ ان کے درمیان ہم آہنگی کا ماحول قائم ہوتے ہوئے وقت لگے گا اور اس عمل کو کئی رکاوٹوں اور مشکلات کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔

یہاں ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے کہ اسکول کی عصری تعلیم لازمی نہیں رہتی اور تعلیمی نصاب کی بنیاد دینی علوم پر رکھی جا سکتی ہے مگر پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ نصاب کی بنیاد دینی علوم پر رکھ کر اس میں عصری علوم میں سے کون سا مواد شامل کرنا ضروری ہے اور کون سے مضامین کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ مثال کے طور پر اسی مشاورتی دور میں ہونے والی ایک گرما گرم بحث کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ سولہ سال سے اوپر کے طلبا جو یہاں کے سرکاری تعلیمی نظام کے مطابق لازمی تعلیم کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور ان کے لیے ہم دینی علوم کی زیادہ سے زیادہ تعلیم کا اہتمام کر سکتے ہیں، ان کے نصاب میں سائنس، انگلش زبان اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل کیے جائیں یا نہیں؟ بعض دوستوں کی رائے یہ تھی کہ انہیں درس نظامی کے مطابق صرف دینی علوم پڑھائے جائیں مگر میری گزارش یہ تھی کہ پہلے آپ اپنا ہدف طے کریں کہ اس تعلیمی نظام کے ذریعے سے آپ معاشرہ کو دینی

قیادت فراہم کرنا چاہتے ہیں اور امام، خطیب، مفتی، مدرس، قاری اور مبلغ و داعی پیدا کرنا آپ کا مقصود ہے یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ دینی تعلیم اور تربیت سے بہرہ ور لوگ یہاں کی یونیورسٹیوں میں جائیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ممتاز مقام حاصل کریں؟ یہ دو الگ الگ ہدف ہیں۔ دونوں کی اہمیت و ضرورت مسلم ہے اور دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ دینی قیادت فراہم کرنا مقصد ہے تو پھر دینی علوم کو ترجیح دینا ہوگی اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی میں کامل مہارت کا اہتمام کرنا ہوگا اور اگر آپ اپنے تربیت یافتہ افراد کو یونیورسٹیوں اور سرکاری شعبوں میں بھیجنے کے خواہش مند ہیں تو پھر عصری علوم میں ان کا معیار بلند رکھنا ہوگا، کیونکہ اس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ پھر دینی قیادت کے حوالے سے بھی یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ دینی علوم میں مکمل مہارت کے باوجود اگر ان کی انگلش معیاری نہیں ہے، عصر حاضر کے بارے میں ان کی معلومات ناقص ہیں یا وہ جن لوگوں میں کام کرنا چاہتے ہیں، ان کی نفسیات اور ذہنی سطح سے ہی واقف نہیں ہیں تو دینی علوم میں ان کی مہارت بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور وہ اس معاشرہ میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکیں گے۔

اسی بحث میں یہ پہلو بھی گرما گرم گفتگو کا موضوع بنا کہ دینی تعلیم کے نصاب میں سائنس اور جغرافیہ کا شامل ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک دوست اس بات پر مصر تھے کہ کوئی ضرورت نہیں ہے مگر میری رائے یہ تھی کہ بطور فن کے تو ضروری نہیں ہے، مگر بنیادی اور جنرل معلومات کی حد تک ان دونوں علوم کا شامل نصاب ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ایک خطیب صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ میکسیکو نامی ملک کون سے براعظم میں ہے اور وہ کسی حوالہ سے اپنے خطبہ میں اسے یورپ کا ملک بتا دیتے ہیں تو اس سے ان کے پڑھے لکھے سامعین میں ان کے بارے میں جو تاثر پیدا ہوگا، وہ ان کی دینی راہنمائی کے معیار کو بھی مشکوک بنا دے گا۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ ایٹم بم کیا ہے اور کیسے بنتا ہے اور وہ اس کے بارے میں درس میں کوئی اوٹ پٹانگ بات کہہ دیتا ہے تو اس سے اس کی شخصیت اور اعتماد پر جو منفی اثر پڑے گا، وہ ان کی دینی معلومات کے معیار کو بھی مجروح کر دے گا، اس لیے سائنس، جغرافیہ اور عمرانی علوم کا بنیادی معلومات کی حد تک دینی تعلیم کے نصاب میں شامل ہونا انتہائی ضروری ہے اور ان سے مکمل صرف نظر کرنا حکمت و دانش کے خلاف ہے۔

اس مشاورت کے دوران میں اور بعض دیگر محافل میں یہ سوال کیا گیا کہ ہم مدرسہ نصرۃ العلوم

اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ان ضروری تبدیلیوں کے حوالے سے کیا کر رہے ہیں جن کا ہم اکثر تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے دوستوں کو بعض باتوں سے آگاہ کیا تو ایک صاحب نے کہا کہ ان کا ذکر آپ کے کسی کالم میں تفصیل کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ دوسرے حضرات بھی اس کے بارے میں سوچ سکیں اور کوئی رائے قائم کر سکیں۔

میں نے دوستوں کو بتایا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے دورۂ حدیث کے نصاب میں حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغۃ ابتدا سے مستقل طور پر شامل ہے۔ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم نے کم و بیش چالیس سال تک یہ کتاب دورۂ حدیث کے طلبا کو پڑھائی ہے اور اب چند سال سے یہ خدمت میرے سپرد ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ دو سال سے ہم نے دورۂ حدیث کے مضامین میں دو باتوں کا اضافہ کیا ہے: ایک یہ کہ آج کے بین الاقوامی قوانین بالخصوص انسانی حقوق کا فلسفہ و نظام کیا ہے اور اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ اس کا کہاں کہاں ٹکراؤ ہے۔ دوسرے نمبر پر معاصر ادیان مثلاً یہودیت، مسیحیت، ہندو ازم، بدھ مت، سکھ مت وغیرہ کا ضروری تعارف اور آج کے معروضی حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ بھی ایک مضمون کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور یہ دونوں مضامین میں خود پڑھاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ احادیث کی قراءت و تعلیم کے دوران میں طلبا کو یہ بتایا جائے کہ اس حدیث کا آج کے علمی مسائل کے ساتھ کیا تعلق ہے اور جدید فکری، علمی اور فقہی مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں کیسے تلاش کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ہم درس نظامی کے فضلاء کا ایک سالہ کورس چلا رہے ہیں جس میں انہیں حجۃ اللہ البالغۃ کے منتخب ابواب کے علاوہ معاصر ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ، انگلش اور عربی زبانیں، نفسیات و معاشیات اور جنرل سائنس کا تعارفی مطالعہ، کمپیوٹر ٹریننگ اور ضروری تاریخ کے ساتھ ساتھ مضمون نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے اور کسی موضوع پر ان سے مقالہ لکھوایا جاتا ہے۔ گزشتہ دو سال میں ہمارے پاس اس کورس میں پانچ پانچ علماء کرام نے شرکت کی ہے جبکہ تیسرے سال کا کورس رمضان المبارک کے بعد شروع ہو رہا ہے جس کے داخلہ کے لیے ہم نے یہ شرط رکھی ہے کہ درس نظامی کا فارغ التحصیل ہو، لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتا ہو، اور کم از کم میٹرک ہو۔ اس

کے علاوہ گزشتہ سال شوال میں ہم نے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں دینی مدارس کے اساتذہ کے ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا جس میں خود دینی مدارس کے اساتذہ نے اپنے نصاب و نظام کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا تھا اور اس کی بنیاد پر ایک رپورٹ مرتب کی گئی، جبکہ اس سال ۱۰ر شوال/۲۲ر نومبر کو دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس کا عنوان ''دینی مدارس میں عمرانی علوم کی تعلیم و تدریس کی اہمیت'' طے کیا گیا ہے۔ مختلف دینی مدارس کے اساتذہ تشریف لائیں گے اور اس موضوع پر اظہار خیال کریں گے اور ان کے خیالات و ارشادات کی روشنی میں ایک رپورٹ مرتب کر کے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں پیش کی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، ۵ر اکتوبر ۲۰۰۴ء)

بنگلہ دیش کے دینی مدارس

بنگلہ دیش میں گیارہ دن قیام کے بعد ۱۰/ جنوری کو ہماری واپسی تھی۔ اس دوران میں ہم نے ڈھاکہ، چاٹگام، سلہٹ، سونام گنج، ہاٹ ہزاری، ٹیسیا، درگاپور، مدھوپور اور دیگر مقامات پر مختلف دینی اجتماعات میں شرکت کی اور سرکردہ علماء کرام سے ملاقاتیں کیں۔ ہمارے قافلے میں راقم الحروف کے علاوہ لندن سے ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری، ابراہیم کمیونٹی کالج وائٹ چیپل لندن کے ڈائریکٹر مولانا مشفق الدین، دار الارقم کالج ایمسٹر (برطانیہ) کے ڈائریکٹر مولانا محمد فاروق اور دار الارشاد میرپور ڈھاکہ کے ڈائریکٹر مولانا محمد سلطان ندوی شامل تھے۔ ہمارا سفر دراصل دار الارشاد میرپور ڈھاکہ کی دعوت پر سید ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشن سنٹر کی افتتاحی تقریب کے حوالے سے ہوا تھا جو یکم جنوری کو منعقد ہوئی۔ اس میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ دار العلوم دیوبند سے مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیر آبادی اور ندوۃ العلماء لکھنو سے مولانا سید سلیمان حسینی ندوی نے بھی شرکت کی۔ تقریب میں سنٹر کے تعلیمی سال کے افتتاح کے علاوہ مسجد بیت المکرم میں واقع اسلامک فاؤنڈیشن کے ہال میں ایک سیمینار کا پروگرام بھی شامل تھا جس کی صدارت جامع مسجد بیت المکرم کے خطیب مولانا عبید الحق نے کی اور اس سے ڈھاکہ کے بزرگ عالم دین مولانا محی الدین خان اور دیگر سرکردہ علماء کرام نے بھی خطاب کیا۔

اس کے بعد دار الارشاد کے مہتمم مولانا سلمان ندوی نے دوسرے شہروں میں چند پروگرام طے کر رکھے تھے جن کے لیے ہم نے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔ مولانا سلمان ندوی بڑے باذوق اور متحرک عالم دین ہیں اور ایک عرصے سے دینی مدارس کے نظام و نصاب میں عصر حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اصلاحات کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے بہت سے بزرگوں مثلاً مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا شمس الحق فرید آبادیؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے مقالات و مضامین کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے انہیں

دینی حلقوں تک پہنچایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس حوالے سے مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور راقم الحروف کے بعض مضامین کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ ان مضامین میں دور حاضر کی عملی، فکری اور ملی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مدارس کے نصاب و نظام میں اصلاحات کی تجویز دی گئی ہے۔ اس سفر کے دوران میں ہمیں سلہٹ میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تحریر کردہ ایک تفصیلی نصاب ملا جو انہوں نے بیسویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے کے دوران میں بنگال اور آسام کے دینی مدارس کے لیے ترتیب دیا تھا۔ اس سولہ سال پرانے نصاب میں وہ تمام امور، بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع دائرے میں اصلاحات شامل ہیں جن کا ہم لوگ آج کل دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے تقاضا کر رہے ہیں۔

بنگلہ دیش کے اس سفر میں معلوم ہوا کہ وہاں بھی اسی طرح کی صورت حال ہے اور دور حاضر کے تقاضوں کا ادراک رکھنے والے بہت سے دانشور دینی مدارس کے منتظمین سے مسلسل گزارش کر رہے ہیں کہ وہ اپنے نصاب کی بنیادی روح اور مقاصد کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی آزادی اور خود مختاری پر قائم رہتے ہوئے ان ضروری تقاضوں کو اپنے نصاب و نظام میں سمو لیں جو آج عالمی سطح پر دینی حلقوں کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہی ہم خیالی اور ہم ذہنی ہمارے بنگلہ دیش کے اس سفر کا باعث بنی، ورنہ اپنے میزبان اور داعی مولانا سلمان ندوی سے اس سے قبل ہمارا کوئی رابطہ اور پہچان نہ تھی۔

چاٹگام میں اس محاذ پر ایک عالم دین کو بھی متحرک پایا اور ان کا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ یہ مولانا سلطان ذوق ہیں جو دار المعارف کے نام سے ایک معیاری درس گاہ اور تعلیمی مرکز چلا رہے ہیں۔ ان کا فکری تعلق بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ہے اور مولانا ندویؒ ان کی دعوت پر دو بار چاٹگام تشریف لا چکے ہیں۔ وہ اس محاذ پر نہ صرف توجہ دلانے کا کام کر رہے ہیں، بلکہ عملی طور پر نصابی کتابوں کی تدوین، مروجہ نصابی کتابوں کو نئے اسلوب میں ڈھالنے اور نئی کتابوں کی تلاش و نشان دہی کی محنت میں بھی مصروف ہیں۔

سلہٹ میں اس سلسلے میں سب سے زیادہ فکر مندی مولانا عبد العزیز دیامیری میں نظر آئی جو مدینۃ العلم دار السلام کے شیخ الحدیث ہیں اور علماء کرام کو عصر حاضر کے تقاضوں کی طرف توجہ دلاتے رہتے

ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا پون صدی قبل تحریر کردہ نصاب ہمیں انہی سے ملا اور انہوں نے قومی ادبی مجلس کے ''سلمان ہال'' میں اس حوالے سے ایک سیمینار کا بھی اہتمام کیا۔

واپسی پر ۱۰/ جنوری کو شام کے وقت میری کراچی کے لیے اور مولانا منصوری کی ممبئی کے لیے فلائیٹ تھی، اس لیے ہم نے ڈھاکہ کا معروف عالیہ مدرسہ دیکھنے کا پروگرام بنالیا۔ بنگلہ دیش میں عالیہ مدارس ان دینی درس گاہوں کو کہا جاتا ہے جو حکومت کے زیر انتظام چلتے ہیں۔ انہیں محکمہ تعلیم کے تحت مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کنٹرول کرتے ہیں۔ اس بورڈ کے ساتھ کم و بیش ساٹھ ہزار مدارس کا الحاق ہے جن میں سے بعض مدارس کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے، جبکہ بعض مدارس اپنے انتظامات خود چلاتے ہیں اور حکومت ان کی تھوڑی بہت مالی امداد کرتی ہے، البتہ ان سب کا تعلیمی نظام مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے تحت محکمہ تعلیم کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہماری طرح کے آزاد دینی مدارس ''قومی مدارس'' کہلاتے ہیں جو مالی اور انتظامی خود مختاری کے ساتھ ساتھ نصاب و نظام کے معاملات بھی خود طے کرتے ہیں، مگر اس فرق کے ساتھ کہ ہمارے ہاں پاکستان میں دینی مدارس نے اپنے اپنے مسالک کے حوالے سے وفاق قائم کر رکھے ہیں اور ان کے تحت ملک بھر کے ہر سطح کے دینی مدارس پانچ وفاقوں کی صورت میں پوری طرح مربوط و منظم ہیں، لیکن بنگلہ دیش میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ وہاں اگرچہ مسلکی حوالے سے دیوبندی مکتب فکر ہی کے مدارس عام طور پر پائے جاتے ہیں، مگر وہ الگ الگ گروپوں کی شکل میں کام کر رہے ہیں۔

بنگلہ دیش میں درس نظامی کی باقاعدہ تعلیم دینے والے قومی مدرسوں کی تعداد آٹھ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے، جبکہ وفاق المدارس العربیہ بنگلہ دیش کے نام سے جو سب سے بڑا وفاق ہے، اس کے ساتھ صرف پندرہ سو مدارس ملحق ہیں اور اتحاد المدارس العربیہ کے نام سے دوسرے بڑے وفاق سے ملحق مدارس کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہاں حکومتی سطح پر دباؤ کی وہ صورت موجود نہیں جو پاکستان میں پائی جاتی ہے اور جس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

عالیہ مدارس میں ڈھاکہ کا عالیہ مدرسہ سب سے بڑا سمجھا جاتا ہے جس کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ ہم جب اس کے پرنسپل پروفیسر منصور الرحمٰن کے دفتر میں پہنچے اور ان سے اپنا تعارف کرایا تو وہ ہمیں غیر ملکی مہمان گردانتے ہوئے مدرسہ عالیہ کے تاریخی پس منظر سے آگاہ کرنے کے لیے پوری طرح

مستعد ہو گئے۔ پروفیسر صاحب موصوف دلچسپ بزرگ ہیں۔ میں نے جب بتایا کہ پاکستان سے آیا ہوں تو زیر لب ان کی زبان پر مشرقی پاکستان کا لفظ آیا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں اس سے قبل بھی یہاں آیا ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں، اس سے قبل ایک بار آچکا ہوں، مگر مشرقی پاکستان میں نہیں، بلکہ بنگلہ دیش میں ہی آیا تھا۔ یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے جب میں نے والد محترم مولانا سرفراز خان صفدر کے ہمراہ بنگلہ دیش کا سفر کیا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے مدرسہ عالیہ کے تاریخی پس منظر پر گفتگو شروع کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ مدرسہ عالیہ سب سے پہلے ۱۹۸۰ء میں کلکتہ میں انگریزوں نے قائم کیا تھا، جبکہ ابھی بنگال کے آخری مسلم حکمران سراج الدولہ شہید کو شکست دے کر بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کو صرف تئیس سال گزرے تھے۔ اس میں درس نظامی کے پورے نصاب کے ساتھ انگریزی اور دیگر جدید مضامین کو شامل نصاب کیا گیا تھا اور اس کے پرنسپل ۱۹۲۵ء تک غیر ملکی اور غیر مسلم ہی چلے آتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں پہلے مسلمان پرنسپل شمس العلماء خان بہادر کمال الدین احمد تھے جنہوں نے پرنسپل کے طور پر اس کا کنٹرول سنبھالا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان قائم ہوا تو اس عالیہ مدرسے کو ڈھاکہ منتقل کر دیا گیا اور اس کی لائبریری اور فرنیچر کو بحری جہاز کے ذریعے سے یہاں لایا گیا۔ تب سے یہ مدرسہ ڈھاکہ میں کام کر رہا ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ عالیہ مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب کی تفصیل مل جائے تاکہ ہم اندازہ کر سکیں کہ قومی مدرسوں اور عالیہ مدرسوں کے نصاب میں کیا فرق ہے؟ پروفیسر منصور الرحمٰن صاحب نے کافی تگ و دو کے بعد یہ نصاب مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے دفتر سے منگوا کر دیا، مگر یہ سب کا سب بنگلہ زبان میں تھا جس سے استفادہ ہمارے بس میں نہیں تھا۔ بہت کوشش کی کہ اردو، عربی یا انگلش میں کچھ تفصیل مل جائے مگر کامیابی نہ ہوئی، اس لیے ہم نے یہ نصابی کتابچے اپنے میزبان مولانا سلمان ندوی کے سپرد اس درخواست کے ساتھ کر دیے کہ وہ ہمیں اردو میں اس کا خلاصہ کر کے ارسال کر دیں۔ پروفیسر منصور الرحمٰن صاحب نے بتایا کہ وہ ذاتی طور پر قومی مدرسوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان سے محبت رکھتے ہیں، مگر ان سے ایک شکایت ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کا پوری طرح احساس نہیں کرتے اور جو اصلاحات ان کے اپنے مفاد میں ضروری ہوتی ہیں، ان کے لیے بھی

تیار نہیں ہوتے، ورنہ وہ دینی تعلیم کے فروغ کے لیے زیادہ بہتر کام کر رہے ہیں۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ہم تبلیغی مرکز چلے گئے اور ظہر کی نماز وہاں ادا کر کے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے مجھے کراچی کے لیے اور مولانا منصوری کو ممبئی کے لیے سفر کرنا تھا۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۳/ جنوری ۲۰۰۴ء)

کلیۃ الشریعہ کے نصاب سے متعلق دو روزہ سیمینار

میں دو روز سے جامعۃ الرشید کراچی میں ہوں۔ ۲۰/اگست اتوار کو عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ کے ہمراہ کراچی پہنچا تو سیدھا لانڈھی چلا گیا۔ معین آباد میں جامعہ عثمانیہ کے مہتمم مولانا حافظ اقبال اللہ نے علماء کرام کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مختلف احباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ لانڈھی سے متحدہ مجلس عمل کے ایم پی اے مولانا احسان اللہ ہزاروی بھی اس نشست میں شریک تھے۔ وہ ہمارے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں، جمعیت علمائے اسلام کے سرگرم رہنما ہیں اور پاکستان شریعت کونسل کی سرگرمیوں میں بھی ہمارے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ گلشن حدید فیزون کی جامع مسجد توحید میں ایک عرصہ سے خطابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ گزشتہ انتخابات میں لانڈھی سے ایم ایم اے کے ٹکٹ پر سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے مگر بیماری کے باعث زیادہ متحرک کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ شوگر کی زیادتی آنکھوں پر حملہ آور ہوئی ہے اور وہ بینائی سے کم و بیش محروم ہی ہو گئے ہیں۔ معمولی سا دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

وہ چونکہ پاکستان اسٹیل ملز کے علاقے میں رہتے ہیں اور ان کے مقتدیوں کی زیادہ تعداد اسٹیل ملز کے ملازمین پر مشتمل ہے، اس لیے میں نے ان سے عرض کیا کہ میں رات آپ کے ہاں رہنا چاہتا ہوں تاکہ وہاں کے چند احباب سے اسٹیل ملز کے بحران کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے، رات ہم نے وہیں قیام کیا اور چند احباب کے ساتھ متعلقہ امور پر بریفنگ کے انداز میں گفتگو ہوئی جس سے اسٹیل ملز کے حالیہ بحران کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔

۲۱/اگست پیر کو جامعہ الرشید میں کلیۃ الشریعہ کے نصاب پر نظر ثانی کے حوالے سے دو روزہ سیمینار کے لیے صبح ساڑھے نو بجے حاضری ہوئی۔ شیخ الحدیث مولانا حسن جان دامت برکاتہم کی

صدارت میں سیمینار کا آغاز ہوا اور دو روز میں اس کی مختلف نشستیں ہوئیں۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا عزیز الرحمٰن، مولانا محمد انور بدخشانی، مولانا مفتی محمد ازہر، مولانا عبد الرؤف غزنوی اور دیگر سرکردہ علماء کرام کے علاوہ دار العلوم زاہدان ایران سے مولانا مفتی محمد قاسم اور مولانا عبد القادر، جنوبی افریقہ سے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور مولانا مفتی عبد الرحیم نے سیمینار سے خطاب کیا۔

جامعۃ الرشید نے گریجویٹ اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے دینی علوم کی تعلیم و تربیت کا پانچ سالہ کورس شروع کر رکھا ہے جس میں اس اہم ضرورت کی تکمیل کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ عصری تعلیم سے بہرہ ور حضرات کو دینی تعلیم و تربیت سے اس حد تک آراستہ کر دیا جائے کہ وہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک باشعور اور باکردار مسلمان کی طرح خدمات سرانجام دے سکیں۔ یہ کورس اب تیسرے سال کے اختتام کے مرحلے میں ہے اور اب تک کے تجربات کی روشنی میں اس کو مزید بہتر بنانے اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے ارباب علم و دانش کی یہ دو روزہ محفل سجائی گئی تھی جو بحمد اللہ بہت مفید اور کامیاب رہی۔ آج اس کی آخری نشست کے بعد مجھ سے اس کے بارے میں تاثرات دریافت کیے گئے تو میں نے عرض کیا کہ خود ہم نے اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔

دو روزہ سیمینار میں علماء کرام کی گفتگو کی رپورٹ تو مختلف حوالوں سے قارئین کے سامنے آجائے گی اور اس میں پیش کی جانے والی تجاویز سے بھی قارئین آگاہ ہو جائیں گے مگر میں ایک عمومی تاثر کے طور پر کچھ گزارشات اس موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مقررین کی گفتگو اور شرکاء کے تبصروں میں یہ عنصر خاصا اہم رہا کہ بحمد اللہ تعالیٰ دینی مدارس میں طلبہ اور طالبات کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے شرکاء کو بتایا کہ اس سال پاکستان بھر میں پونے دو لاکھ کے لگ بھگ طلبہ اور طالبات وفاق المدارس العربیہ کے تحت مختلف درجوں میں دینی تعلیم کا امتحان دے رہے ہیں اور اس رجحان میں دن بدن وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہ خبر سیمینار کے شرکاء کے لیے خوشی کا باعث بنی، لیکن اس کے ساتھ یہ احساس بھی شدت کے ساتھ موجود رہا کہ تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ معیار میں کمی کا رجحان بھی سامنے آرہا ہے اور کیفیت کے بجائے کمیت پر زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے بتایا کہ وفاق المدارس کے اکابرین بھی اس کا

نوٹس لے رہے ہیں اور اعلیٰ سطح پر اس کے بارے میں سوچا جا رہا ہے کہ کیفیت اور معیار کو بہتر بنانے کے لیے کون سے عملی اقدامات ضروری ہیں۔ بہرحال یہ بات بہت حد تک قابلِ اطمینان ہے کہ مدارس کے حلقوں میں تعلیمی دائرے میں وسعت پر خوشی کے ساتھ ساتھ معیار اور کیفیت کے متاثر ہونے کا احساس بھی پایا جاتا ہے اور ارباب حل وعقد اس کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہیں۔

نصاب کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے اور اس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ضروری ردوبدل کے ساتھ ساتھ استاد اور طالب علم کے معیار کو بہتر بنانے کی بات بھی شرکائے سیمینار کی گفتگو میں غالب رہی۔ اس سلسلے میں مولانا عبد الرؤف غزنوی نے دارالعلوم دیوبند کے ایک عظیم بزرگ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ کے حوالے سے ایک دلچسپ اور سبق آموز بات بتائی کہ حضرت بلیاوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم کے تین ارکان ہیں: استاذ، طالب علم اور نصاب۔ ان میں سے دو جاندار ہیں اور ایک بے جان ہے۔ چونکہ نصاب بے جان ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور دوسرے دونوں جاندار رکن اپنا اپنا دفاع کر سکتے ہیں، اس لیے دونوں جاندار اپنی اپنی کوتاہیوں کا سارا بوجھ بے جان نصاب پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ اصل کام معلم اور متعلم کا ہوتا ہے اور وہ اگر مخلص، باصلاحیت اور محنتی ہوں تو نصاب کی کمزوریوں کو رفع کیا جا سکتا ہے، اس لیے اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ استاذ کو صحیح معنوں میں استاذ بنایا جائے اور طالب علم میں طلب علم کا ذوق بیدار کیا جائے تاکہ وہ محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکے۔

سیمینار میں استاذ کی تربیت کا مسئلہ خصوصی طور پر زیر بحث رہا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ اساتذہ کو نہ صرف تعلیم و تربیت کے فن سے مستقل طور پر آراستہ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ دینی و اخلاقی تربیت اور روحانی معیار کے حوالے سے بھی ان کی خصوصی تربیت ضروری ہے کیونکہ استاذ صرف تعلیم نہیں دیتا بلکہ طالب علم کے ذہن، اعمال اور اخلاق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

کم و بیش تمام مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ اساتذہ کی فنی و عملی تربیت کا خصوصی نصاب طے کیا جائے اور کسی بھی مدرسہ میں تدریس کے منصب کے لیے اسے ضروری قرار دیا جائے۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے اس حوالے سے بتایا کہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے دستور میں اس سے قبل اساتذہ کی تربیت اہداف میں شامل نہیں تھا مگر اب دستور میں ترمیم کر کے اسے اہداف میں شامل کر لیا گیا ہے اور اس کے لیے نصاب اور دیگر ضروری امور کی ترتیب و تشکیل کا کام ہو رہا

ہے۔

سیمینار میں تیسری اہم بات جو عام طور پر موضوع گفتگو رہی، نصاب میں جدید کتابوں سے استفادہ اور طرز تدریس کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی تھی۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ کتاب فہمی کے ساتھ ساتھ علم اور فن کے ساتھ مناسبت کو بھی اہداف میں شامل کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے اساتذہ کی خصوصی تربیت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ پرانی کتابوں کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں نئی کتابوں میں سے بھی انتخاب کیا جائے، مشکل زبان کے بجائے آسان زبان کو ترجیح دی جائے، علم وفن کو بطور علم وفن پڑھا جائے اور کتاب فہمی کے معیار کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جائے، خاص طور پر عربی زبان کی تعلیم میں جدید اسلوب اور طریق کار سے استفادہ کیا جائے۔ سیمینار کے صدر مولانا حسن جان دامت برکاتہم نے بھی اس طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ مشکل پسندی اور لفظوں اور جملوں کی غیر ضروری بحثوں سے گریز کرتے ہوئے علم اور کتاب کے مفہوم پر زیادہ توجہ دی جائے اور عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی مہارت پیدا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

ایک اور اہم مسئلہ جس کا سیمینار میں متعدّد شرکاء نے خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا، عقائد کی تعلیم کے نصاب اور مواد پر نظر ثانی کا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ذکر کیا گیا کہ ہمارے ہاں منصوص عقائد کی بطور عقیدہ تعلیم سے زیادہ زور عقائد کے فلسفیانہ مباحث پر دیا جاتا ہے جبکہ اس سے قبل منصوص عقائد کی تعلیم ضروری ہے۔ دوسرا پہلو گفتگو میں یہ نمایاں رہا کہ اس وقت نصاب میں شامل عقائد کی کتابوں میں جن امور اور مباحث کا تذکرہ موجود ہے، وہ یونانی فلسفہ کی پیداوار ہیں مگر اب نئے دور میں مغربی فلسفہ نے عقائد کے حوالے سے جو مسائل کھڑے کر دیے ہیں اور جن شکوک و شبہات کو جنم دیا ہے، ان کا عقائد کی مروجہ نصابی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

دو روزہ سیمینار کا اصل عنوان جامعہ الرشید کے کلیۃ الشریعہ کا نصاب تھا لیکن عمومی گفتگو کا دائرہ درس نظامی کے مجموعی نظام و نصاب تک وسیع رہا اور اس کے ضمن میں کلیۃ الشریعہ کے نصاب پر بھی ایجنڈے کے ایک حصہ کے طور پر گفتگو ہوتی رہی۔ کم و بیش سبھی شرکاء نے کلیۃ الشریعہ کی اہمیت و ضرورت سے اتفاق کیا اور اب تک کی پیشرفت پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس میں مزید بہتری کے لیے تجاویز پیش کیں۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے دینی تعلیم کے اہتمام کی ضرورت پر زور دیا گیا اور اس کے ساتھ اس ضرورت کا ذکر بھی کیا گیا کہ جس طرح جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے دینی

تعلیم کے اس طرح کے کورسز ضروری ہیں، اسی طرح دینی مدارس کے فضلاء کے لیے بھی عصری علوم کے کورسز کی ضرورت ہے۔ بعض ارباب علم نے اس طرف توجہ دلائی کہ جدید علوم سے اجمالی واقفیت اور ان کی بنیادی اصطلاحات اور معلومات سے آگاہی تو ہر عالم دین کے لیے ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر علماء کرام قومی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کو ان کی زبان، اسلوب اور اصطلاحات میں دین کی تعلیم اور پیغام نہیں پہنچا سکیں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری شعبوں میں تخصص کے درجات کا قیام بھی اہم ضرورت ہے۔ ذہین علماء کرام کو معیشت کے جدید علم اور بینکاری کی تعلیم دی جانی چاہیے کیونکہ اسلامی بینکاری کا دائرہ پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے لیکن انہیں اسلامی علوم سے بہرہ ور ماہرین معیشت مشورہ اور رہنمائی کے لیے نہیں مل رہے اور اس شعبہ میں بڑا خلا پایا جاتا ہے۔ صحافت کا ذوق رکھنے والے علماء کو اردو، عربی اور انگلش میڈیا کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے صحافت کی تربیت دی جانی چاہیے کیونکہ میڈیا آج کے دور کا بڑا ہتھیار ہے اور اسلامی عقائد و احکام کے خلاف پروپیگنڈا اور مسلمانوں کی کردارکشی کا سب سے بڑا مورچہ یہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ علماء کرام اس شعبہ میں آگے بڑھیں اور پوری مہارت اور تکنیک کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کے جواب و دفاع کے لیے شعوری محنت کریں۔

جامعۃ الرشید کی یہ کوشش بھی قابلِ داد ہے کہ اس نے ایک اہم موضوع پر ملک بھر سے ارباب علم و دانش کو جمع کیا اور فکری و علمی مباحثہ کا اہتمام کر کے تعلیم و تربیت کے شعبہ میں اجتماعی مشاورت اور راہنمائی کا ایک فورم قائم کیا۔ راقم الحروف نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی سے کیا کہ جامعۃ الرشید اور اس کی سرگرمیاں میرے بہت پرانے خواب کی عملی تعبیر ہے، اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی ہے اور میں اس کی مسلسل ترقی اور کامیابی کے لیے ہمہ وقت دعاگو ہوں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، ۲۵/ اگست ۲۰۰۶ء)

دینی مدارس کے منتظمین سے ایک گزارش

ہمارے معاشرے میں عام آدمی کا تعلق دینی تعلیم کے ساتھ قائم رکھنے اور دینی علوم کی حفاظت و ترویج کے لیے دینی مدارس نے گزشتہ سو، سوا سو برس میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ بلاشبہ ہماری ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور کسی سرکاری امداد کے بغیر عام لوگوں کے رضاکارانہ تعاون سے انتہائی سادگی، قناعت اور کم سے کم خرچ کے ساتھ اپنے اہداف میں پیشرفت کر کے دینی مدارس کے اس نیٹ ورک نے جو سب سے بڑا مقصد حاصل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مفکر پاکستان کا یہ خطہ اسپین بننے سے بچ گیا ہے اور صدی سے زیادہ عرصہ تک فرنگی اقتدار اور مغرب کی فکری اور ثقافتی یلغار کا شکار رہنے کے باوجود اس خطہ کے مسلمانوں کا اپنے دینی عقائد، روایات، ماضی اور اسلاف کے ساتھ ذہنی رشتہ نہ صرف قائم ہے بلکہ دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے اور یہی بات مغرب کی سیکولر لابیوں کے لیے پریشانی کا سب سے بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہے جس کا اظہار ان دینی مدارس کے خلاف مغربی ابلاغ کے منفی پراپیگنڈا اور کردار کش مہم سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔

ان دینی مدارس نے اسلامی علوم و اقدار کے تحفظ و دفاع کی جنگ کامیابی کے ساتھ لڑی ہے اور اس کے تحفظاتی اور دفاعی جنگ کے دور میں دینی مدارس کے منتظمین نے بہت سے ایسے ”تحفظات“ اختیار کر لیے تھے جو عام لوگوں اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر اس دفاعی جنگ کو صحیح ترتیب کے ساتھ لڑنے کے لیے ضروری تھے اور ان ”تحفظات“ کے بغیر یہ مدارس نہ اپنی صف بندی صحیح رکھ سکتے تھے اور نہ ہی متعیّن اہداف کی طرف ضروری پیشرفت ان کے لیے ممکن تھی۔ انہی تحفظات میں ایک بات دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں ان مدارس کے منتظمین اور اساتذہ کا بے لچک رویہ تھا کہ وہ تمام تر تحریص و تخویف کے باوجود نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کو قبول اور اختیار کرنے کے روادار نہیں ہوئے اور ”اصحاب کہف“ کی طرح ایک غار میں داخل ہو کر خود کو ارد گرد کے ماحول سے کلی طور پر لاتعلق کر لیا۔ یہ بات بہت سے دانشوروں کے نزدیک

قابلِ اعتراض تھی مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طرزِ عمل اس ہدف کی طرف بڑھنے کے لیے ناگزیر تھا جو دینی مدارس قائم کرتے وقت اس تحریک کے بانیوں کے ذہنوں میں تھا، کیونکہ اگر یہ دینی مدارس اپنی جداگانہ روش ترک کر کے ''اجتماعی دھارے'' کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جاتے تو ان کی آخری منزل بھی عملاً وہی ہوتی جو اجتماعی دھارے کے لیے اس دھارے کی حدود متعیّن کرنے والوں نے طے کر رکھی تھی۔ اور اگر یہ دینی مدارس اجتماعی دھارے کے ساتھ بہہ جانے کی بجائے اس اجتماعی دھارے کا رخ اپنے اہداف کی طرف موڑنے کی کوشش میں کامیاب دکھائی دے رہے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ وہی ''بے لچک رویہ'' ہے جو ان دینی مدارس نے اپنے نصاب و نظام کے حوالہ سے اختیار کیے رکھا اور تمام تر طعن و تشنیع اور تنقیدات و اعتراضات کے باوجود انہوں نے اپنی مقرر کردہ حدود سے باہر جھانکنے سے بھی گریز کیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی باشعور شخص صرفِ نظر نہیں کر سکتا مگر وقت اب بہت آگے بڑھ گیا ہے اور ہم تحفظ اور دفاع کے دور سے نکل کر پیش قدمی اور اقدام کے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت اور پاکستان میں طالبان کی طرز کے اسلامی نظام کی خواہش کا ہر سطح پر اظہار اس پیش قدمی اور اقدام کے دور کا عملی آغاز ہے، اس لیے ہماری دیانت دارانہ رائے ہے کہ دینی مدارس کو اب ان ''تحفظات'' پر زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہیے جو تحفظ اور دفاع کی جدوجہد کے لیے ضروری تھا مگر پیش قدمی اور اقدام کی جدوجہد کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ دینی مدارس کے اربابِ حل و عقد کو ''دفاعی جنگ'' اور ''اقدامی پیشرفت'' کے درمیان فرق کا ادراک کرنا چاہیے اور ان ضروریات کا احساس کرنا چاہیے جو اسلام کے نفاذ کے حوالے سے ناگزیر تقاضوں کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان دینی اداروں اور مدارس کے علاوہ اور کوئی قابلِ اعتماد نظام اس وقت موجود نہیں۔

مثلاً انہی ضروریات میں ایک ضرورت اسلامی نظام کو چلانے کے لیے ''رجال کار'' کی فراہمی کی ہے اور ایسے افراد کی تیاری انتہائی ضروری ہے جو دینی علوم پر ماہرانہ دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ آج کے عالمی نظام اور ملک کے اندرونی سسٹم کے اہم پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہوں اور خرابیوں کی نشان دہی کے علاوہ ان کو دور کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ ایسے افراد اگر دینی مدارس تیار

نہیں کریں گے تو انہیں یہ بات نوٹ کر لینی چاہیے کہ کوئی اور ادارہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس ضرورت کو پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہو، اس لیے جس طرح دفاع اور تحفظ کے دور میں دینی مدارس نے وقت کے چیلنج کو قبول کر کے خود کو اس مشن کے لیے وقف کر دیا تھا، اس طرح انہیں پیشرفت اور اقدام کے نئے دور کا چیلنج بھی قبول کرنا ہوگا اور اگر خدانخواستہ ان کی سستی اور بے پروائی سے اقدام اور پیشرفت کی یہ جدوجہد کامیابی کے مطلوبہ اہداف حاصل نہ کر سکی تو اس کی ذمہ داری عند اللہ اور عند الناس انہی مدارس پر ہوگی اور ان کا کوئی عذر اس بارے میں نہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسموع ہوگا اور نہ ہی تاریخ اپنے صفحات میں اسے جگہ دینے کو تیار ہوگی۔ چنانچہ دینی مدارس کے جو مختلف وفاق مختلف مذہبی مکاتب فکر کے حوالے سے کام کر رہے ہیں، ان سب کے ارباب بست و کشاد سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے اپنے طور پر اور مشترکہ طور پر بھی نفاذ اسلام کی عملی ضروریات کا جائزہ لیں اور انہیں اپنے نصاب و نظام میں ایڈجسٹ کرنے کی راہ نکالیں تاکہ وہ وقت کے اس چیلنج کا صحیح طور پر سامنا کر سکیں جو اسلامی نظام کے نفاذ و تطبیق کے ضمن میں اس وقت دینی حلقوں کو درپیش ہے۔

اس اصولی گزارش کے ساتھ ایک عملی تجویز بھی ہم ان وفاقوں اور بڑے دینی مدارس کے منتظمین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کہ سردست درس نظامی کے فضلاء کے لیے بڑے مدارس میں ایک خصوصی کورس کا اہتمام کیا جائے جس کا سرسری خاکہ ہمارے ذہن میں یوں ہے:

- ان فضلاء کو دنیا کے بڑے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرایا جائے۔
- تاریخ عالم اور تاریخ اسلام ترتیب کے ساتھ پڑھائی جائے۔
- مختلف شعبہ ہائے زندگی کے حوالے سے اسلام کا بطور نظام مطالعہ کرایا جائے۔
- اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں رائج نظاموں سے متعارف کرایا جائے۔
- مغرب کے سیکولر فلسفہ اور نظام سے کماحقہ روشناس کرایا جائے۔
- عربی اور انگریزی زبان پڑھائی جائے اور کم از کم اردو میں صحافتی اسلوب کے ساتھ مضمون نویسی کی مشق کرائی جائے۔
- مطالعہ اور تحقیق کا ذوق بیدار کیا جائے اور مختلف موضوعات پر اچھی گفتگو اور اچھی تحریر کا سلیقہ پیدا کیا جائے۔

- اس دوران میں جو فضلاء میٹرک پاس نہیں ہیں، انہیں میٹرک کی تیاری کرادی جائے اور جو میٹرک کر چکے ہیں، انہیں ایف اے کی تیاری کرائی جائے۔

یہ کورس دو سال کا ہو تو زیادہ بہتر طریقہ کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے اور اگر ضروری ہو تو اسے کھینچ تان کر ایک سال کے دورانیہ میں بھی ایڈجسٹ کیا جا سکتا ہے۔ اس کورس کے اختتام پر امتحان پاس کرنے والے فضلاء کو ''شہادۃ التکمیل'' کی باقاعدہ سند دی جائے اور اس کے لیے فضلاء کو باقاعدہ مہم کی صورت میں تیار کیا جائے۔ امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد اس تجویز کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور آنے والے دور کی ناگزیر ضروریات کا ادراک کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کے لیے عملی پیشرفت سے گریز نہیں کریں گے۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

وفاق المدارس کے ایک فیصلہ پر چند گزارشات

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کی کارروائی کی رپورٹ اس وقت میرے سامنے ہے جو وفاق کے سہ ماہی مجلہ میں شائع ہوئی ہے۔ مدارس دینیہ کے حوالہ سے قومی اور عالمی سطح پر اس وقت جو سرگرمیاں سامنے آ رہی ہیں، ان کے پیش نظر وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کے ان فیصلوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جن کا ذکر اس رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ وفاق المدارس کے فیصلوں میں پالیسی کے حوالہ سے سب سے اہم فیصلہ یہ ہے کہ دینی مدارس کسی قسم کی سرکاری امداد قبول نہیں کریں گے حتیٰ کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جہاں متحدہ مجلس عمل اقتدار میں ہے، وہاں بھی سرکاری امداد وصول نہیں کی جائے گی جبکہ جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن کے حوالے سے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت امریکہ نے پاکستان کو چھ سو ملین ڈالر کی خطیر رقم اس مقصد کے لیے مہیا کی ہے کہ ان مدارس کی اصلاح کی جائے اور قومی دھارے میں شامل کرنے کے عنوان سے انہیں سیکولر بنایا جائے مگر وفاق المدارس نے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ادھر اسلام آباد میں جرمنی کے سفیر گزشتہ روز پشاور میں دار العلوم سرحد کے دورے پر گئے ہیں جو جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے اہم مراکز میں سے ہے اور وہاں دار العلوم کے منتظمین سے بات چیت کرتے ہوئے اس بات پر جرمن سفیر نے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس امریکہ کی مالی امداد قبول کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ اس کے ساتھ وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اہم فیصلہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا ہے جس میں میٹرک تک مروجہ عصری تعلیم کو نصاب کا لازمی حصہ بنا دیا گیا ہے اور دوسرے شعبوں میں بھی بعض مضامین اور کتابوں میں ردوبدل کیا گیا ہے۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں اس حوالہ سے مختلف دینی مدارس کے اساتذہ کی دو روزہ مشاورت کا اہتمام کیا گیا ہے جو چار پانچ دسمبر ۲۰۰۳ء کو ہو رہی ہے اور اس میں نصاب اور طلبہ کی فکری و اخلاقی تربیت کے تقاضوں سے متعلق امور پر غور کیا جائے گا۔ ہماری ایک عرصہ سے یہ خواہش اور کوشش

رہی ہے کہ تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے بارے میں دینی مدارس کے اساتذہ کی رائے بھی سامنے آنی چاہیے اور ہم نے مختلف مواقع پر وفاق المدارس کے ذمہ دار حضرات سے گزارش کی ہے کہ دینی مدارس کے تجربہ کار اور سینئر اساتذہ کی ایک ورکشاپ ہر سال وفاق کے زیر اہتمام ہونی چاہیے جس میں متعلقہ مسائل پر اساتذہ کی رائے معلوم کرنے کے ساتھ ساتھ ضروری امور پر اساتذہ کی بریفنگ کا بھی اہتمام کیا جائے کیونکہ ہمارے ہاں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظام نہیں ہے جبکہ تدریس ایک مستقل فن ہے جس کے لیے دنیا کے تمام تعلیمی نظاموں میں الگ کورسز ہوتے ہیں اور ان کورسز کی تکمیل کے بعد ہی کسی کو تدریس کے منصب پر فائز کیا جاتا ہے، مگر ہمارے ہاں اس کا کوئی نظم نہیں ہے اور ہماری رائے میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کو تدریس و تربیت کے فن کے لیے کم از کم ایک سالہ کورس کا ضرور اہتمام کرنا چاہیے۔ تاہم اس کے باقاعدہ اہتمام تک اساتذہ کے مشاورتی اجتماعات کا وقتاً فوقتاً انعقاد کرنے سے بھی مسائل اور ضروریات کی طرف توجہ دلانے کی حد تک تھوڑا بہت مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس مشاورتی پروگرام میں مختلف دینی مدارس کے اساتذہ کو نصاب اور طلبہ کی اخلاقی و فکری تربیت کے حوالہ سے بحث و مباحثہ کی دعوت دی ہے اور اس کے نتائج ان شاء اللہ تعالیٰ اس کالم میں بھی پیش کیے جائیں گے۔

البتہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلہ کے بارے میں کچھ گزارشات سرِدست پیش کی جا رہی ہیں جو ''دورۂ مقارنۃ الادیان والفرق'' کے بارے میں ہے۔ وفاق نے اس سے قبل یہ فیصلہ کیا تھا کہ دورۂ حدیث کے طلبہ کا مختلف ادیان اور فرقوں سے واقف ہونا ضروری ہے، اس لیے وفاق اس مقصد کے لیے خصوصی دورہ کا اہتمام کرے گا اور اس میں شریک ہونے والوں کی ہی وفاق المدارس کی آخری ڈگری ''شہادۃ العالمیہ'' جاری کی جائے گی، مگر مجلس شوریٰ نے یہ کہہ کر یہ فیصلہ واپس لے لیا ہے کہ وفاق کے لیے اس کا انتظام مشکل ہے۔ جو مدارس اپنے طور پر اس کا اہتمام کر سکیں، کر لیں۔

ادیان و مذاہب کے لیے دینی مدارس کے فضلاء کو باقاعدہ طور پر واقف کرانے کی تجویز پیش کرنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل ہے اور کم و بیش گزشتہ دس پندرہ برس سے مدارس کے ارباب بست و کشاد کو اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مدارس دینیہ کے فضلاء کو معاصر ادیان و مذاہب

سے اس حد تک ضرور واقف ہونا چاہیے کہ وہ اس کے بارے میں کسی جگہ گفتگو کرتے ہوئے محض قیاس و گمان اور سنی سنائی باتوں تک محدود نہ رہیں، بلکہ ان کی گفتگو کی بنیاد مستند معلومات پر ہو، اور چونکہ اب دنیا سمٹ رہی ہے اور ادیان و مذاہب کے حوالہ سے مشترکہ سوسائٹیاں تشکیل پا رہی ہیں، اس لیے کسی بھی عالم دین کا اپنے معاصر ادیان و مذاہب کے بارے میں ضروری اور مستند معلومات سے بہرہ ور ہونا اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے، لیکن ہمارے ہاں اس بات کو دوسرے معنوں میں لیا جاتا ہے اور اس تجویز کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح کچھ عرصہ قبل تک طلبہ کو مختلف مذاہب کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کی تربیت دی جاتی تھی، مناظرانہ انداز میں دونوں طرف کے دلائل رٹا کر ان کے جوابات سکھائے جاتے تھے اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ کورسز ہوتے تھے، یہ تجویز ان دوروں کے دوبارہ اور باقاعدہ اہتمام کے لیے پیش کی جا رہی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ مجھے مناظرہ و مباحثہ کی تیاری سے انکار نہیں ہے اور میں اس کی افادیت کا قائل ہوں مگر وہ صرف ایک جزو ہے جبکہ تجویز کا اصل مقصد اور تناظر اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ تجویز کا اصل مقصد یہ ہے کہ مثلاً عیسائی مذہب ہے، ہمارے فاضل علماء کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسیحی مذہب کا تاریخی پس منظر کیا ہے، اس کے بڑے بڑے فرقے کون کون سے ہیں، ان کا مسلمانوں کے ساتھ عقائد میں کیا اختلاف ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تہذیبی فرق کیا ہے، گزشتہ چودہ سو برس میں ان کے باہمی تعلقات کی کیا نوعیت تھی، صلیبی جنگوں کی مختصر تاریخ کیا ہے، مذہبی دور کی عیسائی حکومتوں کے ساتھ ہمارا کیا جھگڑا تھا، آج کی غیر مذہبی اور سیکولر مسیحی حکومتوں کے ساتھ کیا تنازع ہے، مسلم مسیحی کشمکش کی موجودہ صورت حال کیا ہے اور عالمی مسیحی ادارے اور مشنریاں کس کس محاذ پر اور کس کس طریقہ کار سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ عقائد کے بارے میں دونوں طرف کے دلائل سے واقفیت اور مناظرہ و مباحثہ کی تیاری بھی ہو جائے تو یہ سونے پر سہاگہ کا کام دے گی۔ اسی طرح دیگر معاصر مذاہب کے بارے میں ہمارے فضلاء کو بنیادی معلومات حاصل ہونی چاہئیں ورنہ موجودہ بین الاقوامی ماحول میں وہ دین کی صحیح طور پر خدمت نہیں کر سکیں گے۔

اس کے علاوہ اسلام کے داخلی مذاہب مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور ظاہری کی تاریخ، باہمی فرق اور علمی و فکری کشمکش سے بھی فضلاء کا واقف ہونا ضروری ہے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے اور وفاق

المدارس کو اس سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اپنے تجربہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ سال مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ہم نے دورۂ حدیث کے طلبہ کے لیے تین مضامین کا اضافہ کیا:

۱۔ مروجہ بین الاقوامی قوانین کا اسلامی احکام سے موازنہ،

۲۔ معاصر ادیان کا تعارفی مطالعہ، اور

۳۔ تاریخ اسلام۔ اس کے لیے ہفتہ میں دو پیریڈ رکھے گئے اور سال میں ان میں سے ہر ایک پر کم و بیش بارہ بارہ لیکچر ہوئے جو میں نے خود دیے ہیں، البتہ انداز تدریسی نہیں بلکہ بریفنگ یعنی معلومات فراہم کرنے کا تھا جس سے طلبہ کو بہت فائدہ ہوا اور ہمیں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی، جبکہ اس سال اسے زیادہ مربوط اور منظم انداز میں آگے بڑھانے کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح فضلائے درس نظامی کے لیے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ایک سالہ خصوصی تربیتی کورس کا اہتمام کیا گیا جس میں ان مضامین کے علاوہ حجۃ اللہ البالغۃ کے منتخب ابواب، انگریزی زبان، عربی زبان، کمپیوٹر ٹریننگ اور سیاسیات نفسیات اور معاشیات کا تعارفی مطالعہ جیسے مضامین شامل تھے۔ جن فضلاء نے اس کورس میں شمولیت کی، وہ بہت خوش ہیں اور اس کی بہت افادیت محسوس کر رہے ہیں جس کی وجہ سے اس سلسلے کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس سال کے لیے داخلے کی درخواستیں طلب کر لی گئی ہیں۔ یہ ایک محدود سا تجربہ ہے جو وسائل اور مواقع کے محدود تر ہونے کے باوجود کامیاب رہا ہے، اس لیے وفاق المدارس کی مجلس شوریٰ کا یہ کہنا کہ اس کے لیے ایسا کرنا مشکل ہے، کم از کم میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔

جہاں تک مشکلات کا تعلق ہے، وہ تو ہر کام میں ہوتی ہیں اور مشکلات سے گزر کر ہی کسی کام میں آگے بڑھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تو الگ بات ہے، لیکن اگر واقعتاً اس کی ضرورت ہے تو کسی ضروری کام سے یہ کہہ کر پیچھے ہٹ جانا کہ یہ مشکل نظر آتا ہے، کسی طرح بھی اصحاب عزم و ہمت کے شایان شان نہیں ہے۔

(روزنامہ اسلام، ۲۰۰۳ء)

دینی مدارس میں جدید فکر و فلسفہ کی تعلیم

۲۸ / اپریل ۲۰۰۷ء کو لاہور میں ممتاز اہل علم و دانش کی ایک مجلس میں حاضری کا موقع ملا۔ اس کا اہتمام جوہر ٹاؤن میں واقع پنجاب قرآن بورڈ کے دفتر میں جامعہ خیر المدارس ملتان کے مہتمم مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے کیا تھا اور ایجنڈا یہ تھا کہ جامعہ خیر المدارس ملتان نے لاہور میں جوہر ٹاؤن کے قریب اپنی ایک شاخ قائم کی ہے جس کے لیے تعمیر کا ایک مرحلہ مکمل ہو چکا ہے اور اس کے لیے تعلیمی پروگرام طے کرنے کی غرض سے قاری صاحب محترم نے ملک کے ممتاز ارباب علم و دانش کو اس مشاورتی نشست میں جمع کیا تھا۔ شرکائے محفل میں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان، ڈاکٹر محمود احمد غازی، مولانا اسعد تھانوی، مولانا مشرف علی تھانوی، ڈاکٹر سعد صدیقی اور دیگر حضرات کے علاوہ ایران کے بزرگ عالم دین اور دارالعلوم زاہدان کے سربراہ مولانا محمد قاسم بھی تھے جو جامعہ اشرفیہ لاہور کے ساٹھ سالہ اجتماع میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر قاری محمد حنیف جالندھری صاحب مجھے بھی یاد کر لیا کرتے ہیں اور میرے لیے بہت سے حضرات سے بیک وقت استفادہ آسان ہو جاتا ہے۔

قاری موصوف کی بیان کردہ تفصیلات کے مطابق جامعہ خیر المدارس ملتان کی لاہور شاخ کے حوالہ سے ان کے اہداف کچھ اس طرح کے ہیں کہ:

- بچوں اور بچیوں کے لیے جدید معیار کے ایک ایسے اسکول کا قیام جس میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم اور تربیتی ماحول فراہم کیا جائے۔
- دینی مدارس کے فضلاء کے لیے ایسے کورسز کا اہتمام جن میں انہیں انگلش زبان، دیگر مذاہب اور تحریکات کے تعارف، قانون و سیاست اور اسلام کو درپیش جدید چیلنجز کے حوالے سے ضروری تیاری کرائی جائے۔
- تاجر حضرات، ملازمین اور اس طرح کے دیگر طبقات کے لیے فہم دین کے شارٹ کورسز

جن کے ذریعے سے وہ ضروریات دین سے واقف ہوں اور ایک اچھے مسلمان کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔

- غیر مسلم حضرات جو اپنے مذہب کے دائرے سے نکل کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور اپنے ماحول سے کٹ جاتے ہیں، ان کی کفالت، دینی تعلیم اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رفاہی تعلیمی ادارے کا قیام۔
- سلوک و احسان اور دین کی عملی و اخلاقی تربیت کے لیے خانقاہی نظام کی روشنی میں مناسب تربیتی ماحول کے قیام کی کوشش۔
- اسکولوں اور کالجوں میں تعطیلات کے دوران میں ان کے طلبہ اور طالبات کے لیے قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم کے شارٹ کورسز کا اہتمام۔
- نئے مسائل کی تحقیق اور شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ان کے حل کے لیے ایک ریسرچ سنٹر کا قیام جس میں جید علماء کرام اور اربابِ دانش امت مسلمہ کی علمی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔
- ایک معیاری ویب سائٹ کا قیام جس کے ذریعے سے ضروری دینی و ملی معاملات میں امت مسلمہ کی راہنمائی کی جا سکے، وغیرہ۔

ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو ترجیحاً قابلِ توجہ نہ ہو اس لیے سب حضرات نے اس ایجنڈے سے اتفاق کیا اور خوشی کا اظہار کیا۔ میرے لیے یہ خوشی اس حوالے سے زیادہ باعث کشش تھی کہ میں گزشتہ ربع صدی سے دینی مدارس کے حلقوں میں یہی صدا بلند کرتا آرہا ہوں اور اگرچہ میرے ایجنڈے میں اس کے علاوہ اور باتیں بھی شامل ہیں، لیکن بہرحال یہ کیا کم ہے کہ اس صدا کی بیشتر باتیں اب ملک کے بڑے بڑے دینی مدارس کے مہتمم حضرات کی زبان پر ہیں اور مختلف اطراف سے انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔

شرکاء کو اس سلسلے میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق ریکٹر جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن خان، اسی یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر محمود احمد غازی اور جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اپنے تجربات وخیالات سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا جو ہم سب کے لیے باعث استفادہ تھا، مگر دو

باتیں میرے لیے زیادہ اطمینان کا باعث بنیں۔ ایک یہ کہ دینی مدارس میں جدید مغربی فکر و فلسفہ کو بطور فن پڑھانے کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور اگرچہ اس سلسلے میں کوئی مرتب نصاب موجود نہیں ہے، لیکن مختلف حلقوں میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سمت میں پیشرفت کی صورت پائی جاتی ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی نے بتایا کہ ان کے ہاں دارالعلوم کراچی میں پروفیسر محمد حسن عسکری مرحوم کی کتاب ''جدیدیت'' ایک نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی ہے جس میں ارسطو سے لے کر برٹرینڈ رسل تک مغربی مفکرین کے فکر و فلسفہ کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تعارف کرایا جاتا ہے اور مولانا محمد تقی عثمانی کا کہنا ہے کہ پروفیسر حسن عسکری نے یہ کتاب انہی کے کہنے پر اس مقصد کے لیے لکھی تھی۔

ہمارے ہاں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں گزشتہ کئی سالوں سے یہ معمول ہے کہ دورۂ حدیث کے طلبہ کو میں خود اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر دفعہ وار سبقاً سبقاً پڑھاتا ہوں اور اسلامی احکام و تعلیمات کے ساتھ ان کے تقابلی جائزہ کے ساتھ ساتھ اس چارٹر کے فکری، علمی اور تاریخی پس منظر سے بھی دورۂ حدیث کے طلبہ کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان علماء کے لیے آج کی عالمی تہذیبی کشمکش اور مغرب اور مسلمانوں کے درمیان جاری ثقافتی بالادستی کی جنگ کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

میرے نزدیک دارالعلوم کراچی اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں مغربی فکر و فلسفہ کی تعلیم کے حوالے سے ہونے والی پیشرفت بالکل ابتدائی نوعیت کی ہے اور اسے صحیح رخ پر آگے بڑھانے کے لیے ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے، لیکن بہرحال اس ضرورت کا احساس اور اس کو پورا کرنے کی عملی کوششوں کا آغاز بہت خوش آئند ہے۔

دینی مدارس کے فضلاء کو آج کی ضروریات کے لیے تیار کرنے اور تربیت دینے کے لیے جن کورسز کی ضرورت ہے، وہ بھی بہت اہم مسئلہ ہے۔ گزشتہ دنوں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی مجلس عاملہ کے ملتان میں ہونے والے اجلاس میں بھی ان کورسز کے لیے جو ہماری اصطلاح میں ''تخصصات'' کہلاتے ہیں، پیشرفت کا فیصلہ کیا گیا ہے اور مجلس عاملہ نے اس سلسلے میں سفارشات اور

تجاویز مرتب کرنے کا کام میرے ذمہ لگایا ہے جو اگرچہ بہت کٹھن اور مشکل کام ہے اور میری استعداد اور اہلیت سے بہت بڑھ کر ہے، لیکن میں نے وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھتے ہوئے اسے ایک آزمائش اور چیلنج کے طور پر قبول کر لیا ہے اور اس کے لیے قارئین سے خصوصی دعا کی درخواست کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے کی توفیق دیں۔ (آمین ثم آمین)

دوسرا مسئلہ جو اس مجلس میں زیادہ دلچسپی کے ساتھ زیر بحث آیا، دینی مقاصد کے لیے الیکٹرانک میڈیا کے استعمال کا ہے۔ ہمارے حلقوں میں تصویر، ویڈیو اور اسکرین کے بارے میں ابھی تک تحفظات پائے جاتے ہیں اور ان کے شرعی جواز یا عدم جواز پر بحث جاری ہے، لیکن ملی اور دینی مقاصد کے لیے ان کی ضرورت کا احساس بھی مسلسل بڑھ رہا ہے۔ جو مفتیان کرام اس کے عدم جواز پر زور دے رہے ہیں، ان کی بات شرعی دلائل کے حوالے سے کمزور نہیں ہے، لیکن اس کی ضرورت کا پہلو بھی کمزور نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے جواز کا فتویٰ دینے کی صورت میں جن خرابیوں میں اضافہ ہو سکتا ہے، وہ بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں، لیکن بہر حال یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اجتہادی صلاحیت کے حامل علماء کرام شرعی اصولوں اور حالات زمانہ کے دائرے میں کوئی بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اب سے ربع صدی قبل جنوبی ایشیا کے ایک نامور مفتی حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے سینما کی اسکرین کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فتویٰ دیا تھا، جو ان کے فتاویٰ کے مجموعہ "کفایت المفتی" میں موجود ہے، کہ فی نفسہ مباح ہے، لیکن اسے دیگر محرمات سے پاک ہونا چاہیے۔ پاکستان کے ایک بڑے مفتی حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ کے بارے میں اس مجلس میں بتایا گیا کہ انہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ ٹی وی اسکرین اور ویڈیو کیمرہ پر آنے والی متحرک تصویر جب تک کسی پرنٹڈ شکل میں نہ آجائے، وہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے اور اس کا استعمال جائز ہے۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے اس مجلس میں بتایا کہ دارالعلوم کراچی نے بھی اس نوعیت کا فتویٰ دے دیا ہے اور وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک اسکرین پر تصویر متحرک ہے، وہ تصویر نہیں ہے، لیکن جب وہ تصویر کی صورت میں کسی جگہ ثبت ہو جائے تو پھر اس پر تصویر کے احکام لاگو ہو جائیں گے۔

بہر حال یہ اس حوالے سے ایک اہم پیشرفت ہے اور اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے، لیکن میں اس مسئلہ کو جواز و عدم جواز سے ہٹ کر ایک اور پہلو سے دیکھتا ہوں اور میرے نزدیک اسے

اس زاویے سے بھی دیکھنا چاہیے کہ عکاظ اور اس طرح کے دیگر جاہلی میلوں میں اس سے کہیں زیادہ خرافات ہوتی تھیں جو آج کل ٹی وی پر ہو رہی ہیں، لیکن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان خرافات کے ماحول میں خود تشریف لے جا کر دین کی دعوت دیا کرتے تھے اور اس عوامی فورم کو دینی مقاصد کے لیے استعمال فرماتے تھے۔

میں نے کچھ عرصہ قبل ایک بزرگ علمی شخصیت سے دریافت کیا تھا کہ اسلام نے جنگ کے جو اصول وضع کیے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی جو اخلاقیات بیان فرمائی ہیں، کیا ان کی رو سے ایٹم بم کو شرعاً ایک جائز ہتھیار کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے؟ ان کا جواب نفی میں تھا۔ لیکن جب یہ ایک رائج الوقت ہتھیار ہے اور دشمن کے ہاتھ میں موجود ہے تو ہمارے لیے جواز یا عدم جواز کی بحث میں پڑے بغیر اسے اختیار کرنا، ناگزیر ہو گیا ہے۔ اسی طرح الیکٹرانک میڈیا بھی ایک خوفناک جنگی ہتھیار کی شکل اختیار کر چکا ہے، ایسی صورت میں جوابی ہتھیار بھی تیار رکھنا چاہیے۔

(روزنامہ پاکستان لاہور، ۴ر مئی ۲۰۰۷ء)

بچیوں کی تعلیم اور نصاب تعلیم

جامعہ الہدیٰ ٹونگھم (برطانیہ) میں تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب اور طالبات کی تین کلاسوں کے سالانہ امتحانات میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے والی بچیوں کو سرٹیفکیٹ اور میڈل وغیرہ دینے کا پروگرام تھا۔ مدنی ٹرسٹ ٹونگھم کے چیئرمین ڈاکٹر اختر الزمان غوری صدارت کر رہے تھے جبکہ مہمان خصوصی کی مسند پر دوستوں نے مجھے بٹھا دیا تھا۔ دوسرے مہمانوں میں ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا عیسیٰ منصوری، بحرین سے دعوت اسلام کے پروگرام ”ڈسکور اسلام“ کے ڈائریکٹر الشیخ احمد خان، دینہ ضلع جہلم سے مسلم کانفرنس (س) کے راہنما مولانا فضل الٰہی تاج پوری، جامعہ اسلامیہ ننیتھم کے شیخ الحدیث مولانا عبد الحق، ممتاز ماہر فلکیات مولانا ثمیر الدین قاسمی اور دیگر حضرات شامل تھے۔ طالبات کے والدین کے علاوہ علاقہ کے دیگر سرکردہ بزرگوں نے بھی شرکت کی۔ جامعہ الہدیٰ کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور اسلامک ہوم اسٹڈی کورس کے ڈائریکٹر مولانا اورنگزیب خان نے انعامات کا اعلان کیا اور ہم اردو بولنے والوں کی انگلش میں ترجمانی کے فرائض سرانجام دیے۔

راقم الحروف نے اس موقع پر طالبات کی دینی تعلیم کے اداروں کے نصاب تعلیم اور اس کی ضروریات کے حوالہ سے مختصر گفتگو کی جسے بعض دوستوں نے بہت پسند کیا اور انہی کا اصرار ہے کہ اسے قلم بند بھی کیا جائے، چنانچہ وہ گزارشات درج ذیل سطور میں پیش کی جا رہی ہیں۔

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں عام طور پر یہ بحث رہتی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا نصاب کیا ہونا چاہیے اور بچیوں کے لیے مخصوص دینی مدارس میں طالبات کو کیا کچھ پڑھانا چاہیے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے سب سے بڑا اور روشن اسوہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے جو درس گاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے کامیاب طالبہ اور امت کی سب سے بڑی معلمہ تھیں۔ ان کے علمی فضل و کمال کا یہ عالم تھا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نصف دین

ان سے حاصل کیا جائے۔ یہ نصف اگر مقدار کے لحاظ سے نہ بھی ہو تو کیفیت کے لحاظ سے ضرور نصف دین ہے کہ چاردیواری کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کا کم و بیش نوے فیصد حصہ انہی سے روایت ہے۔ وہ حدیث نبوی کی سب سے بڑی راویہ ہیں۔ انہیں دور صحابہ کے ان سات بڑے مفتیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ وہ فتویٰ بھی دیتی تھیں، دوسرے مفتیوں کے فتوے پر نقد کرتی تھیں اور اجتہاد کا حق پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کرتی تھیں۔ وہ قرآن کریم کی مفسرہ تھیں اور احکام اسلام کی حکمت اور فلسفہ بیان کرنے میں امتیازی شان رکھتی تھیں حتیٰ کہ بعض محققین نے انہیں علم اسرار دین کی بانیہ قرار دیا ہے، یعنی احکام شریعت کی حکمت و فلسفہ بیان کرنے میں پہل انہوں نے کی جس پر آگے چل کر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے فضلاء نے عظیم الشان دینی فلسفہ کی بنیاد رکھ دی۔

وہ عرب قبائل کی روایات، تاریخ اور کلچر پر اس حد تک عبور رکھتی تھیں کہ لوگ اس سلسلہ میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ انہیں عرب قبائل کے نسب ناموں سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل تھی۔ سخن فہم اور سخن شناس تھیں اور عرب شعراء کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہوتے تھے۔ خود بھی ادب و فصاحت سے بہرہ ور تھیں اور انہیں اپنے دور کے بڑے خطباء میں شمار کیا جاتا تھا۔ علمی اور فقہی معاملات کے علاوہ عوامی مسائل پر بھی کھل کر رائے دیتی تھیں اور خلفائے راشدین تک بہت سے امور میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا ارشاد ہے کہ ہم اصحاب رسول کبھی کسی ایسی مشکل نہیں پھنسے جس کے بارے میں ہمیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے راہنمائی نہ ملی ہو۔ اس کے علاوہ طب و علاج پر بھی دسترس رکھتی تھیں اور ان کے سب سے بڑے شاگرد اور بھانجے حضرت عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دور میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ طبی معلومات رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ ان کی مسند تدریس نصف صدی تک مدینہ منورہ میں آباد رہی اور سینکڑوں تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کیا۔ صرف حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کے براہ راست شاگردوں کی تعداد دو سو سے زائد بیان کی جاتی ہے جن میں مرد عورتیں دونوں شامل ہیں۔ یہ سب معلومات ان کے سیرت نگاروں نے مختلف کتابوں میں بیان کی ہیں اور اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے ”سیرت عائشہ“ میں بیشتر

معلومات کو جمع کر دیا ہے جس کا مطالعہ ہر دینی اور علمی ذوق رکھنے والی خاتون کو کرنا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا؟ وہ جب حرم نبوی میں داخل ہوئیں تو ان کی عمر صرف نو برس تھی جس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض بھی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ عین حکمت و دانش کا تقاضا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں ایک خاتون اس عمر میں آئیں جو سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کی عمر ہو اور وہ بیوی کی حیثیت رکھتی ہوں تاکہ کسی بات کے پوچھنے، سمجھنے اور سیکھنے میں حجاب نہ ہو اور امت تک دین کا وہ حصہ بے کم و کاست پہنچ سکے جو میاں بیوی کے تعلقات اور گھر کی چار دیواری کے اندر کے حالات کے حوالہ سے ہے اور اس تعلیم و تربیت میں اور کسی کی آمیزش نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے بالکل نیو اور صاف "ہارڈ ڈسک" چاہیے تھی جس کا اعزاز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا اور انہوں نے امت کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی معلمہ کی حیثیت سے خود کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا۔ وہ حرم نبوی میں داخل ہوئیں تو نو برس کی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ اٹھارہ انیس برس کے پیٹے میں تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ انہوں نے ان علوم و کمالات کا بڑا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہی حاصل کیا، کیونکہ ان کی درس گاہ وہی تھی اور اسی چشمہ صافی سے انہوں نے سارا فیض پایا تھا۔

ان کے علمی کمالات پر ایک نظر ڈال لیجیے: وہ قرآن کریم کی بہت بڑی مفسرہ تھیں، حدیث رسول کی ایک بڑی راویہ اور شارحہ تھیں، دینی مسائل و احکام کی حکمت و فلسفہ بیان کرنے والی دانش ور تھیں، عرب قبائل کی روایات، کلچر، نسب ناموں اور تاریخ پر عبور رکھتی تھیں، انہیں ادب و شعر اور خطابت پر دسترس حاصل تھی، وہ مجتہد درجے کی مفتیہ تھیں، عوامی مسائل پر رائے دینے والی راہنما تھیں، اور طب و علاج کے بارے میں بھی ضروری معلومات سے بہرہ ور تھیں، اور یہ سب کمالات انہوں نے درس گاہ نبوی سے سیکھے تھے۔ اس لیے میرے نزدیک تو عورتوں کے لیے درس گاہ نبوی کا نصاب یہی ہے اور اس حوالے سے امت مسلمہ میں بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے بڑا اسوہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے جن کو راہنما اور معیار بنائے بغیر ہم اپنی نئی نسل کی بچیوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے تقاضے پورے نہیں کر سکیں گے۔

اس موقع پر راقم الحروف نے طالبات اور ان کی معلمات سے بطور خاص عرض کیا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ حصول علم میں آگے بڑھیں۔ وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر جلیل القدر صحابیات رضی اللہ عنہن کی زندگیوں اور علمی کارناموں کا مطالعہ کریں اور مغرب کے اس پراپیگنڈے سے قطعاً متاثر نہ ہوں کہ اسلام عورتوں کو علم حاصل کرنے سے روکتا ہے، کیونکہ ہمارا شاندار ماضی اور تابناک تاریخ ہمارے سامنے ہے اور امت کی اولوا العزم خواتین کی خدمات اور کارنامے تاریخ کا روشن حصہ ہیں جن کا دنیا کی کوئی اور قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ سب کچھ دینی احکام کے دائرہ میں رہ کر ہو اور شرعی قواعد و ضوابط کی پوری طرح پابندی کی جائے۔

تقریب کے شرکاء نے جامعۃ الہدیٰ کی تعلیمی پیشرفت پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اس دینی ادارہ کا افتتاح دو سال قبل مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے ہاتھوں ہوا تھا اور آج یہ انہی کی سرپرستی میں دینی تعلیم و تربیت کے فروغ کے لیے خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس کے بعد شیخ الحدیث مولانا عبد الحق سواتی کی دعا پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، ۱۲ ستمبر ۱۹۹۸ء)

دینی مدارس کے اساتذہ کیا سوچتے ہیں؟

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ۳، ۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کو دینی مدارس کے اساتذہ کی دو روزہ باہمی مشاورت اور نصاب و تربیت کے حوالے سے مختلف امور پر مذاکرہ و مباحثہ کا اہتمام کیا گیا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ، جامعہ حقانیہ گوجرانوالہ، جامعہ فتاح العلوم گوجرانوالہ، دار العلوم مدنیہ رسول پارک لاہور، جامعہ قاسمیہ گوجرانوالہ، جامعہ عربیہ چنیوٹ، جامعہ حنفیہ قادریہ باغبانپورہ لاہور، جامعہ اسلامیہ کامونکی، جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم، جامعہ فاروقیہ سیالکوٹ اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے تیس کے لگ بھگ اساتذہ نے اس مشاورت و مذاکرہ میں حصہ لیا۔ پہلی نشست کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے سینئر ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے کی اور شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے ”درس نظامی کی اہمیت و افادیت“ پر مقالہ پڑھا۔ دوسری نشست کی صدارت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے ”طلبہ کی دینی و اخلاقی تربیت“ کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ تیسری نشست کی صدارت جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی نے کی اور اس میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں کی جانے والی حالیہ ترامیم کے بارے میں شرکاء مذاکرہ نے باری باری اظہار خیال کیا جبکہ چوتھی اور آخری نشست راقم الحروف کی زیر صدارت منعقد ہوئی جس میں معہد اللغۃ العربیۃ اسلام آباد کے مولانا محمد بشیر سیالکوٹی نے ”دینی مدارس میں عربی کی تعلیم کا منہج اور ضروری اصلاحات“ کے عنوان پر اظہار خیال کیا اور راقم الحروف نے ”فکری اور مسلکی تربیت کے چند اہم پہلو“ کے عنوان پر گفتگو کی۔

پروگرام کے آغاز پر راقم الحروف نے اس کا مقصد بیان کرتے ہوئے گزارش کی کہ اس مشاورت اور مذاکرہ و مباحثہ کے اہتمام میں ہمارے سامنے دو اہم مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ دینی مدارس کے اساتذہ میں تعلیم و تربیت کے مسائل پر باہمی تبادلہ خیالات، غور و خوض اور بحث و مباحثہ کا ذوق پیدا ہو اور

اس کا ماحول بنے اور دوسرا یہ کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے اس وقت جو امور قومی بلکہ عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور جن کے بارے میں ہر طرف سے آرا و تجاویز سامنے آ رہی ہیں، ان پر دینی مدارس کے اساتذہ کی آرا اور موقف بھی سامنے آئے اور جو لوگ دینی مدارس میں طلبہ کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری براہ راست سرانجام دے رہے ہیں، ان کے رجحانات اور سوچ سے بھی لوگوں کو واقفیت حاصل ہو۔

اس مذاکرہ و مباحثہ کے ساتھ ہم اس کا آغاز کر رہے ہیں اور آئندہ بھی الشریعہ اکادمی متعلقہ مسائل و امور پر دینی مدارس کے اساتذہ کی باہمی مشاورت و مباحثہ کا وقتاً فوقتاً اہتمام کرتی رہے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دو روزہ مشاورت و مذاکرہ میں ہونے والی گفتگو اور کارروائی کی تفصیل کا یہ کالم متحمل نہیں ہے اور یہ رپورٹ ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے جنوری کے شمارے میں شائع کی جا رہی ہے، البتہ مذاکرہ و مشاورت کی مختلف نشستوں میں طلبہ کی تعلیم و تربیت اور وفاق المدارس کے ترمیم شدہ نصاب کے بارے میں اساتذہ نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان کا خلاصہ قارئین کی معلومات کے لیے پیش کیا جا رہا ہے:

- وفاق المدارس کے نصاب میں جو ترامیم اور تبدیلیاں کی گئی ہیں، وہ خوش آئند ہیں اور ان کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن یہ ناکافی اور وقتی ہیں۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ آئندہ کم از کم نصف صدی تک کی ممکنہ صورت حال اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک جامع پالیسی طے کی جائے اور بجائے اس کے کہ ہر تین چار سال کے بعد جزوی تبدیلیاں کی جاتی رہیں، پچاس سال کے لیے ایک اصولی لائحہ عمل کا تعین کیا جائے۔ مثلاً ہم نے کچھ عرصہ قبل مڈل کی سطح کی تعلیم کو نصاب میں شامل کیا اور اب میٹرک کی عصری تعلیم کو ضروری کہتے ہوئے نصاب کا لازمی حصہ بنا لیا ہے۔ اگر ہم نے چار سال کے بعد ایف اے اور پھر چار پانچ سال کے بعد بی اے کو بھی شامل کرنا ہے تو اس کے بجائے بہتر ہے کہ یہ فیصلہ ابھی سے کر لیا جائے تاکہ مدارس کے منتظمین، اساتذہ اور طلبہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ اور اگر اس سے آگے کے عصری نصاب کو شامل کرنا ضروری نہیں ہے تو بھی سے حتمی طور پر کہہ دیا جائے تاکہ تذبذب اور گومگو کی فضا ختم ہو اور اساتذہ و

طلبہ دلجمعی کے ساتھ کام کو آگے بڑھا سکیں۔

- مڈل تک کے نصاب کو دینی مدارس کے لیے ضروری قرار دیا گیا تو اس کا تاثر یہ تھا کہ دباؤ اور مجبوری کے تحت ایسا کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نصاب کی تعلیم ہمارے ہاں اہتمام اور خوش دلی کے ساتھ نہیں ہو رہی بلکہ محض رسم پوری کرنے اور امتحان میں پاس ہونے کی حد تک اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ میٹرک کے بارے میں بھی ایسا ہو گا اور ہمارے طلبہ میٹرک کر لینے کے بعد بھی میٹرک کے درجہ کی صلاحیت سے محروم رہیں گے، اس لیے یہ بات بھی ابھی سے اور دو ٹوک انداز میں طے کرنے کی ہے کہ اگر تو یہ سب کچھ دباؤ اور مجبوری کی وجہ سے کیا جا رہا ہے تو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت و افادیت نہیں ہے بلکہ دباؤ قبول کرنے سے کھلے لفظوں میں انکار کر دینا چاہیے اور اگر فی الواقع اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور ہم خود اس کی افادیت کا احساس کرتے ہوئے اسے شامل نصاب کرنا چاہتے ہیں تو پھر میٹرک کے نصاب کی تعلیم بھی خوش دلی اور اہتمام کے ساتھ ہونی چاہیے اور اس کے مضامین کی پوری طرح تیاری کرائی جانی چاہیے تاکہ ہمارے طلبہ اس معاملے میں دوسرے سکولوں کے طلبہ سے پیچھے نہ رہیں۔
- عربی کی تعلیم کے حوالے سے وفاق المدارس کے نصاب میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، وہ جزوی طور پر افادیت کی حامل ضرور ہیں لیکن ان سے اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ عربی زبان کی تعلیم سے بنیادی طور پر ہمارے دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ فارغ التحصیل عالم دین کا قرآن و سنت، فقہ اسلامی اور دیگر علوم اسلامی کے ساتھ تعلق و رابطہ مضبوط ہو اور وہ ان سے صحیح طور پر استفادہ کر سکے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ آج کے ماحول اور ضروریات کے مطابق عربی زبان میں گفتگو کر سکے، بوقت ضرورت خطاب کر سکے، آج کے عربی لٹریچر سے استفادہ کر سکے اور مروجہ عربی زبان میں لکھ پڑھ سکے۔ درس نظامی میں عربی زبان کے حوالے سے جن علوم اور مواد کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے پہلا مقصد تو کسی حد تک پورا ہو جاتا ہے لیکن دوسرا مقصد کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں ہوتا اور فارغ التحصیل علماء بلکہ سالہا سال تک تدریس کا فریضہ سرانجام دینے والے اساتذہ کرام بھی مروجہ عربی میں گفتگو اور لکھنے پڑھنے کی صلاحیت و استعداد سے محروم رہتے ہیں۔ اس کمزوری کو دور کرنا انتہائی

ضروری ہے اور وفاق المدارس کے نصاب میں کی جانے والی حالیہ ترامیم سے یہ خلا پر نہیں ہو گا بلکہ صورت حال جوں کی توں رہے گی۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مقصد قدیم عربی اور اس کے متعلقہ علوم کی اہمیت کم کرنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ جدید عربی اور اس کے تقاضوں کو شامل کرنا ہے تاکہ ہمارے فضلاء قدیم لٹریچر سے استفادہ کی بھرپور صلاحیت کے ساتھ ساتھ جدید اور مروجہ عربی زبان میں بھی ضروری استعداد حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے عربی زبان کی تعلیم کے جدید اسلوب اور ادب عربی کے جدید لٹریچر سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ناگزیر ہے اس لیے کہ اس کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔

- وفاق المدارس نے نصاب میں ترمیم و اضافہ کے حوالے سے سب سے زیادہ ضروری اور اہم مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور وہ ہے اساتذہ کی تربیت اور تدریس کی فنی ٹریننگ کا نصاب جس کی غیر موجودگی بہت سی کمزوریوں اور خرابیوں کا باعث بن رہی ہے۔ ہمارے ہاں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نصاب یا نظام موجود نہیں ہے۔ صرف دورۂ حدیث کی سند میں ذہین طالب علم کی سند پر لکھ دیا جاتا ہے کہ "یہ تدریس کی صلاحیت رکھتا ہے" اور وہ بھی تدریس کی کسی عملی تربیت کے بغیر۔ یہ طریق کار درست نہیں ہے۔ معاصر تعلیمی نظاموں میں پرائمری سکول کے استاذ کا تقرر بھی باقاعدہ کورس کی تکمیل کے بغیر نہیں ہوتا جبکہ اس سے اعلیٰ درجوں کے لیے سال سال اور دو دو سال کے تربیتی نصاب ہیں جو ٹیچر بننے والے کو لازمی طور پر پڑھنا پڑتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کسی عملی اور فنی تعلیم و تربیت کے بغیر کوئی بھی فاضل اپنی ذہانت یا تعلقات کی بنیاد پر مسند تدریس پر فائز ہو جاتا ہے۔

خود ہمارے ہاں کچھ عرصہ قبل تک افتاء کا کوئی باضابطہ کورس نہیں ہوتا تھا اور کوئی ذہین مدرس کسی پختہ کار مفتی کی نگرانی میں چند سال عملی تجربہ حاصل کر کے مفتی کے منصب پر فائز ہو جایا کرتا تھا مگر اب اسے کافی نہیں سمجھا جا رہا بلکہ افتاء کا باقاعدہ نصاب طے کیا گیا ہے اور کورس مقرر کیا گیا ہے جس کی تکمیل مفتی کے منصب کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح استاذ کے منصب کے لیے بھی سابقہ طریق کار پر قناعت کافی نہیں ہے بلکہ تدریس کی فنی تربیت اور اس کے ساتھ ساتھ علمی استعداد میں اضافہ اور فکری اور اخلاقی و دینی تربیت کی

ضروریات پر مشتمل نصاب کی ترتیب ضروری ہے اور یہ کام وفاق المدارس ہی کو کرنا چاہیے کیونکہ استاذ تمام تر ذہانت اور لیاقت کے باوجود اگر تدریس کے فن سے آگاہ نہیں ہے تو وہ اپنا علم طلبہ تک صحیح طور پر منتقل نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ خود کسی فکری کج روی کا شکار ہے تو اس کی یہ متعدّی بیماری طلبہ تک منتقل ہوگی اور اگر اس کی دینی و اخلاقی تربیت ضرورت کے مطابق مکمل نہیں ہے تو اس کے شاگرد بھی اسی کے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاں عملی طور پر ہو رہا ہے اور اس کے تلخ نتائج بھی ہم اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح مدرس اور استاذ کے لیے تیار کیے جانے والے تربیتی نصاب میں طلبہ کی نفسیات اور آج کے ماحول سے آگاہی کو شامل کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ بہت سے طلبہ صرف اس لیے تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کہ ان کے مزاج، نفسیات اور ماحول کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ان کے لیے تعلیم کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

- فکری اور اعتقادی تعلیم کے حوالے سے بھی ہمارا نصاب تشنہ ہے۔ ”شرح عقائد“ اور ”العقیدۃ الطحاویۃ“ بہت ضروری اور مفید کتابیں ہیں جن کا شامل نصاب رہنا ضروری ہے۔ ان میں اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کی ضروری تشریح موجود ہے لیکن جن گمراہ فرقوں کے عقائد کا ان کتابوں میں تذکرہ ہے، وہ صدیوں پرانے ہیں جواب موجود نہیں ہیں یا پہلے سے مختلف شکلیں اختیار کر چکے ہیں جبکہ آج کے گمراہ فرقوں اور ان کے عقائد کے حوالے سے ہمارے نصاب میں کوئی مواد موجود نہیں ہے اور اس سلسلے میں پانچ درجوں پر ضروری مواد کو شامل نصاب کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے:

۱۔ معاصر ادیان و مذاہب مثلاً مسیحیت، یہودیت، ہندو مت، سکھ ازم اور بدھ مت وغیرہ کے بارے میں تعارفی اور تقابلی مواد۔

۲۔ اسلام سے منحرف مذاہب مثلاً قادیانیت، بہائیت، نیشن آف اسلام وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات۔

۳۔ اسلام سے منسوب گمراہ گروہوں مثلاً رافضیت اور منکرین حدیث وغیرہ کا تعارف۔

۴۔ اہل سنت کے داخلی مذاہب مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری اور سلفی وغیرہ کا تعارف اور تقابلی مطالعہ۔

۵۔ مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کا تاریخی پس منظر اور اسلام کے ساتھ اس کی کشمکش کی موجودہ صورت حال۔

اس ضروری مواد کو نصاب میں شامل کرنے کے لیے مستقل کتابوں کی تصنیف کی ضرورت ہے جو تدریسی نقطہ نظر سے اور تدریسی انداز میں تحریر کی گئی ہوں یا دوسری صورت یہ ہے کہ ان کے بارے میں محاضرات کا اہتمام ہو لیکن اس کے لیے اساتذہ کی تیاری اور انہیں متعلقہ مواد کی فراہمی ضروری ہوگی تاکہ وہ محاضرات کی صورت میں اپنے تلامذہ کو صحیح معلومات دے سکیں۔

- اسلامی معیشت کے بارے میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب شامل نصاب کی گئی ہے جو بہت مفید اور ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جدید معاشی نظام اور علم معیشت کا تعارفی مطالعہ شامل نصاب کیا جائے کیونکہ جب تک طالب علم جدید معیشت کے اصول اور طریق کار سے واقف نہیں ہوگا، اس کے لیے اسلام کے معاشی احکام و قوانین اور جدید معاشی نظام میں فرق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ جدید سماجی علوم اور جنرل سائنس کا تعارفی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس کا مقصد ان علوم کی باقاعدہ تعلیم نہیں بلکہ ان کے مبادیات، بنیادی اصطلاحات اور افادیت سے طلبہ کو واقف کرانا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ آج کے مجموعی ماحول، ضروریات اور آج کی مروجہ زبان و اصطلاحات سے آگاہی حاصل نہیں کر سکیں گے۔
- طلبہ کی فکری تربیت کی طرف توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت عملی صورت حال یہ ہے کہ جس استاذ کے ساتھ کسی طالب علم کا ذہنی میلان ہوتا ہے، وہ اسی کے فکر اور سوچ سے منسلک ہو جاتا ہے اور ایک ہی درس گاہ میں مختلف سوچوں اور فکری اہداف کے الگ الگ دائرے بن جاتے ہیں جو تعلیم سے فراغت کے بعد نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ مزید ترقی کرتے ہیں جس سے فکری خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے تدارک کی طرف وفاق المدارس کی قیادت کو توجہ دینی چاہیے اور اجتماعی فکری اہداف کا ایک دائرہ طے کر کے اسے اساتذہ کے تربیتی پروگرام کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کی صحیح رخ پر تربیت کر سکیں۔

- دینی اور اخلاقی تربیت کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ فرائض و واجبات کی ادائیگی، باہمی حقوق و معاملات اور عام لوگوں کے ساتھ میل جول کے آداب کی صورت حال تسلی بخش نہیں ہے اور اس کا زیادہ تر تعلق بھی اساتذہ سے ہے۔ اساتذہ اخلاقی اور دینی لحاظ سے مضبوط کردار کے حامل ہوں گے تو طلبہ پر اس کے اثرات ہوں گے اور اگر اساتذہ کی اخلاقی اور دینی حالت کمزور ہوگی تو طلبہ کی حالت اس سے زیادہ کمزور ہوگی۔ اس لیے اس سلسلے میں مدارس کے اساتذہ اور منتظمین کے ساتھ مسلسل رابطہ اور ان کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

قارئین کرام! یہ ہے خلاصہ اس گفتگو کا جو مختلف دینی مدارس کے اساتذہ نے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی دو روزہ مشاورت کے دوران متعدّد مجالس میں کی۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام کی موجودہ صورت حال اور اس میں اصلاح و ترامیم کی ضروریات کے بارے میں ان اساتذہ کی سوچ کیا ہے اور وہ کس انداز سے ان امور پر غور کرتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ کے مابین مشاورت، باہمی تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کے اس دائرہ کو وسیع کیا جائے، مختلف علاقوں میں دینی مراکز اس کا اہتمام کریں بلکہ خود وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام قومی اور علاقائی سطح پر ایسی مشاورتوں اور مباحثوں کا انعقاد ہو تو اس کی افادیت اور اثرات زیادہ نمایاں ہوں گے۔

امید ہے کہ ارباب بست و کشاد دینی مدارس کے اساتذہ کی ان آرا و تجاویز کو سنجیدہ توجہ سے نوازیں گے اور باہمی مشاورت و مباحثہ کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں مثبت کردار ادا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ دینی مدارس کی حفاظت فرمائیں اور ہم سب کو دینی تعلیم کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۲۰۰۴ء)

اصلاح احوال کے مختلف پہلو
اور حکمت عملی

دینی نظامِ تعلیم: چند اصلاح طلب امور

روزنامہ جنگ لاہور ۴؍ دسمبر ۱۹۹۴ء کے مطابق گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین نے دینی مدارس کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور فرقہ وارانہ کردار کے حامل مدارس کی بندش کا عندیہ دیا ہے۔ اسی طرح بعض اخباری اطلاعات کے مطابق وفاقی وزارت داخلہ نے ملک میں نئے دینی مدارس کی رجسٹریشن اور پرانے مدارس کی رجسٹریشن کی تجدید کے لیے وزارت داخلہ سے پیشگی اجازت کی شرط عائد کر دی ہے اور متعلقہ حکام کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ اس اجازت کے بغیر کسی نئے دینی مدرسہ کو رجسٹرڈ نہ کیا جائے اور نہ ہی پہلے سے قائم کسی مدرسہ کی رجسٹریشن کی تجدید کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی بہاولپور پولیس کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حکام بالا کی ہدایت پر پولیس دینی مدارس کا سروے کر رہی ہے تاکہ اس الزام کی حقیقت معلوم کی جا سکے کہ بعض مدارس میں بچوں سے جبری بیگار لی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ دنوں گوجرانوالہ میں وزیر اعظم پاکستان کے ایک مشیر نے کسی مدرسے کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی اس رپورٹ کا ذکر کیا ہے کہ وہاں طلبا کو زنجیروں سے باندھ کر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے بقول وزیر اعظم نے اس سلسلے میں انکوائری کی ہدایات جاری کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے بارے میں بھی یہ خبر چھپ چکی ہے کہ اس نے پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ پر مظالم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے حوالے سے تحقیقات کا آغاز کر دیا ہے۔ دینی مدارس کے بارے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اس تحقیقاتی مہم کا پس منظر کیا ہے اور یہ سب کچھ کن مقاصد کے لیے کیا جا رہا ہے؟ اس سوال کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مدارس کے خلاف اس مہم کے مقاصد کو صحیح طور پر سامنے لایا جا سکے۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے دینی مدارس

و مکاتب کا موجودہ نظام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل پورے برصغیر میں درس نظامی کا یہی نصاب تعلیمی اداروں میں رائج تھا جو مغل بادشاہت کے دور میں اس وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا اور جو اب بھی ہمارے دینی مدارس میں بدستور رائج چلا آ رہا ہے۔

فارسی اس دور میں سرکاری زبان تھی اور عدالتوں میں فقہ حنفی رائج تھی، اس لیے درس نظامی کا یہ نصاب اس دور کی دفتری اور عدالتی ضروریات کو پورا کرتا تھا اور دینی تقاضوں کی تکمیل بھی اس سے ہو جاتی تھی، اس لیے اکثر و بیشتر مدارس کا نصاب یہی تھا اور تقریباً تمام مدارس سرکار کے تعاون سے بلکہ سرکار کی بخشی ہوئی زمینوں اور جاگیروں کے باعث تعلیمی خدمات سرانجام دیتے چلے آ رہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد دہلی کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہ راست تاج برطانیہ کو منتقل ہوا اور باقاعدہ انگریزی حکومت قائم ہو گئی تو سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی کر دی گئی اور عدالتی نظام سے فقہ حنفی کو خارج کر کے برطانوی قوانین نافذ کر دیے گئے جس سے ہماری تعلیمی ضروریات دو حصوں میں منقسم ہو گئیں۔ دفتری اور عدالتی نظام میں شرکت کے لیے انگریزی تعلیم ناگزیر ہو گئی اور دینی و قومی ضروریات کے لیے درس نظامی کے سابقہ نظام کو رکھنا ضروری سمجھا گیا جبکہ مدارس و مکاتب کا سابقہ نظام ختم کر دیا گیا تھا۔ علماء کی ایک بڑی تعداد جنگ آزادی میں کام آ گئی، باقی ماندہ میں سے ایک کھیپ کالا پانی اور دیگر جیلوں کی نذر ہو گئی اور پیچھے رہ جانے والے لوگ شکست کے اثرات کو سمیٹتے ہوئے مستقبل کے بارے میں سوچنے میں مصروف ہو گئے۔ مدارس و مکاتب کے لیے مغل حکمرانوں کی عطا کردہ جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور اس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے کا تعلیمی نظام مکمل طور پر تتر بتر ہو کر رہ گیا۔

نئے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی ضروریات کے دو حصوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد اہل دانش نے مستقبل کی طرف توجہ دی۔ سر سید احمد خان مرحوم نے ایک محاذ سنبھال لیا اور دفتری و عدالتی نظام میں مسلمانوں کو شریک رکھنے کے لیے انگریزی تعلیم کی ترویج کو اپنا مشن بنا لیا، جبکہ دینی و قومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے دینی تعلیم کا محاذ فطری طور پر علماء کرام کے حصے میں آیا اور اس سلسلے میں سبقت اور پیش قدمی کا اعزاز مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کو حاصل ہوا۔ سر سید احمد

خان اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ میں انگریزی تعلیم کے کالج کا آغاز کیا اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی، دونوں ایک ہی استاذ مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے اور دونوں نے مختلف سمتوں میں تعلیمی سفر کا آغاز کیا جو آگے چل کر دو مستقل تعلیمی نظاموں کی شکل اختیار کر گئے۔ ابتدا میں سرسید احمد خان مرحوم کے انگریزی کالج اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مدرسہ عربیہ دونوں کی بنیاد عوامی چندہ پر اور امداد باہمی کے طریق کار پر تھی، لیکن بعد میں کالج اور اسکول کے نظام کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گئی اور رفتہ رفتہ پورا نظام سرکار کی تحویل میں آ کر مصارف و اخراجات کے جھنجھٹ سے آزاد ہو گیا، جبکہ دینی مدارس سرکاری سرپرستی سے آزاد رہے جس کی وجہ سے انہیں اپنے اخراجات و ضروریات کے لیے ہر دور میں عوامی چندہ پر انحصار کرنا پڑا اور آج بھی یہ صورت حال بدستور قائم ہے۔

دینی مدارس کے اس آزادانہ اور متوازی نظام کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے:

- قرآن و سنت، عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم کی حفاظت اور مسلم معاشرہ کا ان سے تعلق برقرار رکھنا۔
- مساجد و مدارس کے نظام کو قائم رکھنا اور ان کے لیے ائمہ، خطباء اور مدرسین کی فراہمی۔
- یورپ کی نظریاتی اور تہذیبی یلغار کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی طرز معاشرت اور عقائد کی حفاظت۔
- جدید عقلیت کے پیدا کردہ اعتقادی و نظریاتی فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ یہ مدارس سرکار کے اثر سے آزاد رہیں اور ایسا تعلیمی نصاب و نظام اختیار کریں کہ اس کے تیار کردہ افراد صرف ان کے مقاصد کے خانہ میں فٹ ہو سکیں۔ اس بات کو زیادہ بہتر طور پر واضح کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحبؒ کی زبانی سنا۔ ان کی روایت کے مطابق یہ اس دور کا واقعہ ہے جب دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے فرزند مولانا حافظ محمد احمد تھے اس دور میں دار العلوم کے فارغ التحصیل کچھ نوجوان حیدر آباد دکن کی ریاست میں ملازمتوں میں فائز ہوئے اور کارکردگی اور صلاحیت کے لحاظ سے دوسرے ملازمین سے

بہتر ثابت ہوئے۔ مولانا حافظ محمد احمد کے دورۂ حیدر آباد کے موقع پر نظام حیدر آباد نے ایک ملاقات میں ان سے اس بات کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر دارالعلوم دیوبند کے فضلاء ہر سال سارے کے سارے حیدر آباد بھجوا دیے جائیں تو نظام حیدر آباد انہیں ملازمتیں دیں گے اور دارالعلوم کے سالانہ اخراجات کا بار، نظام خود اٹھالیں گے۔ مولانا حافظ محمد احمد نے دیوبند واپسی پر یہ پیش کش دارالعلوم کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے سامنے بیان کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ مولانا محمود الحسن نے خود کوئی مشورہ دینے کے بجائے حافظ محمد احمد کو دارالعلوم کے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں بھیج دیا جو اس وقت بقید حیات تھے۔ انھوں نے مولانا حافظ محمد احمدؒ سے نظام حیدر آباد کی پیش کش کے بارے میں سن کر جو جواب دیا، وہ حضرت مولانا مفتی عبد الواحد صاحبؒ کے الفاظ میں یوں تھا:

> ”بھاڑ میں جائے حیدر آباد کی ریاست! ہم اس ریاست کو چلانے کے لیے طلبہ کو نہیں پڑھا رہے۔ ہم تو اس لیے پڑھاتے ہیں کہ مسجدیں اور قرآن کے مکاتب آباد رہیں اور مسلمانوں کو نمازیں اور قرآن کریم پڑھانے والے ائمہ اور استاذ ملتے رہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا داخلہ بند رہا اور دینی طلبہ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا رہا، کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے افراد لازماً سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے اور دینی مدارس سے فارغ ہونے والوں کی ایک بڑی کھیپ بھی اس طرف منتقل ہو جاتی جس سے دینی مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا۔ چونکہ دینی مدارس کے نظام کا آغاز کرنے والوں کے ذہن میں سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ایسی کھیپ تیار ہو جو قرآن پاک کے مکاتب کو آباد رکھے، اس لیے حکمت عملی کے تحت عملاً ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات مسجد و مدرسہ کے سوا کسی دوسری جگہ نہ کھپ سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حوالے سے یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ اس کے نتیجے میں برصغیر کے طول و عرض میں دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھ گیا اور مساجد میں ائمہ و خطباء کی کھیپ بھی فراہم ہوتی رہی۔

دینی مدارس کے منتظمین نے ان مقاصد کے حصول کے لیے کیا کیا جتن کیے؟ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیلات کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے، تاہم اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے سہولتوں کی زندگی ترک کر کے فقر و فاقہ اور تنگی و ترشی کی زندگی اختیار کی، لوگوں سے

صدقات و خیرات مانگ کر مدارس کو آباد رکھا، بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو محلہ کے ایک ایک گھر سے روٹیاں مانگنے کا سلسلہ بھی قائم رہا، اس لیے یہ بات بے جھجک کہی جا سکتی ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے اپنی ''عزت نفس'' تک کی قربانی دے کر معاشرہ میں قرآن و حدیث کی تعلیم اور اسلامی عقائد و معاشرت کو برقرار رکھا، ورنہ عالم اسباب میں اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اسپین کی طرح برصغیر پاک و ہند میں بھی (نعوذ باللہ) اسلام ایک قصہ پارینہ بن چکا ہوتا۔ صدقہ خیرات، گھر گھر سے مانگی ہوئی روٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی مدارس کا یہ نظام برطانوی استعمار کی نظریاتی، فکری اور تہذیبی یلغار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط حصار ثابت ہوا اور اس نظام نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے عقائد و افکار، معاشرت اور اسلامی علوم و فنون کی حفاظت کی بلکہ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کو نظریاتی راہنماؤں اور کارکنوں کی کھیپ بھی فراہم کی جس میں مولانا محمود حسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ہزاروں رفقاء بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

دور غلامی میں دینی مدارس کی حکمت عملی دفاعی تھی جس کے لیے انہیں بہت سے تحفظات اختیار کرنے پڑے، اور اگر وہ ان تحفظات کے بارے میں سختی اختیار نہ کرتے تو اپنے بنیادی مقاصد کی طرف اس قدر کامیابی کے ساتھ پیشرفت نہ کر پاتے، لیکن قیام پاکستان کے بعد صورت حال خاصی تبدیل ہو گئی اور آزادی کے حوالے سے نئے تقاضے اور ضروریات سامنے آگئیں جن کے بارے میں دینی مدارس کی تمام تر مجبوریوں اور مشکلات کے باوجود بہر حال یہ کہنا پڑتا ہے کہ نئی ضروریات اور تقاضوں کو اپنے مقاصد میں شامل کرنے کے لیے وہ ابھی تک تیار نہیں ہوئے جس کے نقصانات قومی سطح پر بہت دیر تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

قیام پاکستان کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج و تحفظ کی ذمہ داری ریاستی نظام تعلیم کے سپرد کر دی جاتی اور دینی مدارس کے الگ نظام کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی، لیکن ریاستی نظام نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ریاستی نظام تعلیم نے تو قیام پاکستان کے بعد آزادی اور ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کے حوالے سے اس

قدر مایوس کیا کہ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاستی نظام تعلیم کی ذمہ داری تھی کہ وہ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی نظریاتی ریاست کی حیثیت دینے اور ایک فلاحی اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے فوج، بیوروکریسی، عدلیہ اور دیگر شعبوں میں اسلامی تعلیم وتربیت سے بہرہ ور افراد کار مہیا کرتا، معاشرہ کے عام افراد کو قرآن وسنت کی ضروری تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کرتا، مساجد اور دینی مکاتب کا نظام چلانے کے لیے ائمہ اور مدرسین کی فراہمی کی ذمہ داری قبول کرتا، اسلامی تعلیمات واحکام کو عالمی برادری کے سامنے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرنے کے لیے اسکالرز تیار کرتا اور انہیں جدید علوم اور فلسفہ کے چیلنج کا سامنا کرنے کی تربیت دیتا، لیکن ریاستی نظام تعلیم نے نہ صرف یہ کہ ان ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ عملاً یہ نظام سیکولر اور اسلام مخالف عناصر کی کمین گاہ ثابت ہوا اور پاکستان میں اسلامی احکام وتعلیمات کی ترویج کو روکنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو غیر مؤثر بنانے میں اس نظام تعلیم نے مضبوط مورچے کا کام دیا، جبکہ اس کے برعکس دینی مدارس نے جو ذمہ داریاں ۱۸۵۷ء کے بعد قبول کی تھیں، اس راہ پر وہ اب بھی پوری دلجمعی کے ساتھ گامزن ہیں اور ان کے طریق کار اور دائرہ عمل میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوا بلکہ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اسلامی علوم کی حفاظت وترویج اور مساجد ومدارس کے لیے ائمہ واساتذہ کی فراہمی کے لیے دینی مدارس کے کردار کا تسلسل کسی خلا اور تعطل کے بغیر بدستور قائم ہے تو ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ تقابل کے تناظر میں دینی مدارس کا یہ کردار بڑے سے بڑے قومی اعزاز کا مستحق ہے، کیونکہ آج بھی ان دو مقاصد کے حوالے سے معاشرہ کی ضروریات یہی دینی مدارس پوری کر رہے ہیں اور اگر دینی مدارس اپنا یہ کردار چھوڑ دیں تو مساجد ومدارس کے لیے ائمہ واساتذہ کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج وحفاظت کے شعبہ میں جو خلا واقع ہوگا، وہ کسی باشعور شہری کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

دینی مدارس کے موجودہ کردار اور خدمات کے بارے میں عام طور پر شکایات کا اظہار کیا جاتا ہے اور شکوہ کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں، لیکن ان شکایات اور دینی مدارس کی مشکلات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آ سکے۔

دینی مدارس سے سب سے بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کے نصاب میں آج کے علوم شامل

نہیں ہیں اور وہ اپنے طلبہ کو انگریزی، ریاضی، سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کی تعلیم نہیں دیتے۔ یہ شکایت ایسی ہے جسے نہ تو پوری طرح قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ مسترد کیا جا سکتا ہے، کیونکہ جہاں تک عصری علوم کی مکمل تعلیم کا سوال ہے، وہ نہ تو دینی تعلیم کے نصاب کے ساتھ پوری طرح شامل کی جا سکتی ہے اور نہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ شامل اس لیے نہیں کی جا سکتی کہ مستند اور پختہ عالم دین کا مقام حاصل کرنے کے لیے فارسی، عربی، صرف و نحو، قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، معانی و ادب اور منطق و فلسفہ جیسے علوم کا ایک مکمل نصاب ہے جسے پوری طرح پڑھے بغیر کوئی شخص عالم دین کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا اور یہ نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے علم یا فن کے مکمل نصاب کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر اس نصاب میں کمی کی جائے تو دینی علوم میں مہارت کا پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ اور ضروری اس لیے نہیں ہے کہ یہ تخصصات اور اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ اب ہر شعبہ کے لیے الگ ماہرین تیار ہوتے ہیں اور کسی ایک شعبہ کے ماہر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے شعبہ کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ مثلاً کسی انجینئر کے لیے قطعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس کے علم سے بہرہ ور ہو اور کسی ڈاکٹر کے لیے ضروری نہیں کہ اس نے انجینئرنگ کا علم بھی حاصل کر رکھا ہو۔ اسی طرح کسی عالم دین کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس، انجینئرنگ یا کسی شعبہ کی مہارت رکھتا ہو۔

تاہم ایک فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک کسی شعبہ میں پوری مہارت اور مکمل تعلیم کا تعلق ہے، وہ تو کسی دوسرے شعبہ کے فرد کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن بنیادی اور جنرل معلومات ہر شعبہ کے بارے میں حاصل ہونی چاہئیں اور اس کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر یا انجینئر کے لیے دین کا مکمل عالم ہونا ضروری نہیں مگر دین کی بنیادی معلومات و مسائل سے آگاہی ان کے لیے لازمی ہے تاکہ وہ اپنے شعبہ میں دینی احکام کے دائرہ کو ملحوظ رکھ سکیں، اسی طرح ایک عالم دین کے لیے ڈاکٹر یا انجینئر ہونا ضروری نہیں البتہ ان شعبوں کے بارے میں بنیادی معلومات علماء کو ضروری طور پر حاصل ہونی چاہئیں تاکہ وہ ان شعبوں کے افراد کی دینی راہ نمائی صحیح طور پر کر سکیں۔ اسی طرح انگریزی آج کی بین الاقوامی زبان ہے، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صف آرا عالمی میڈیا کی زبان ہے اور پاکستان کی دفتری اور عدالتی زبان ہے، اس

لیے عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے کماحقہ بہرہ ور ہونا علماء کے لیے آج کے دور میں ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی یا تخفیف کی حمایت تو نہیں کریں گے، البتہ اس میں انگریزی زبان اور میڈیکل سائنس، جنرل سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کے بارے میں بنیادی معلومات کی حد تک نصاب کے اضافے کو ضروری سمجھتے ہیں اور دینی مدارس کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔

اس سلسلے میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً ان کی ایک بنیادی مشکل یہ ہے کہ جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں، ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کے بجائے ملازمت کے لیے سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے جس کی وجہ سے مساجد و مدارس کو ضرورت اور معیار کے مطابق ائمہ، خطباء اور مدرس میسر نہیں آتے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مروجہ معیار کسی طرح بھی اس درجہ کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب، امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے۔ پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے، اس لیے جسے سرکاری ملازمت میں جانے کا راستہ مل جاتا ہے، وہ لازماً ادھر کا رخ کرے گا اور مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کے فقدان اور خلا کا مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کر جائے گا۔

اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ ایک گفتگو کا حوالہ دینا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ اس دور کی بات کی ہے جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے وفاقی شرعی عدالت کے قیام کے بعد ضلع اور تحصیل کی سطح پر شرعی قاضی مقرر کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور قاضی کورس کے لیے آرڈیننس کے نفاذ کی تیاری ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ راولپنڈی کینٹ کے ملٹری ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سلسلہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ پاکستان بھر میں ضلع اور تحصیل کی سطح پر مقرر کرنے کے لیے اس قدر تربیت یافتہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ اگرچہ اس زمانے میں بعض دینی اداروں نے قاضیوں کی تربیت کے لیے چار ماہ یا چھ ماہ اور ایک سال کے کورس شروع کر رکھے تھے لیکن میں ان سے مطمئن نہیں تھا کہ قاضی بہرحال قاضی ہوتا ہے اور سال چھ ماہ کا کورس کسی شخص کو قاضی نہیں بنا سکتا، اور اگر ہم نے

پاکستان میں قاضی کورس کا آغاز اس طرح کے نیم قاضیوں سے کیا تو اسلام کے عدالتی نظام کا پہلا تاثر ہی اپنے نتائج کے لحاظ سے نقصان کا باعث بن سکتا ہے، چنانچہ میں نے مولانا مفتی محمودؒ سے سوال کیا کہ حضرت! یہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ جن مدرسین نے دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح تک کتابیں چار پانچ سال پڑھائی ہیں، وہ نظام قضا کے مختصر کورس کے بعد قضا کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں، لیکن پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ ضلع اور تحصیل کی سطح پر قاضی مقرر کرنے کے لیے پاکستان کے اضلاع اور تحصیلوں کی تعداد کے مطابق اس سطح کے مدرسین مل جائیں گے یا نہیں اور اگر ہمارے پاس اتنی تعداد میں اس معیار کے مدرسین مل بھی جائیں تو انہیں عدالتوں میں بھیج کر دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح کی کتابیں کون پڑھائے گا؟ اس سوال کا جواب حضرت مفتی محمودؒ نے اپنے مخصوص انداز میں ٹال دیا، لیکن میں نے ان کے چہرے کی سلوٹوں سے اندازہ لگا لیا کہ اس سوال نے خود انہیں بھی پریشان کر دیا ہے۔

دینی مدارس کو ابھی تک اپنے وجود کے تحفظ اور اپنے کردار کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظات کی فضا کا سامنا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی تیار کردہ کھیپ کو دوسرے شعبوں کے حوالے کر کے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔ اس لیے اگر دینی مدارس اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسہ تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

پھر ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ وہ یہ کہ اس وقت پاکستان بھر میں مساجد میں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دینے والے افراد میں مستند و غیر مستند کا تناسب کیا ہے؟ اگر اس کا غیر جانب دارانہ سروے کیا جائے تو غیر مستند ائمہ و خطباء کا تناسب مستند حضرات سے کہیں زیادہ ہوگا اور ہمارے ہاں مذہبی معاملات میں خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہی ہے جس کی طرف اکثر حضرات کی توجہ نہیں ہے، اور جو اہل دانش اس کا ادراک رکھتے ہیں، وہ کسی فتوے کی زد میں آنے کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے ناتے سے اسٹیٹ کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح دوسرے شعبوں میں ان کوالیفائیڈ افراد کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کوالیفائیڈ افراد کی فراہمی پر زور دیا

جاتا ہے، امامت و خطابت اور دینی تعلیم کے شعبہ میں بھی ان کوالیفائیڈ افراد کا تناسب کم سے کم کرنے اور بالآخر اسے ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے اور جس طرح ملک میں خواندگی کا تناسب بہتر بنانے کے لیے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ایک معقول بجٹ اس کام کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے، دینی شعبہ میں کوالیفائیڈ افراد کا تناسب بڑھانے کے لیے دینی مدارس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور قومی تعلیمی بجٹ میں ان کے لیے معقول حصہ مختص کیا جائے۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف شعبوں، بالخصوص عدلیہ میں مطلوبہ معیار کے رجال کار کی فراہمی کو دینی مدارس کے نظام نے اپنے مقاصد میں شامل نہیں کیا۔ یہ کام اگرچہ اصلاً ریاستی نظام تعلیم کا تھا لیکن ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ریاستی نظام تعلیم نے اس سمت نے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور اس کے بعد اس خلا کو پر کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں بہرحال دینی مدارس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اگر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم کا از سر نو جائزہ لے کر اسلام کو بطور نظام زندگی دوسرے مروجہ نظاموں کے ساتھ تقابل کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرتے اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے حدیث وفقہ کے ابواب کو ضروری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا تو دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کرام اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے تربیت یافتہ اور شعوری کارکن ثابت ہوتے اور اس کے ساتھ اگر تجارت، عدالت، انتظامیہ اور دیگر شعبوں کے افراد کے لیے ہلکے پھلکے کورسز تیار کر کے انہیں دینی مدارس کے تعلیمی دائرہ میں شریک کر لیا جاتا تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کی فراہمی کی ایک اچھی بنیاد مل سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے نتائج آج معاشرہ میں فکری انتشار اور اخلاقی انارکی کی صورت میں سب کے سامنے ہیں۔

دینی مدارس سے تیسری شکایت اسلام کے بارے میں مغربی لابیوں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پراپیگنڈا کی صورت میں سامنے آنے والے چیلنج کو نظر انداز کرنے کی ہے۔ آج اقوام متحدہ کے چارٹر، جنیوا انسانی حقوق کمیشن کی قراردادوں اور بنیادی حقوق کے مغربی تصورات کے حوالہ سے اسلامی احکام اور قوانین کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، جرائم کی شرعی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جا رہا ہے، ارتداد اور توہین رسالت پر قدغن کے بارے میں اسلامی قوانین کو آزادیٔ رائے کے بنیادی حق

سے متصادم کہا جا رہا ہے اور دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی معاشرہ کے قیام کو قرون وسطیٰ کے ظالمانہ دور کی واپسی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس چیلنج کا سامنے کرنے اور آج کی زبان میں اسلام کو انسانی حقوق کے علمبردار اور محافظ نظام کے طور پر پیش کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں دینی مدارس اور اداروں کی طرف اٹھتی ہیں اور عام مسلمان یہ توقع کرتا ہے کہ جس طرح دینی مدارس کے نظام نے برطانوی استعمار کے دور میں اعتقادی اور معاشرتی فتنوں کا دلجمعی سے مقابلہ کیا تھا، آج بھی وہ مغربی فلسفہ کی نئی اور تازہ دم یلغار کے سامنے خم ٹھونک کر میدان میں آئے گا، مگر چند استثناؤں کو چھوڑ کر دینی مدارس میں اس چیلنج کے ادراک کی فضا ہی سرے سے موجود نہیں جو بلاشبہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

دینی مدارس سے چوتھی شکایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساتذہ اور طلبہ کو گفتگو اور مباحثہ کے نئے اسلوب اور ہتھیاروں سے روشناس نہیں کرایا۔ فتویٰ اور مناظرہ کی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے مگر دینی مدارس بلکہ ہمارے منبر و محراب پر بھی ابھی تک اسی زبان کا سکہ چلتا ہے۔ اخبارات پڑھنے والے اور ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے ہماری زبان اور اسلوب بیان دونوں اجنبی ہو چکے ہیں مگر ہم کوئی پروا کیے بغیر اسی ڈگر پر قائم ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر دینی مجالس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کی زبان منطق و استدلال کی زبان ہے، مشاہدات کی زبان ہے، کسی بھی مسئلہ کو اس کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کرنے کی زبان ہے، اور انسانی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی زبان ہے، مگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اس زبان سے ناآشنا ہے اور ستم بالائے ستم کہ اچھا بولنے اور اچھا لکھنے والوں کا تناسب جو دینی حلقوں میں پہلے ہی بہت کم تھا، مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ انگلش اور عربی تو رہی ایک طرف، اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی تحریر کی صورت میں پیش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک پختہ کار عالم دین نے شکایت کی کہ فلاں قومی اخبار کو میں نے درجنوں مضامین بھجوائے ہیں، ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے جواب دیا کہ جو مضمون ہمیں پورے کا پورا از سر نو لکھنا پڑے، اسے شائع کرنے کا تکلف ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

دینی مدارس سے پانچویں شکایت یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی تربیت کا جو ماحول کچھ عرصہ پہلے تک ان مدارس میں قائم رہا ہے، وہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور گنتی کے چند اداروں کے سوا دینی مدارس کی اکثریت

ایسی ہے جن میں طلبہ کی فکری، دینی اور اخلاقی تربیت کا نظام موجود نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی اکثریت کے ذہنوں میں مشنری جذبہ کے طور پر کوئی واضح اور متعیّن مقصد زندگی نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی مقصد ہو بھی تو اس کے مطابق اس کی تربیت نہیں ہوتی اور اس کے نقصانات بھی قدم قدم پر سامنے آ رہے ہیں۔

دینی مدارس سے چھٹی شکایت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط و مشاورت کا نظام انتہائی کمزور ہے۔ پہلے تو بالکل نہیں تھا مگر کچھ عرصہ سے تمام مذہبی مکاتب فکر کے مدارس نے اپنے اپنے وفاق قائم کر لیے ہیں جو اگرچہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہیں لیکن اپنے اپنے مکتب فکر کی حد تک انہوں نے باہمی ربط کا ایک نظام قائم کر لیا ہے جس سے امتحانات کی صورت حال بہتر ہوئی ہے اور کچھ دیگر فوائد بھی سامنے آئے ہیں، لیکن معاشرہ میں دینی مدارس کی کارکردگی اور اثرات کا دائرہ جس قدر وسیع ہے، اس کے مطابق موجودہ ربط و نظم قطعی طور پر ناکافی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مدارس کے قیام میں کوئی منصوبہ بندی اور ترجیحات نہیں ہیں۔ جہاں جس کا جی چاہتا ہے، ضرورت اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر کسی بھی معیار اور سائز کا دینی ادارہ قائم کر لیتا ہے اور چونکہ اوپر چیکنگ کا کوئی نظم موجود نہیں ہے، اس لیے کارکردگی اور اخراجات کا دائرہ شخص واحد یا زیادہ سے زیادہ اس کے منظور نظر چند افراد تک محدود رہتا ہے۔ ان خود رو دینی مدارس میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جو تعلیمی اداروں کے بجائے "مذہبی دکانیں" کہلانے کے زیادہ حق دار ہیں اور ان میں مالی بدعنوانیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔

ضیاء الحق مرحوم کے دور میں سرکاری زکوٰۃ کا ایک حصہ دینی مدارس کے لیے مخصوص کیا گیا تو اس کے حصول کے لیے دنوں میں کئی مدرسے وجود میں آ گئے اور پھر سرکاری زکوٰۃ کی رقم حاصل کرنے کے لیے رشوت، سفارشات اور بدعنوانیوں کے جو دروازے کھلے، انہوں نے دینی اداروں کو بھی دیگر سرکاری محکموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس سلسلہ میں مدارس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ معیاری دینی ادارے ہیں جنہوں نے سرکاری زکوٰۃ کی وصولی سے گریز کیا اور اپنی چادر کے دائرے میں پاؤں پھیلانے کے باوقار طریق کار پر گامزن رہے۔ دوسرے نمبر پر وہ دینی ادارے ہیں جو اپنی کارکردگی اور معاملات میں دیانت اور اعتماد کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور انہوں نے

سرکاری زکوٰۃ وصول کر کے اسے صحیح مصرف پر صرف کیا۔ اور تیسرے نمبر پر وہ مدارس ہیں جنہوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے میں کسی دینی اور اخلاقی معیار کی پابندی کا تکلف گوارا نہیں کیا۔ بدقسمتی سے سرکاری ریکارڈ میں تیسری قسم کے مدارس کی فہرست زیادہ لمبی ہے اور دینی مدارس کے مجموعی نظام کے بارے میں سرکاری محکموں کی رائے قائم ہونے میں یہی فہرست بنیاد بن رہی ہے۔

پھر چند بڑے اور معیاری دینی مدارس کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر دینی مدارس نے عوامی چندہ کے حصول کے لیے جو طریقے کچھ عرصہ سے اختیار کر لیے ہیں، انہوں نے چندہ دینے والے اصحاب خیر کو پریشان کر دیا ہے اور اس سے مدارس کی نیک نامی اور اعتماد مجروح ہو رہا ہے۔ کراچی، فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے کاروباری شہروں میں رمضان المبارک کے دوران میں مساجد اور دکانوں پر دینی مدارس کے سفیروں کی جو یلغار ہوتی ہے اور لوگوں کی توجہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، اس سے دینی اداروں کے اعتماد اور وقار کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں کہ کاروباری شہروں میں بہت سے دوکاندار رمضان المبارک کے دوران میں سفیروں کی یلغار کے خوف سے خود اپنی دکانوں پر بیٹھنے سے کترانے لگے ہیں اور مساجد میں نمازوں کے بعد کھڑے ہو کر اپیل کرنے والے سفیروں کو اب نمازیوں نے ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال پاکستان سے باہر لندن میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش کے مدارس کے سفراء نماز کے بعد کھڑے ہو کر اپنے مدرسے کے لیے اپیل کرتے ہیں اور پھر دروازے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں جہاں نمازی گزرتے ہوئے پاؤنڈ اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے حساس دینی کارکن کی نظریں شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل جنگ لندن میں ایک مسلم نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا جس میں اس نے بتایا کہ برطانیہ میں پلنے بڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مساجد میں اس لیے نہیں آتی کہ ایک تو ائمہ اور خطباء کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے جن موضوعات پر وہ گفتگو کرتے ہیں، ان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، تیسرے ہر نماز کے بعد کسی نہ کسی مدرسہ کا سفیر چندہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس ہر آدمی کو دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے۔ یہ صورت حال برطانیہ کی مساجد کی ہے جو ہزاروں میل دور اور اکثر مدارس کے سفراء کی دسترس سے باہر ہے۔ جب وہاں کا یہ حال ہے

تو اپنے ملک کی مساجد کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ اور قیاس کرنے کی ضرورت کیا ہے، سارا منظر تو ہم رمضان المبارک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ لوگ دینی مدارس سے تعاون نہیں کرتے، اس لیے مدارس کو مجبوراً ایسے طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، کیونکہ بیسیوں ایسے اداروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کا سالانہ بجٹ لاکھوں سے متجاوز ہے اور بعض کا کروڑوں کی حدود میں قدم رکھ رہا ہے۔ وہ مدارس نہ سرکاری امداد لیتے ہیں اور نہ ہی ان کے سفیر اس طرح چندہ کے لیے گھومتے پھرتے ہیں، مگر ان کا بجٹ صاحب خیر مسلمانوں کے تعاون سے باوقار طریقہ سے فراہم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے دینی مدارس کا ماضی اور حال جسے اب پاکستان کی وزارت داخلہ اور اس سے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر ایمنسٹی انٹرنیشنل اپنی تحقیقات اور سروے کی بنیاد بنا کر دنیا کو ان کی منفی تصویر دکھانے کے درپے ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا تو یہ نظریاتی محاذ ہے۔ وہ مغربی حکومتوں اور لابیوں کی نمائندہ ہے جن کا موقف یہ ہے کہ اسلام آج کے دور میں بطور نظام زندگی قابلِ عمل نہیں ہے اور اسلامی احکام و قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں، اس لیے عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات کو ناکام بنانا ضروری ہے، ورنہ قرون وسطیٰ کا وحشیانہ دور پھر واپس آسکتا ہے جس سے ویسٹرن سولائزیشن اور تہذیب و ترقی سب کچھ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے مغربی حکومتیں اور ان کے مفاد میں کام کرنے والی لابیاں عالم اسلام میں دینی بیداری کے سرچشموں کو بند کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی نظر میں پاکستان دنیا کا سب سے بڑا بنیاد پرست مسلمان ملک ہے اور پاکستان کی بنیاد پرستی کا سرچشمہ دینی مدارس ہیں، اس لیے دینی مدارس کو غیر مؤثر بنانا اور عوام کے ساتھ ان کے اعتماد کے رشتے کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر علماء کرام اور دینی مدارس کی کردارکشی اور انہیں منتشر رکھنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل اسی مہم کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے اور پاکستان کے غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کو بنیاد بنا کر ایک رپورٹ دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کر رہی ہے جس میں دکھایا جائے گا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے، انہیں مارا جاتا ہے، زنجیروں سے باندھا جاتا ہے، ان سے جبری بیگار لی جاتی ہے، ان کی خوراک، رہائش اور

صفائی کا معیار ناقص ہے، انہیں ان مدارس میں آزادیٔ رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں، انہیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی کے کسی شعبے میں کھپ نہ سکیں، ان کے نام پر چندہ جمع کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی تنگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحہ کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کا حصہ ہو گا جو اگلے سال جون تک منظر عام پر آ رہی ہے اور اس کے لیے بطور خاص ایسے غیر معیاری مدارس کو سروے کی بنیاد بنایا جا رہا ہے جہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے تاکہ رپورٹ پر ''غیر حقیقت پسندانہ'' اور ''خلاف واقعہ'' ہونے کا الزام عائد نہ کیا جا سکے۔ اس سروے مہم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی کوئی ٹیم معیاری دینی مدارس میں نہیں جائے گی اور نہ ہی رپورٹ میں ان کا تذکرہ ہو گا۔ پاکستان کی وزارت داخلہ اور دیگر محکمے اس مہم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے معاون ہیں اور دینی مدارس کے خلاف اس مہم میں ان کے مقاصد بھی اس سے مختلف نہیں ہیں۔

کسی بھی طبقے کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے دینی مدارس کو اور دینی مدارس کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہو گا اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہو گا، ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پراپیگنڈا مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ:

- تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعے سے کنٹرول کیا جائے۔
- درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔
- گفتگو اور مباحثہ کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔
- اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا

کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔

- مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقہ میں وہاں کی ضرورت کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔
- اباحیت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔
- دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ کو اجاگر کیا جائے۔
- مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس سلسلہ میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔
- اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش، خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور کام کو پھیلانے کے بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔
- مسلم معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت، خدمات اور کردار کے حوالہ سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد ان گزارشات پر ہمدردانہ غور فرما کر اصلاح احوال کی ضروری تدابیر اختیار کریں گے تاکہ دینی مدارس کا یہ نظام ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسلامی علوم کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں مفید اور مؤثر کردار ادا کر سکے۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۱۹۹۵ء)

نئے دور کا چیلنج اور دینی مدارس

دینی مدارس کے موجودہ نظام کی بنیاد امداد باہمی اور عوامی تعاون کے ایک مسلسل عمل پر ہے جس کا آغاز ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد اس جذبہ کے ساتھ ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت کو مکمل طور پر کچل کر فتح کی سرمستی سے دوچار ہو جانے والی فرنگی حکومت سیاسی، ثقافتی، نظریاتی اور تعلیمی محاذوں پر جو یلغار کرنے والی ہے، اس سے مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ اور تہذیب و تعلیم کو بچانے کی کوئی اجتماعی صورت نکالی جائے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے دیوبند میں مدرسہ عربیہ (دارالعلوم دیوبند)، سہارنپور میں مظاہر العلوم اور مراد آباد میں مدرسہ شاہی کا آغاز ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے طول و عرض میں ان مدارس کا جال بچھ گیا۔ ان مدارس کے لیے بنیادی اصول کے طور پر یہ بات طے کر لی گئی کہ ان کا نظام کسی قسم کی سرکاری یا نیم سرکاری امداد کے بغیر عام مسلمانوں کے چندہ کی بنیاد پر چلایا جائے گا اور تاریخ گواہ ہے کہ انتہائی سادگی اور قناعت کے ساتھ ان مدارس نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے وقیع دینی خدمات سرانجام دیں۔

ان مدارس کے منتظمین اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ایسے مردان باصفا کی تھی جو وقت کی رفتار کے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیتے تو دنیاوی زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں بے دام غلام کی طرح ان کے دروازے پر قطار باندھے کھڑی نظر آتیں، لیکن غیور اور جسور فقراء کے اس گروہ نے مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے کے عظیم مشن کی خاطر نہ صرف ان آسائشوں اور سہولتوں کو تج دیا بلکہ اپنی ذاتی انا اور عزت نفس کی پروا نہ کرتے ہوئے صدقات، زکوٰۃ، عشر اور ایک ایک دروازے سے ایک ایک روٹی مانگنے کے لیے ہتھیلیاں اور جھولیاں قوم کے سامنے پھیلا دیں اور ہر قسم کے طعن و تشنیع اور تمسخر و استہزا کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے انتہائی صبر و ثبات کے ساتھ ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھ دی جس نے برصغیر میں اسپین کی تاریخ دہرانے کی فرنگی خواہش اور سازش کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور برطانوی حکمران بالآخر یہی حسرت دل میں لیے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور

ہو گئے۔

دینی مدارس کی جدوجہد کے نتائج و ثمرات کے حوالہ سے اگر معاشرے میں ان مدارس کے اجتماعی کردار کا تجزیہ کیا جائے تو تمام تر خامیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس کی شکل کچھ اس طرح سامنے آتی ہے کہ:

- لارڈ میکالے نے مسلمانوں کی نئی نسل کو ذہنی لحاظ سے انگریز کا غلام بنانے اور نوآبادیاتی فرنگی نظام کے کل پرزوں کی شکل میں ڈھالنے کے لیے جس نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی، اس کے مقابلے میں دینی مدارس کی شکل میں ایک مستحکم اور ناقابلِ شکست متوازی نظام تعلیم اور مغربی ثقافت سے محفوظ رہنے کی خواہش رکھنے والے غیور مسلمانوں کو ایک مضبوط نظریاتی اور تہذیبی حصار میسر آگیا۔
- جدید عقل پرستی کی بنیاد پر دینی عقائد و روایات سے انحراف، انکار ختم نبوت، انکار حدیث اور اس قسم کے دیگر اعتقادی اور مذہبی فتنوں نے سر اٹھایا تو یہ دینی مدارس پوری قوت کے ساتھ ان کے سامنے صف آرا ہو گئے اور ملت اسلامیہ کی راسخ الاعتقادی کا تحفظ کیا۔
- فرنگی تہذیب اور یورپی ثقافت کی طوفانی یلغار کا سامنا کرتے ہوئے دینی مسلم ثقافت کو ایک حد تک بچانے اور بطور نمونہ باقی رکھنے میں ان مدارس نے کامیابی حاصل کی۔
- قرآن و سنت کے علوم، عربی زبان اور دینی لٹریچر کو نہ صرف زمانہ کی دستبرد سے بچا کر رکھا بلکہ ملک میں ان علوم کے حاملین اور مستفیدین کی ایک بڑی تعداد پیدا کر کے اگلی نسلوں تک انہیں من و عن پہنچانے کا اہتمام کیا۔
- دینی مدارس کے اس نظام نے تحریک آزادی کو شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا عبد القیوم پوپلزئی، مولانا تاج محمود امروٹی، مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبد القادر قصوری اور صاحبزادہ سید فیض الحسن جبکہ تحریک پاکستان کو علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اطہر علی، مولانا عبد الحامد بدایونی اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی جیسے بے باک، مخلص اور جری راہنماؤں کی صورت میں ایک مضبوط نظریاتی قیادت مہیا کی جن کے ایثار، قربانی اور جدوجہد نے تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کو کامیابی کی منزل سے ہم کنار کیا۔

- افغانستان کی سنگلاخ وادیوں میں کمیونزم کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا جائزہ لے لیا جائے جس نے روسی افواج کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کرنے کے علاوہ وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کو آزادی سے ہم کنار کیا اور روسی استعمار کے آہنی پنجے کو توڑ کر مشرقی یورپ کو بھی کمیونزم کی گرفت سے آزاد کر دیا ہے۔ افغانستان کے غیور مسلمانوں کے اس عظیم جہاد کی قیادت کا ایک بڑا اور فیصلہ کن حصہ انھی دینی مدارس کا تربیت یافتہ ہے۔ اس طرح افغانستان کو روسی کمیونزم کے لیے ''پانی پت'' کا میدان بنا دینے کا کریڈٹ بھی دینی مدارس کے اسی نظام کے حصے میں آتا ہے، اور اب جہاد افغانستان کے ثمرات کو سبوتاژ کرنے کی عالمی سازش کو ناکام بنا کر ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم کرنے والے ''طالبان'' تو سو فی صد انھی مدارس کے فیض یافتہ اور انھی اکابر کے خوشہ چین ہیں۔

الغرض دینی مدارس کی یہ عظیم جدوجہد اور اس کے نتائج و ثمرات تاریخ کے صفحات پر اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ کوئی ذی شعور اور منصف مزاج شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا اور یہ حقیقت ہے کہ فرنگی اقتدار کے تسلط، مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار اور صلیبی عقائد و تعلیم کی بالجبر ترویج کے دور میں یہ مدارس ملی غیرت اور دینی حمیت کا عنوان بن کر سامنے آئے اور انہوں نے انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں سیاست، تعلیم، معاشرت، عقائد اور تہذیب و ثقافت کے محاذوں پر فرنگی سازشوں کا جرات مندانہ مقابلہ کر کے برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کو اسپین بننے سے بچا لیا اور یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج اس خطہ زمین میں مذہب کے ساتھ وابستگی اور اسلام کے ساتھ وفاداری کے جن مظاہر نے کفر کی پوری دنیا کو لرزہ براندام کر رکھا ہے، عالم اسباب میں اس کا باعث صرف اور صرف یہ دینی مدارس ہیں۔ لیکن مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کے دوسرے رخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے اور ارباب فہم و دانش کی ان توقعات اور امیدوں کا مرثیہ بھی پڑھ لیا جائے جن کا خون ناحق ہمارے دینی مدارس کی اجتماعی قیادت کی گردن پر ہے۔

تفصیلات و فروعات تک گفتگو کا دائرہ وسیع کرنے کے بجائے ہم اپنی گزارشات کو صرف دو سوالات کے حوالے سے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ جدید مغربی فلسفہ حیات کے اثرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کردار کیا ہے؟ اور

۲۔ مسلم معاشرے میں نفاذ اسلام کے ناگزیر علمی و فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان

مدارس کا نظام کار اور حکمت عملی کیا ہے؟

ایک دور تھا جب یونانی فلسفہ نے عالم اسلام پر یلغار کی تھی اور عقائد و افکار کی دنیا میں بحث و تمحیص کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگر اس وقت عالم اسلام کے تعلیمی مراکز اور اہل علم یونانی فلسفہ کی اس یلغار کو وقتی طوفان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور اپنے کان اور منہ لپیٹ کر اس کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہتے تو اسلامی علوم و عقائد کا پورا ڈھانچہ فلسفہ یونان کی حشر سامانیوں کی نذر ہو جاتا، لیکن علمائے اسلام نے اس دور میں ایسا نہیں کیا بلکہ یونانی فلسفہ کے اس چیلنج کو قبول کر کے خود اس کی زبان میں اسلامی عقائد و افکار کو اس انداز سے پیش کیا کہ یونانی فلسفہ کے لیے پسپائی کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا اور اس کے بپا کیے ہوئے فکری اور نظریاتی معرکوں کے تذکرے آج رازی، غزالی، ابن رشد اور ابن تیمیہ کی تصنیفات میں یادگار کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔

یورپ کے جدید فلسفہ حیات کی یلغار بھی یونانی فلسفہ کے حملہ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ یہ فلسفہ حیات جس نے انقلاب فرانس کے ساتھ اپنا وجود تسلیم کرایا اور پھر یورپ کے صنعتی انقلاب کے زیر سایہ اپنا دائرہ وسیع کرتے ہوئے آج دنیا کے اکثر و بیشتر حصہ کو لپیٹ میں لے چکا ہے، خود کو انسانی زندگی کے ایک ہمہ گیر فلسفہ کے طور پر پیش کرتا ہے اور انسان کے پیدائش کے مقصد سے لے کر انسانی معاشرت کے تقاضوں اور مابعد الطبیعیات کی وسعتوں تک کو زیر بحث لاتا ہے۔ ڈارون، فرائیڈ، نطشے اور دیگر مغربی فلاسفروں اور سائنس دانوں کی گزشتہ دو صدیوں پر محیط فکری کاوشوں اور نظریاتی مباحث کا خلاصہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ کلیسا کی بدکرداریوں اور مظالم کے رد عمل کے طور پر جنم لینے والے اس فلسفہ کو یورپ نے ایک مکمل فلسفہ حیات کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے ذریعے سے وہ دنیا میں موجود، اسلام سمیت تمام فلسفہ ہائے حیات کو مکمل شکست سے دوچار کر کے فنا کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے یورپ کی فکری یلغار کی ماہیت اور مقاصد کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور اسے محض اقتصادی اور سیاسی بالادستی کا جنون سمجھ کر اس انداز میں اس کا سامنا کرتے رہے کہ اس کے فکری اور اعتقادی پہلوؤں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ یونانی فلسفہ کے در آنے سے ہمارے ہاں عقائد کے نئے مباحث چھیڑ گئے تھے جنہیں علمائے کرام نے اپنے فکری اور علمی مباحث میں سمو دیا اور ہمارے عقائد کی بیشتر کتابیں ان مباحث سے بھرپور ہیں حتیٰ کہ دینی مدارس کے نصاب میں آج تک طلبا کو عقائد کے حوالے سے انہیں مباحث سے روشناس کرایا جاتا ہے جو یونانی فلسفہ کی پیداوار

ہیں اور جن میں سے زیادہ تر کا آج کے نئے فکری اور اعتقادی تقاضوں کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے، لیکن جو اعتقادی مباحث یورپ کے فلسفہ حیات نے چھیڑے ہیں، نہ ہماری عقائد کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہم طلبا کو ان مباحث کی ہوا ہی لگنے دیتے ہیں۔

ڈارون کا نظریہ ارتقا، انسان کے مقصد وجود میں کشش جنسی کی محوری حیثیت کے بارے میں فرائیڈ کے تصورات، اجتماعی زندگی سے مذہب کی مکمل لاتعلقی اور غیر محدود فکری آزادی کا نعرہ آخر اعتقادی مباحث نہیں تو اور کیا ہیں؟ اور کیا انہی افکار و نظریات کا شکار ہو کر مسلمان کہلانے والوں کی ایک بڑی تعداد اسلام کے اجتماعی کردار سے منکر یا کم از کم مذبذب نہیں ہو چکی ہے؟ اس اعتقادی فتنہ کی روک تھام کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کیا کردار ہے؟ ہمارے نصاب میں تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی کون سی کتاب میں یہ مباحث شامل ہیں اور ہم اپنے طلبا کو ان مباحث سے روشناس کرانے اور انہیں ان کے جواب کی خاطر تیار کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

یہ وقت کا ایک اہم سوال اور دینی مدارس کی اجتماعی قیادت پر مسلم معاشرہ اور نئی نسل کا ایک قرض ہے جس کا سامنا کیے بغیر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ فروعی اور جزوی مسائل ہمارے ہاں بنیادی اور کلیدی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور جو امور فکر و اعتقاد کی دنیا میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی ہماری نظر میں کوئی وقعت ہی باقی نہیں رہی۔ ہماری پسند و ناپسند اور وابستگی و لاتعلقی کا معیار جزوی مسائل اور گروہی تعصبات ہیں۔ ایک مثال بظاہر معمولی سی ہے لیکن اس سے ہماری فکری ترجیحات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ایک دوست نے جنہوں نے ہمارے دینی ماحول سے تربیت حاصل کی ہے، گزشتہ دنوں ایک بڑے سیاسی لیڈر کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا کہ وہ بہت اچھا اور صحیح العقیدہ لیڈر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک بیان میں کہا ہے کہ میں برسیوں اور عرسوں میں شامل ہونے کا قائل نہیں ہوں۔ ان سے عرض کیا گیا کہ وہ سیاسی لیڈر تو سیکولر نظریات کا قائل ہے اور اجتماعی زندگی میں نفاذ اسلام کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتا، اس کے جواب میں ہمارے اس دوست کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو سیاسی باتیں ہیں، اصل بات یہ ہے کہ وہ عرسوں اور برسیوں کا مخالف ہے، اس لیے وہ ہمارے مسلک کا ہے اور صحیح العقیدہ ہے۔ یعنی اسلام کے اجتماعی زندگی میں نفاذ کا مسئلہ سیاسی ہے اور عرسوں میں شریک ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ اعتقادی ہے۔ آخر یہ سوچ کہاں سے آئی ہے؟ کیا یہ ہمارے دینی مدارس کی غلط فکری ترجیحات کا ثمرہ نہیں ہے؟

اب آئیے دوسرے نکتے کی طرف کہ نفاذ اسلام کے علمی و فکری تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہمارے دینی مدارس کا کردار کیا ہے؟

جہاں تک نفاذ اسلام کی اہمیت کا تعلق ہے، کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا اور علمائے اہل سنت نے اسے اہم ترین فرائض میں شمار کیا ہے بلکہ ابن حجر مکی اور دیگر ائمہ نے اس کی تصریح کی کہ نظام اسلام کے نفاذ کے لیے خلافت کا قیام ''اہم الواجبات'' ہے جسے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر بھی ترجیح دی اور آنحضرتؐ کے جنازہ اور تدفین سے قبل حضرت ابوبکرؓ کا بطور خلیفہ انتخاب کیا۔

پھر برصغیر میں ہمارے اکابر کی جنگ آزادی کا بنیادی مقصد بھی حصول آزادی کے بعد نظام اسلام کا غلبہ و نفاذ رہا ہے اور پاکستان کا قیام بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نعرہ پر شریعت اسلامیہ کی بالادستی کے لیے عمل میں آیا ہے، لیکن اسلام کو ایک اجتماعی نظام کے طور پر ہمارے دینی مدارس میں نہ پڑھایا جا رہا ہے اور نہ طلبا کی اس انداز سے ذہن سازی ہی کی جا رہی ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ ایک نظام کے طور پر کریں حالانکہ، حدیث اور فقہ کی بیشتر کتابیں محدثین اور فقہاء نے اس انداز سے لکھی ہیں کہ ان میں اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کا الگ عنوان کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق کے علاوہ تجارت، خلافت، جہاد، دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات، صنعت، زمینداری، حدود و تعزیرات، نظام عمل، نظام عدالت، معاشرت اور دیگر اجتماعی شعبوں کے بارے میں حدیث اور فقہ کی کتابوں میں مفصل اور جامع ابواب موجود ہیں جن کے تحت محدثین اور فقہاء نے احکام و ہدایات کا بیش بہا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، لیکن ان ابواب کی تعلیم میں ہمارے اساتذہ کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ہمارے اساتذہ کے علم اور بیان کا سارا زور کتاب الطہارت اور صلوٰۃ کے جزوی مباحث میں صرف ہو جاتا ہے اور خلافت و امارت، تجارت و صنعت، جہاد، حدود، تعزیرات اور اجتماعی زندگی سے متعلق دیگر مباحث سے یوں کان لپیٹ کر گزر جاتے ہیں جیسے ان ابواب کا ہماری زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو یا جیسے ان ابواب کی احادیث اور فقہی جزئیات منسوخ ہو چکی ہوں اور اب صرف تبرک کے طور پر انہیں دیکھ لینا کافی ہو، حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اجتماعی زندگی سے متعلق ابواب کو زیادہ اہتمام سے پڑھایا جاتا، قانون، سیاست، خارجہ پالیسی، جنگ اور اجتماعیت کے جدید افکار و نظریات سے اسلامی تعلیمات کا تقابل کر کے اسلامی احکام کی برتری طلبا کے ذہنوں میں بٹھائی جاتی اور انہیں اسلامی افکار و نظریات کے دفاع اور اس کی عملی

ترویج کے لیے تیار کیا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس اہم ترین دینی و قومی ضرورت سے مسلسل صرف نظر کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کی پچانوے فیصد اکثریت خود اسلامی نظام سے ناواقف اور جدید افکار و نظریات کو سمجھنے اور اسلامی احکام کے ساتھ ان کا تقابل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کے اعتراف میں کسی حجاب سے کام نہیں لینا چاہیے اور اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی تلافی کی کوئی صورت نکالنی چاہیے۔

آج نفاذ اسلام کی راہ میں ایک بڑی عملی رکاوٹ یہ بھی ہے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے رجال کار کا فقدان ہے۔ اسلامی نظام کو سمجھنے والے اور اس کو چلانے کی صلاحیت سے بہرہ ور افراد کا تناسب ضرورت سے بہت کم ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اور یہ خلا آخر کس نے پر کرنا ہے؟ جس نظام تعلیم کو ہم لارڈ میکالے کا نظام تعلیم کہتے ہیں، اس سے تو یہ توقع ہی عبث ہے کہ وہ اسلامی نظام کے لیے کل پرزے فراہم کرے گا اور دینی نظام تعلیم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کردار ادا نہیں کر رہا تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کیا آسمان سے اتریں گے؟

دینی مدارس کے اجتماعی کردار کے منفی پہلوؤں کے بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش موجود ہے بلکہ بہت کچھ کہنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم صرف مذکورہ دو اصولی مباحث کے حوالے سے توجہ دلاتے ہوئے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام، دینی مدارس کی اجتماعی قیادت بالخصوص وفاق المدارس العربیہ، تنظیم المدارس اور وفاق المدارس السلفیہ کے ارباب حل و عقد سے گزارش کریں گے کہ وہ اس صورت حال کا سنجیدگی سے نوٹس لیں اور یورپ کے لادینی فلسفہ حیات کو فکری محاذ پر شکست دینے اور نفاذ اسلام کے لیے رجال کار کی فراہمی کے محاذ پر اپنے کردار کا از سر نو تعین کریں، ورنہ وہ اپنی موجودہ کارکردگی اور کردار کے حوالہ سے نہ خدا کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکیں گے اور نہ مؤرخ کا قلم ہی ان کے اس منفی کردار کو بے نقاب کرنے میں کسی رعایت اور نرمی سے کام لے گا۔

(ماہنامہ الشریعہ، جولائی ۱۹۹۸ء)

دینی نظام تعلیم میں اصلاحِ احوال کی ضرورت اور حکمتِ عملی

[۳۱ر اگست ۲۰۰۰ء کو اسلام آباد میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام دینی مدارس کے بارے میں منعقد ہونے والی مجلس مذاکرہ میں پڑھا گیا۔]

بعد الحمد والصلوٰۃ۔

محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دینی مدارس کے حوالے سے انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کی مجلس مذاکرہ میں مجھے منتخب ارباب علم و دانش کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور ہماری اس ملاقات و گفتگو کو دین وملت کے لیے افادیت کا حامل بنا دیں۔ آمین یارب العالمین۔

جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے جن دینی مدارس کے بارے میں آج ہم بحث و گفتگو کر رہے ہیں، وہ اس وقت عالمی سطح کے ان اہم موضوعات میں سے ہیں جن پر علم و دانش اور میڈیا کے اعلیٰ حلقوں میں مسلسل مباحثہ جاری ہے اور مغرب اور عالم اسلام کے درمیان تیزی سے آگے بڑھنے والی تہذیبی کشمکش میں یہ مدارس اسلامی تہذیب و ثقافت اور علوم و روایات کے ایسے مراکز اور سرچشموں کے طور پر متعارف ہو رہے ہیں جو مغربی تہذیب و ثقافت کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت اور ایڈ جسٹمنٹ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے ایک بڑے اور مؤثر حصے کو اس بے لچک رویے اور غیر مصالحانہ طرز عمل پر قائم رکھنے کا باعث بن رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے مختلف طبقات اور اداروں میں یہی ادارہ مغرب کی تنقید اور کردار کشی کی مہم کا مرکزی ہدف قرار پایا ہے اور گلوبل سولائزیشن وار میں اس ادارے کو امت مسلمہ کے سپر انداز ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ گردانتے ہوئے اسے راستے سے ہٹانے کے مختلف منصوبے وقتاً فوقتاً سامنے

آتے رہتے ہیں اور یہ اسی کا ردعمل ہے کہ دینی مدارس خود کو حالت جنگ میں سمجھتے ہوئے اپنی موجودہ صف بندی میں کسی قسم کے ردوبدل پر آمادہ نہیں ہیں اور ان کے نظام و نصاب میں ترمیم و تبدیلی کی کوئی بھی تجویز ان کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں دینی مدارس کے نظام و نصاب میں اصلاح احوال کے حوالے سے بھی کوئی بات کہتے ہوئے ان کی اس مجبوری کو سامنے رکھنا ہوگا اور ان تحفظات کا لحاظ کرنا ہوگا جن کے باعث دینی مدارس کے ارباب حل و عقد خود کو اردگرد کے ماحول سے بے گانہ رکھنے اور منہ کان لپیٹ کر اس فضا سے گزر جانے پر مجبور پا رہے ہیں۔ اس لیے اپنی گزارشات کو آگے بڑھانے سے قبل دینی مدارس کے تحفظات میں سے دو اہم امور کا تذکرہ اس مرحلہ پر ضروری خیال کرتا ہوں:

۱۔ دینی مدارس یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرہ میں عام مسلمان کا تعلق دین کے ساتھ قائم رکھنے، دینی علوم کی ترویج و اشاعت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کے لیے ان کے مسلمہ کردار کی اثر خیزی کی اصل وجہ ان کا آزادانہ کردار اور انتظامی و مالی خود مختاری ہے جسے وہ عام مسلمانوں کے رضاکارانہ تعاون کے ذریعے سے قائم رکھے ہوئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سرکاری اور ریاستی اداروں کو کسی بھی درجہ میں دینی مدارس کے نظام میں دخل اندازی کا موقع مل گیا تو وہ اپنے اس کردار یا کم از کم اس کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں گے۔

۲۔ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد یہ سمجھتے ہیں کہ ان مدارس کے قیام و وجود کا سب سے اہم مقصد معاشرہ میں مسجد و مدرسہ کے ادارہ کو قائم رکھنا اور اسے رجال کار فراہم کرتے رہنا ہے جو کہیں اور سے فراہم نہیں ہو رہے، اس لیے وہ اپنے نصاب کو اسی دائرہ میں محدود رکھنا چاہتے ہیں تاکہ دینی مدارس سے تیار ہونے والی کھیپ صرف ان کی اپنی ضروریات میں کھپتی رہے اور اس شعبہ سے افرادی قوت کا انخلا اس انداز سے نہ ہو کہ معاشرہ میں مسجد و مدرسہ کا بنیادی ادارہ ضرورت کے افراد کی کمی کے باعث تعطل کا شکار ہونے لگے۔ ہمارے نزدیک ان دینی مدارس میں جدید سائنسی علوم کے داخلہ کا دروازہ بند رکھنے کی بنیادی وجہ یہی چلی آ رہی ہے کہ جدید علوم اور مروجہ فنون سے آراستہ ہونے کے

بعد کسی فاضل کو مسجد و مدرسہ کے ماحول میں محدود رکھنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جائے گا، جبکہ مسجد و مدرسہ کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک اچھی خاصی تعداد خود کو دوسرے تمام کاموں سے فارغ کر کے اسی کام کے لیے وقف کر دے اور اب تک کا تجربہ و مشاہدہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی یہی "حکمت عملی" جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اب تک دینی حمیت و وابستگی کو باقی رکھنے بلکہ اسے پوری دنیائے اسلام میں امتیازی حیثیت پر فائز کرنے کا باعث بنی ہوئی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس وقت دینی مدارس میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسے "سب اچھا" کہہ کر خاموش ہو جانا چاہیے بلکہ دینی مدارس کے اس نظام و نصاب میں اصلاح کی ضرورت خود ان دینی مدارس کے سنجیدہ اکابر ایک عرصہ سے محسوس کر رہے ہیں اور اس کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے، لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ اصلاح احوال کے لیے ان کی مخلصانہ آواز کو جب کچھ دوسرے حلقے "کیچ" کر کے اس کی آڑ میں اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ آواز بھی وقتی طور پر مصلحت کے تحت دب جاتی ہے اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی۔

اس پس منظر میں دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح احوال کی ضرورت اور حکمت عملی پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں دینی مدارس کے تحفظات اور ان کے ارباب حل و عقد کے ذہنوں میں موجود خطرات و خدشات کو پوری طرح ملحوظ رکھنا ہو گا۔ چنانچہ اسی مجموعی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ حالات میں دینی مدارس کے نظام و نصاب میں جن اصلاحات، ترامیم اور اضافوں کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے، انہیں اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

ا۔ دینی مدارس میں مروجہ زبانوں پر اس درجہ کے عبور کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی کہ ایک فارغ التحصیل عالم دین کسی مسئلہ پر اپنا مافی الضمیر انگلش، عربی، یا کم از کم اردو میں ہی شستہ انداز میں قلم بند کر سکے یا اس کا زبانی طور پر کسی علمی محفل میں سلیقہ کے ساتھ اظہار کر سکے۔ اس لیے دینی مدارس میں ایسا نظام قائم کرنا انتہائی ضروری ہے کہ اردو اور عربی

دونوں زبانوں میں تحریری اور تقریری طور پر ما فی الضمیر کے اظہار پر فضلاء کو دسترس حاصل ہو اور انگلش بھی کم از کم اس درجہ میں لازمی ہو کہ لکھی ہوئی چیز کو پڑھ اور سمجھ کر وہ اس کے بارے میں اپنی زبان میں اظہار خیال کر سکیں۔

۲۔ درس نظامی کے مروجہ نصاب میں تاریخ، بالخصوص عالم اسلام کی تاریخ کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر مواد موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک فارغ التحصیل عالم دین عام طور پر تاریخی تسلسل اور اہم واقعات کی ترتیب تک سے بے خبر رہ جاتا ہے اور یہ بات خود دینی راہ نمائی کے تقاضوں کے منافی ہے۔

۳۔ دوسرے ادیان و مذاہب، معاصر فلسفہ ہائے حیات اور نظام ہائے زندگی کا تقابلی مطالعہ دینی مدارس کے فضلاء کے لیے انتہائی ضروری ہے اور موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش کے پس منظر اور مرحلہ وار پیش قدمی سے بھی علماء کرام کا باخبر ہونا لازمی ہے، ورنہ موجودہ عالمی تناظر میں اسلام کی صحیح ترجمانی کا فریضہ سرانجام دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

۴۔ ملت اسلامیہ کے اندرونی فقہی مذاہب اور مسالک کی تاریخ اور جدوجہد کے ادوار سے واقفیت بھی ایک عالم دین کے لیے ناگزیر ہے، لیکن مناظرانہ انداز میں نہیں بلکہ تعارف اور بریفنگ کے انداز میں تاکہ اصل تقابلی تناظر سامنے رہے اور اپنے فقہی مذہب اور مسلک کی خدمت کرتے ہوئے بھی شعور و ادراک کے ساتھ ایک عالم دین کا رشتہ استوار رہے۔

۵۔ دینی مدارس میں اس وقت مختلف علوم و فنون میں جو کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں، وہ بہت مفید اور ضروری ہیں لیکن ان کتابوں کے لکھے جانے کے بعد کی صدیوں میں علوم و فنون میں جو نئی تحقیقات ہوئی ہیں اور ہر علم میں نئے نئے شعبوں اور ابواب کا اضافہ ہوا ہے، ان سے علماء کرام کو لاتعلق رکھنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ انہی علوم و فنون میں نئی لکھی جانے والی کتابوں کا انتخاب کیا جائے اور انہیں بھی شامل نصاب کیا جائے۔

۶۔ ہمارے ہاں درس نظامی میں عام طور پر کتاب کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے طالب علم

میں استعداد تو پیدا ہوتی ہے اور اس کی مطالعہ و استنباط کی صلاحیت میں اضافہ بھی ہوتا ہے، لیکن اس کی نظر متعلقہ علم و فن کے وسیع تر تناظر اور افق کے بجائے کتاب کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جبکہ علم و فن کے تمام پہلوؤں سے اس کی شناسائی نہیں ہوتی، اس لیے طریق تدریس میں اتنی تبدیلی ضروری ہے کہ کسی علم یا فن کی ضروری کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس علم و فن کے تعارف، تاریخ، ضروری مباحث اور جدید معلومات پر محاضرات کا بھی اہتمام کیا جائے تاکہ طلبہ اپنے اساتذہ کے علوم و مطالعہ سے زیادہ بہتر انداز میں فیضیاب ہو سکیں اور علوم و فنون کی فطری پیشرفت کے ساتھ بھی ان کا تعلق قائم رہے۔

۷۔ ہمارے ہاں نظری، فقہی اور فروعی مباحث میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کے احترام اور برداشت کا معاملہ خاصا ناگفتہ بہ ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ خالصتاً فروعی حتیٰ کہ اولیٰ و غیر اولیٰ کے جزوی اختلافات بھی بحث و مباحثہ میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ کفر و اسلام میں معرکہ آرائی کا تاثر ابھرنے لگتا ہے۔ یہ صورت حال بہت زیادہ توجہ کی طالب ہے اور دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کو اس سلسلہ میں سنجیدہ اقدامات کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔

۸۔ ہمارے ہاں درس نظامی میں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظام و نصاب موجود نہیں ہے حالانکہ تمام نظام ہائے تعلیم میں اس کی ضرورت و افادیت مسلم ہے مگر درس نظامی کے مدارس میں عملاً یہ ہوتا ہے کہ اچھی استعداد اور ذوق رکھنے والا فاضل کسی نہ کسی مدرسہ میں تدریس کی جگہ حاصل کر لیتا ہے مگر اس کے بعد طلبہ کی ذہن سازی، تربیت اور ان کی فکری ترجیحات کے تعین میں وہ کسی اصول، ضابطہ و قانون اور متعیّن اہداف کا پابند نہیں ہوتا بلکہ یہ معاملات خالصتاً اس کے ذاتی ذوق اور رجحان پر منحصر ہوتے ہیں جس کے اثرات لازماً طلبہ پر بھی پڑتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی سطح پر اساتذہ کی تربیت کے کورس طے کیے جائیں اور بتدریج اس سلسلہ کو اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ کسی مدرسہ میں تدریس کا منصب حاصل کرنے کے لیے یہ کورس شرط سمجھا

جانے لگے۔

۹۔ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ آج کے دور میں یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی نظام حیات کو ایک مستقل مضمون اور باضابطہ نصاب کے طور پر پڑھایا جائے اور اسلامی احکام و قوانین پر فکر جدید کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات و شکوک کو سامنے رکھتے ہوئے طلبہ کو شعوری طور پر اسلامی نظام کی ترجمانی اور نفاذ کے لیے تیار کیا جائے۔

۱۰۔ ابلاغ عامہ کے تمام میسر ذرائع مثلاً پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا اور کمپیوٹر وغیرہ کے ساتھ دینی مدارس کے طلبہ و فضلاء کی اس درجہ کی شناسائی اور مہارت ضروری ہے کہ وہ ان کے استعمال کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں اور ان ذرائع سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والے کام کی نوعیت اور دائرۂ کار کا ادراک کرتے ہوئے اس کے توڑ کے لیے کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کر سکیں۔

۱۱۔ درس نظامی کے نصاب کی اس انداز میں درجہ بندی ہونی چاہیے کہ تمام طلبہ کے لیے قرآن و حدیث، فقہ اور عربی گریمر کی یکساں ضرورت کی ایک حد متعیّن کر کے اس کے بعد طلبہ کی جداگانہ صلاحیتوں اور ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے مختلف علوم و فنون میں گروپ بندی کا اہتمام کیا جائے تاکہ ہر طالب علم اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق تعلیمی میدان میں آگے بڑھ سکے۔

۱۲۔ دینی مدارس کو اپنے اردگرد رہنے والے عام شہریوں بالخصوص اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لیے بھی مناسب اوقات میں مختصر کورسز کا اہتمام کرنا چاہیے جن کے ذریعے سے وہ ضروری عربی گریمر کے ساتھ قرآن کریم کا ترجمہ اور ضروریات زندگی کے حوالہ سے حدیث و فقہ کا منتخب نصاب پڑھ سکیں۔

۱۳۔ دینی مدارس کے وفاقوں یا بڑے دینی مدارس کی سطح پر باصلاحیت اور ذہین فضلائے درس نظامی کے لیے تخصص کے ایسے کورسز کا اہتمام ضروری ہے جس کے ذریعے سے انہیں مروجہ بین الاقوامی زبانوں مثلاً عربی، انگلش، فرنچ اور فارسی وغیرہ میں تحریر و گفتگو کی

مہارت حاصل ہو، موجودہ عالمی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں اسلام کی دعوت، ترجمانی اور دفاع کے لیے تیار کیا جائے اور ان میں بریفنگ، لابنگ اور دفتری کام کی جدید ترین تکنیک کو سمجھنے اور اسے استعمال کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا ہو۔

۱۴۔ طلبہ میں تحریر و تقریر اور مطالعہ و تحقیق کا ذوق پیدا کرنے کے لیے وفاقوں اور مدارس کی سطح پر خطابت اور مضمون نویسی کے انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا جائے۔

یہ تو ان ضروریات اور تقاضوں کی ایک سرسری فہرست ہے جو مروجہ حالات میں دینی مدارس کے روایتی کردار کو زیادہ مؤثر بنانے اور انہیں اپنے پہلے سے طے شدہ اہداف و مقاصد سے قریب تر کرنے کے لیے ضروری سمجھے جا رہے ہیں، لیکن اس کے لیے دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کے ارباب حل و عقد کو آمادہ کرنے کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کیا جائے؟ اس ضمن میں چند عملی تجاویز پیش کر رہا ہوں:

- دینی مدارس کے نظام و نصاب میں ریاستی اداروں کی مداخلت کے امکانات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے دینی مدارس کے آزادانہ کردار اور انتظامی و مالیاتی خود مختاری کے تحفظ کی جدوجہد میں ان کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار کیا جائے۔
- دینی مدارس کے منتظمین کو یقین اور اعتماد دلایا جائے کہ اصلاح احوال کی یہ تجاویز ان کے بنیادی مقاصد و اہداف کا رخ تبدیل کرنے اور ان کے تحفظات کو مجروح کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان کے پہلے سے چلے آنے والے متعیّنہ مقاصد کے لیے ان کے کردار کو مزید مؤثر بنانے کی غرض سے پیش کی جا رہی ہیں۔
- مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے سرکردہ اصحاب علم و دانش کی ایک کمیٹی قائم کی جائے جو دینی مدارس کے مختلف وفاقوں کے ذمہ دار حضرات سے رابطہ قائم کر کے ان سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کرے۔
- مختلف شہروں میں اس مقصد کے لیے خالص علمی اور فکری انداز میں مجالس مذاکرہ کا انعقاد عمل میں لایا جائے جن میں دینی مدارس کے سینئر اساتذہ کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی جائے۔
- مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاقوں کی جداگانہ حیثیت کا احترام کرتے

ہوئے ان کے مابین رابطہ کار کے لیے ایک مشترکہ وفاق یا کم از کم مشاورتی بورڈ کے باضابطہ قیام کی کوشش کی جائے۔

- بڑے دینی مدارس اور وفاقوں سے گزارش کی جائے کہ وہ دینی مدارس ہی کے پرانے اور تجربہ کار اساتذہ کے مذاکروں کا اہتمام کریں اور اپنے مدارس کے نظام و نصاب کو مزید بہتر بنانے کے لیے ان سے تجاویز لے کر ان کی روشنی میں اپنی ترجیحات اور طریق کار پر نظر ثانی کا اہتمام کریں۔

مجھے امید ہے کہ اگر اس انداز سے سنجیدگی کے ساتھ کام کا آغاز ہو جائے تو ہم دینی مدارس کو ریاستی اداروں کی مداخلت کے خطرات اور بنیادی مقاصد سے انحراف کے خدشات سے محفوظ رکھتے ہوئے انہیں ان ضروری اصلاحات و ترامیم کے لیے تیار کر سکیں گے جو تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے عالمی حالات میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے مفاد کے لیے دینی مدارس کے نظام و نصاب کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ناگزیر ہو چکے ہیں۔

میں آپ سب حضرات کی طویل سمع خراشی پر معذرت خواہ ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ان امور پر آپ جیسے ارباب علم و دانش کی گراں قدر آرا و تجاویز دینی مدارس کے مقاصد، مستقبل اور پہلے سے زیادہ مؤثر کردار کے لیے یقیناً مفید اور بار آور ثابت ہوں گی۔

(ماہنامہ الشریعہ، یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

دینی مدارس میں تحقیق و تصنیف کی صورت حال

[۲۱ جولائی ۲۰۰۴ء کو شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ''دینی مدارس میں تحقیق وصحافت'' کے موضوع پر جناب ڈاکٹر رفیق احمد کی زیر صدارت منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔]

بعد الحمد والصلوٰۃ۔

''عصر حاضر میں دینی مدارس کے طریق تحقیق و تالیف کا تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان پر گفتگو سے قبل معاشرے میں دینی مدارس کے دائرۂ کار، اہداف اور طرز عمل کے بارے میں مجموعی صورت حال پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ اسے سامنے رکھ کر ہی ہم دینی مدارس کے ''طریق تحقیق و تالیف'' کا بہتر انداز میں جائزہ لے سکیں گے۔

دینی مدارس کا موجودہ نظام دور غلامی کی پیداوار ہے۔ جب جنوبی ایشیا میں برطانوی استعمار نے تسلط جما کر صدیوں سے چلے آنے والے سیاسی، معاشی، عسکری، تعلیمی، دفتری اور قانونی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور معاشرتی و ثقافتی نظام کی بیخ کنی کے لیے پیشرفت کا آغاز کیا تو تعلیمی، دینی، ثقافتی اور فکری محاذ سے دلچسپی رکھنے والے چند مخلصین نے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کا فیصلہ کیا اور دینی تعلیم، اسلامی ثقافت، مذہبی معاشرت اور مشرقی اقدار کے تحفظ کے لیے رضاکارانہ بنیاد پر دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کیا اور یہ ضرورت چونکہ ہمہ گیر اور ملی نوعیت کی تھی، اس لیے اس کار خیر کا سلسلہ پھیلتے پھیلتے جنوبی ایشیا کے طول و عرض تک وسعت پذیر ہو گیا۔

ان مدارس کی بنیاد تحفظات پر تھی اور ان کے اہم اہداف یہ تھے کہ مسلمانوں کا عقیدہ و ایمان سلامت رہے، اسلامی معاشرتی اقدار کے ساتھ ان کا تعلق قائم رہے، قرآن و سنت اور دیگر متعلقہ علوم کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ قائم رہے، مساجد و مکاتب آباد رہیں اور انہیں امامت و خطابت،

تدریس و افتاء اور دعوت و اصلاح کے ضروری کاموں کے لیے رجال کار فراہم ہوتے رہیں اور اسلامی عقائد و تہذیب کے خلاف سامنے آنے والی کوششوں کا مقابلہ ہوتا رہے۔ دینی مدارس کی اب تک کی جدوجہد تحفظات کے اسی دائرے میں مذکورہ بالا مقاصد کے گرد گھومتی ہے اور جن خطرات و خدشات اور مخالفانہ اقدامات و تحریکات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے تحفظ اور دفاع کے لیے یہ نظام قائم کیا گیا تھا، وہ تمام تر خدشات و خطرات اور مخالفانہ اقدامات و تحریکات چونکہ نہ صرف بدستور موجود ہیں بلکہ ان کی گیرائی، گہرائی اور اثراندازی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے، اس لیے مدارس دینیہ کے اہل حل و عقد ابھی تک تحفظ و دفاع کے ماحول میں ہیں اور وہ اپنے گرد خود اپنے کھینچے ہوئے دفاعی اور تحفظاتی حصار کے دائرے کو کراس کرنے کا ''رسک'' نہیں لے رہے اور بادی النظر میں ان کی یہ حکمت عملی معروضی حالات کے تقاضوں سے کافی حد تک ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

اس پس منظر میں دینی مدارس میں آج کے دور میں ہونے والے تحقیقی اور تصنیفی کام کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے:

مثبت پہلو

- روز مرہ پیش آنے والے مسائل پر عوام کی راہ نمائی کے لیے فتویٰ نویسی کا کام تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور سینکڑوں مدارس میں مستقل طور پر دارالافتاء قائم ہیں جن سے لاکھوں مسلمان رجوع کرتے ہیں اور متعلقہ مسائل میں راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔
- اردو اور دیگر زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم اور تفاسیر، احادیث نبویہ اور فقہ کی مختلف کتابوں کی شروح لکھی جا رہی ہیں اور مختلف مکاتب فکر کی طرف سے سینکڑوں ضخیم کتابیں اس سلسلے میں سامنے آ چکی ہیں۔
- عقائد، عبادات، اخلاقیات، معاملات، معاشرت اور دیگر ضروریات پر دینی مدارس کے اساتذہ اور متعلقین کی تصانیف کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد کو ہزاروں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔
- دینی مدارس کی طرف سے دینی، اصلاحی اور تحقیقی جرائد کی اشاعت کی روایت شروع سے قائم ہے اور جنوبی ایشیا کے مجموعی ماحول کو سامنے رکھ کر دینی مدارس کے جرائد کی تعداد کا اندازہ کیا

جائے تو وہ یقیناً سینکڑوں سے متجاوز ہو گی۔ ان جرائد میں اپنے اپنے مسلک اور مکاتب فکر کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ عام طور پر پیش آمدہ مسائل میں مسلمانوں کی راہ نمائی، تاریخی واقعات، بزرگان اسلام کا تعارف، جدید مسائل پر بحث اور فقہی مذاہب اور فکری مکاتب فکر کے مابین مناظرانہ اور مجادلانہ بحث و تمحیص کا سلسلہ بھی موجود ہوتا ہے۔

- کچھ عرصہ سے جدید فکری و علمی مسائل پر اجتماعی بحث و تمحیص اور تحقیق و مطالعہ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ دیوبندی مکتب فکر میں اس وقت بھارت میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی قائم کردہ فقہ اکیڈمی، دار العلوم کراچی کے تحقیقاتی علمی کام اور المرکز الاسلامی بنوں کی علمی مجالس، بریلوی مکتب فکر میں دار العلوم امجدیہ کراچی، جامعہ غوثیہ بھیرہ اور جامعہ نعیمیہ لاہور، جماعت اسلامی کے مرکز علوم اسلامیہ منصورہ لاہور جبکہ اہل حدیث مکتب فکر میں مجلس التحقیق الاسلامی ماڈل ٹاؤن لاہور کی علمی مساعی کو اس سلسلے میں ایک اہم پیشرفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ شیعہ مکتب فکر کا بھی اس جگہ مجھے ذکر کرنا چاہیے لیکن ان کے مدارس کے کام سے زیادہ واقف نہ ہونے کی وجہ سے سردست ایسا نہیں کر پا رہا۔
- قومی اخبارات میں مختلف مسائل کے حوالے سے دینی مدارس کے اساتذہ اور متعلقین کے مضامین کی اشاعت کا رجحان ترقی پذیر ہے اور اردو اخبارات میں شائع ہونے والے دینی مدارس کے متعلقین کے مضامین کا تناسب اگرچہ ضرورت سے بہت کم مگر پہلے سے بہتر ہے۔
- مختلف دینی مدارس میں تخصصات کے شعبے قائم ہیں جن میں درس نظامی کے فضلاء کو متعیّن عنوانات پر مطالعہ کرایا جاتا ہے، تحقیق و تالیف کی تربیت دی جاتی ہے، ان سے مقالات لکھوائے جاتے ہیں اور ان کی تحقیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
- دینی مدارس کے سینکڑوں فضلاء نے اب تک ملک اور بیرون ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات تحریر کیے ہیں جو اگرچہ ان یونیورسٹیوں کے نظم کے تحت اور ان کی نگرانی میں لکھے گئے ہیں لیکن ان کی اصل اساس دینی مدارس کی تعلیم و تربیت پر ہی ہے۔

- دینی مدارس سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے مکاتیب اور خطوط بھی ہزاروں لوگوں کی تعلیم و تربیت اور فکری و روحانی اصلاح کا ذریعہ بنے ہیں اور بیسیوں شخصیات کے مکاتیب و خطوط اب تک کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔
- بعض بڑے مدارس نے انٹرنیٹ کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اپنی ویب سائٹس قائم کر رکھی ہیں جن کی تعداد بیسیوں میں ہے اور وہ اپنے اپنے دائرے میں محدود سطح پر ہی سہی مگر مصروف کار ہیں۔ ان ویب سائٹس کے ذریعے سے جامعات کا تعارف کرایا جاتا ہے، اپنے اپنے مسلک کی ترجمانی کی جاتی ہے، اور اس کے ساتھ پیش آمدہ مسائل پر عوام کی راہ نمائی کے لیے خطبات و تقاریر، مضامین و مقالات اور سوالات کے جوابات کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔

یہ تو وہ چند پہلو ہیں جنھیں تحقیق و تالیف کے میدان میں دینی مدارس کی مثبت کارکردگی کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور جو کسی حد تک یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ دینی مدارس تحقیق و تالیف کے تقاضوں اور اہمیت سے بالکل غافل نہیں ہیں بلکہ اپنے اپنے ذوق، ماحول، فکری دائرے اور تربیتی پس منظر کے مطابق اس شعبہ میں بھی بہرحال مصروف عمل ہیں۔

منفی پہلو

اب ہم تصویر کے دوسرے رخ کی طرف آتے ہیں جسے تحقیق و تالیف کے میدان میں دینی مدارس کی کارکردگی کے منفی پہلو سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

- دینی مدارس میں تحقیق و مطالعہ کے حوالے سے مسلکی وابستگی اور شخصی عقیدت کو ترجیحات میں فیصلہ کن اولیت حاصل ہے، زیادہ تر وقت اور زور انھی دو ترجیحات میں صرف ہو جاتا ہے اور ترجیحات کے ان کے بعد کے مراحل کے لیے اکثر اوقات وقت اور صلاحیت، دونوں میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔
- فقہی اور مسلکی مباحث کے حوالے سے باہمی مناظرہ و مباحثہ میں افہام و تفہیم اور تطبیق و مفاہمت کے بجائے ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کا ذوق غالب ہوتا ہے اور اس کے لیے طعن و تشنیع اور تحقیر و تمسخر کی زبان استعمال کرنے سے بھی بسا اوقات گریز نہیں کیا

جاتا۔

- تحقیق و مطالعہ کا جدید اسلوب، طریق کار، ذرائع اور بین الاقوامی سطح کے علمی و تحقیقی اداروں کے کام اور طرز سے استفادہ دینی مدارس کے نزدیک ابھی تک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ صرف بین الاقوامی زبانوں سے ناواقفیت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بھی اس کا باعث ہے کہ ہمیں دنیا کے دیگر تمام حلقوں پر علمی اور فکری برتری حاصل ہے اور ہمیں کسی دوسرے حلقہ کے علمی کام سے واقف ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
- دینی مدارس میں عالم اسلام کے علمی حلقوں کی تحقیقات، دوسرے مسالک کے علمی کام اور غیر روایتی علمی مراکز کی تحقیقی مساعی سے استفادہ کو اپنی نفسیاتی برتری کے منافی تصور کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بعد اور فاصلہ قائم رکھنے کو بھی تحفظاتی حکمت عملی کا ایک ناگزیر حصہ بنا لیا گیا ہے۔
- بڑے مدارس کو دیکھتے ہوئے بھیڑ چال کے معاشرتی مزاج کے باعث اب جگہ جگہ دارالافتاء قائم ہو رہے ہیں اور ان کا دائرہ ضرورت سے زیادہ پھیلتا جا رہا ہے جس سے فتویٰ کی اہمیت اور معیار، دونوں متاثر ہو رہے ہیں۔
- اجتماعی اور قومی مسائل میں بھی تحقیق و مطالعہ اور علمی رائے کے اظہار کے لیے مسلکی دائرے میں پابند رہنے کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور ایسی روایت ابھی جڑ نہیں پکڑ سکی کہ کسی اہم قومی مسئلہ پر مختلف مکاتب فکر کے ذمہ دار علماء کرام مل بیٹھیں، مشترکہ طور پر مطالعہ و تحقیق کا اہتمام کریں اور باہمی مشاورت کے ساتھ اجتماعی رائے کا اظہار کریں۔ اس سلسلے میں ۳۱ علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات اور عقیدۂ ختم نبوت و ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناگزیر تقاضوں پر اتفاق کے سوا غیر سرکاری اور پرائیویٹ سطح پر کوئی اہم کام گزشتہ نصف صدی کے دوران میں ہماری دینی تاریخ کا حصہ نہیں بن سکا۔
- دینی مدارس میں تحقیق و تالیف کے ذوق اور صلاحیت کی آبیاری کے لیے کوئی اجتماعی اور اداراتی نظم موجود نہیں ہے۔ یہ کام زیادہ تر شخصی رجحان اور ذوق کا رہین منت ہوتا ہے اور

اس کی حوصلہ افزائی، سرپرستی اور نگرانی بھی شخصی طور پر ہی ہوتی ہے۔

- دینی مدارس میں لائبریریوں کا نظام ناگفتہ بہ ہے۔ گنتی کے چند مدارس کے علاوہ اکثر مدارس میں یا تو لائبریریاں موجود نہیں ہیں، اور اگر موجود ہیں تو ان میں ضرورت کی اہم کتابیں، بالخصوص مختلف موضوعات پر حوالہ کی کتابیں میسر نہیں ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں شخصی اور مسلکی ذوق کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر کسی مدرسہ کی لائبریری میں کچھ کتابیں پائی جاتی ہیں تو ضرورت، وقت اور سہولت کے مطابق اساتذہ وطلبہ کی ان تک رسائی نہیں ہوتی۔
- انسانی سوسائٹی کا معاشرتی ارتقا، تاریخ، نفسیات، پبلک ڈیلنگ، سیاسیات، معاشیات، تہذیب وثقافت اور دیگر عمرانی علوم نہ صرف دینی مدارس کی تدریس، تحقیق اور مطالعہ سے خارج ہیں بلکہ ان کی اہمیت وضرورت کا احساس بھی ابھی تک اجاگر نہیں ہو سکا جبکہ خود دینی مدارس کے مقصد قیام اور ان کے مذکورہ بالا اہداف کے حوالے سے یہ علوم انتہائی ضروری ہیں۔
- زبانوں کا مسئلہ دینی مدارس میں سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے۔ انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں کی بات تو رہی ایک طرف، عربی زبان بھی صرف کتاب فہمی تک محدود رہتی ہے اور دینی مدارس میں سالہا سال تک پڑھائی جانے والی اس زبان میں فی البدیہہ گفتگو، خطاب اور مضمون نویسی کی صلاحیت سے فضلاء کی غالب اکثریت محروم ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ مظلومیت کا سامنا اردو کو کرنا پڑتا ہے کہ وہ بطور زبان نہیں پڑھائی جاتی اور زبان کی اصلاح، جدید اسلوب سے شناسائی، محاوروں، ضرب الامثال اور اشعار کے برمحل استعمال کی تربیت اور سلاست وشستگی کا ذوق بیدار کرنے کا کوئی نظم اور اہتمام موجود نہیں ہے۔ بالخصوص مروجہ صحافتی زبان اور اسلوب تو سرے سے دینی مدارس کے ماحول میں اجنبی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھی خاصی علمی صلاحیت رکھنے والے اساتذہ اور طلبہ بھی سادہ اردو میں ما فی الضمیر کے اظہار کے لیے دو تین صفحات کا مختصر مضمون لکھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

اصلاح احوال کی تجاویز

اس وقت دینی مدارس میں ہونے والے تحقیقی اور تصنیفی کام کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا ایک

سرسری جائزہ لینے کے بعد اصلاح احوال کے لیے کچھ گزارشات پیش کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو ذہنی اور فکری برتری کے نفسیاتی ماحول کی ہے جس نے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے گرد رکاوٹوں کی بہت سی بلند وبالا دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ ہمیں اس ماحول سے نکلنا ہوگا اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارے سوا اور لوگ بھی اس دنیا میں رہتے ہیں اور وہ بھی عقل اور علم تک رسائی کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی رائے سے اختلاف ہمارا حق ہے لیکن ان کے وجود سے اختلاف کا ہمیں حق حاصل نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں دینی مدارس کو تین سطح کے علمی کاموں تک رسائی کو اپنے اہداف و مقاصد میں ضرور شامل کرنا چاہیے اور ان کے طریق کار سے استفادہ کرنا چاہیے:

۱۔ بین الاقوامی سطح پر وہ مسلم اور غیر مسلم علمی و تحقیقاتی ادارے جو دینی مدارس کی دلچسپی کے موضوعات پر کام کر رہے ہیں اور ان کی علمی کاوشیں مختلف حوالوں سے سامنے آ رہی ہیں۔

۲۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے علمی ادارے اور تحقیقاتی مراکز جو ان موضوعات پر کام میں مصروف ہیں۔

۳۔ دوسرے مسالک اور مکاتب فکر کی علمی تحقیقات اور مساعی جو جدید پیش آمدہ مسائل پر علمی جدوجہد کر رہے ہیں۔

دوسرے نمبر پر ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کے مختلف وفاقوں کو الگ الگ طور پر اور پھر مشترکہ فورم پر اجتماعی حیثیت سے بھی اس صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے اور خود احتسابی کے جذبہ کے ساتھ ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے مشترکہ حکمت عملی وضع کرنی چاہیے جن کے باعث آج ہمارے دینی مدارس علوم دینیہ میں گہرا رسوخ رکھنے کے باوجود تحقیقی و تصنیفی میدان میں معاصر اداروں سے بہت پیچھے دکھائی دے رہے ہیں۔

تیسرے نمبر پر ہماری گزارش اس حوالے سے ہے کہ دینی مدارس کی قیادت کو آج کے اس خوفناک چیلنج کا ادراک و احساس کرنا چاہیے جو عالمی تہذیبی کشمکش کے حوالے سے مسلم امہ کو درپیش ہے اور جس میں انسانی حقوق اور گلوبلائزیشن کے عنوان سے مسلمانوں کے عقائد و افکار، تہذیب و ثقافت،

خاندانی نظام، معاشرتی اقدار اور مسلم ممالک کے اسلامی تشخص کو پامال کر دینے کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہے۔ اس کشمکش کے علمی، اعتقادی اور ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کرنا، فکر و فلسفہ اور علم و تحقیق کے جدید ہتھیاروں کے ساتھ اس یلغار کا سامنا کرنا اور مسلمانوں کو اس سیلاب بلا سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے گرد تعلیم و تربیت، دعوت و اصلاح اور فکری بیداری کا حصار قائم کرنا اپنے اہداف و مقاصد کے حوالے سے دینی مدارس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور انہیں اس اہم ترین ذمہ داری سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔

(ماہنامہ الشریعہ، اگست ۲۰۰۴ء)

دینی مدارس کو درپیش داخلی و خارجی چیلنج

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی یونیورسٹی کے تعاون سے دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے ''دینی مدارس، شخصی اور ادارتی نشو ونما'' کے عنوان سے دس روزہ تربیتی پروگرام چل رہا ہے۔ اس کا آغاز ۱۱/مارچ کو ہوا اور ۲۰/مارچ تک جاری رہے گا۔ مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کے اساتذہ اس میں شریک ہیں اور ممتاز ارباب فکر و دانش انہیں اپنے تجربات اور افکار سے آگاہ کرر ہے ہیں۔ مجھے بھی اس میں اساتذہ کے سامنے کچھ گزارشات پیش کرنے کی دعوت دی گئی اور میں نے ۱۲/مارچ کو دو نشستوں میں ''دینی مدارس: درپیش چیلنج اور موزوں حکمت عملی'' اور ''دینی مدارس: روایت، تحقیق اور فن تحقیق'' کے عنوانات پر معروضات پیش کیں جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے:

دینی مدارس کو درپیش چیلنجوں پر گفتگو سے پہلے مدارس کے موجودہ معاشرتی کردار اور دائرہ کار پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی ہم ان چیلنجوں کا صحیح طور پر ادراک کر سکیں گے جو دینی مدارس کے اس موجودہ نظام اور نیٹ ورک کو درپیش ہیں۔ جنوبی ایشیا کے تناظر میں یہ دینی مدارس جداگانہ تشخص اور مکمل خود مختاری کے ساتھ ایک وسیع نیٹ ورک کی صورت میں گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے جو کردار ادا کر رہے ہیں، اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم کی حفاظت، ان کی تعلیم و تدریس کے تسلسل اور انہیں اگلی نسل تک صحیح حالت میں پہنچانے کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کا وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات یعنی قرآن کریم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ان مدارس کا بنیادی ہدف اور کردار ہے۔

۲۔ مسلم معاشرے میں مسجد اور مکتب کا ادارہ قائم رکھنے کے لیے یہ مدارس رجال کار فراہم کر رہے ہیں۔ کسی جگہ بھی مسجد کا نظام چلانے اور دینی تعلیم کا مکتب قائم کرنے کے لیے امام،

خطیب، مدرس، قاری، مؤذن اور مفتی حضرات کی درجہ بدرجہ ضرورت ہوتی ہے اور یہ افراد تعلیم یافتہ صورت میں ان مدارس سے ہی فراہم ہوتے ہیں۔ ان کے سواان افراد کی تیاری اور فراہمی کا کام کسی اور جگہ نہیں ہوتا۔

۳۔ یہ مدارس مسلمانوں کا نظریاتی اور ثقافتی حصار ہیں۔ عقیدے و ثقافت کے حوالے سے کہیں سے بھی حملہ ہواور اسلامی عقائداور ثقافت وروایات کے خلاف کسی جانب سے بھی آواز اٹھے، یہ مدارس اس کے مقابلے میں سدِ راہ بنتے اور دفاع میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

مدارس کا یہ کردار آج کے عالمی استعمار کو کھٹکتا ہے، اس لیے کہ مسلم معاشرے میں مغربی ثقافت کے نفوذاور استعماری تسلط کے استحکام میں مدارس کا یہ رول سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے ان مدارس کی کردارکشی اور ان کے کردار کو ختم کرنے، محدود کرنے یادیگر قومی شعبوں میں ضم کرکے تحلیل کردینے کی مسلسل کوشش ہوتی رہتی ہے۔

اس پس منظر میں دینی مدارس کوآج کے حالات میں درپیش چیلنجوں کا جائزہ لیاجائے توان کودو حصوں میں تقسیم کیاجاسکتاہے۔ ایک چیلنج وہ ہے جوانہیں خارج سے درپیش ہےاور وہ دوعملی صورتوں میں ہے۔ پہلے نمبرپر ان کے وجود کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کا مسئلہ ہے، اس لیے کہ عالمی اور ملکی سطح پر مقتدر طبقات ایک مدت سے اس تگ ودو میں ہیں کہ ان مدارس کا وجود اپنی موجودہ کیفیت کے ساتھ قائم نہ رہے۔ یاتوریاستی نظام کے دائرے میں لاکراجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے خوبصورت لیبل کے ساتھ انہیں ان کے جداگانہ دینی تعلیمی تشخص سے محروم کردیا جائےاوریاجدید علوم بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی کونصاب میں شامل کرنے کے بہانے خالص دینی تعلیم کے نصاب کوتحلیل کردیاجائے اور اس کے ساتھ ہی ان کا یہ آزادانہ کردار بھی باقی نہ رہنے دیا جائے کہ وہ اپنے تعلیمی نظام و نصاب کے تعین کے ساتھ ساتھ مالیاتی اور انتظامی طور پر بھی مکمل حیثیت سے خودمختار ہیں اور کسی کی مداخلت کوقبول کرنے کے لیے تیارنہیں۔

مدارس کے اس جداگانہ تشخص اور مالیاتی وانتظامی خودمختاری کے کچھ نقصانات بھی ہوں گے جن سے انکارنہیں کیاجاسکتا، لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے میں دینی مدارس کے

کردار کے جن تین پہلوؤں کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا ہے، اس کردار کے مؤثراور نفع بخش ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار ہے۔ اس سے محروم ہوکر دینی مدارس اپنا وہ کردار باقی نہیں رکھ سکیں گے جو گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے ان کا امتیاز چلا آرہا ہے۔

خارجی طور پر دینی مدارس کو درپیش دوسرا بڑا چیلنج عالمی میڈیا اور ذرائع ابلاغ ہیں۔ ان کی کردارکشی کی ایک پوری مہم ہے جو منظم اور مربوط طور پر چلائی جارہی ہے اور مدارس کی ایسی مکروہ تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے جو حقیقت کے منافی اور انتہائی نفرت انگیز ہے۔ انہیں قرون مظلمہ اور ظلم و تشدد کے اس تاریک دور کے پس منظر میں دنیا کے سامنے پیش کیا جارہا ہے جب یورپ میں بادشاہ اور جاگیردار کی حکمرانی تھی اور عام آدمی غلاموں سے بھی بدتر جانوروں جیسی زندگی بسر کررہا تھا۔ بادشاہ اور جاگیردار کے اس ظلم وجبر میں مذہبی ادارے اور شخصیات عام مظلوم لوگوں کا ساتھ دینے کے بجائے بادشاہ کے طرفدار اور جاگیردار کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے۔

عالمی میڈیا دینی مدارس کی غلط تصویر پیش کرکے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کررہا ہے کہ یہ دینی مدارس وہی تاریک دور واپس لانا چاہتے ہیں اور اس دور کی نمائندگی کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات قطعی طور پر غلط اور تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ اس حوالے سے میں مغرب والوں سے عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اگر مذہب سے دست بردار ہونا پڑا اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ قرون مظلمہ میں بادشاہ اور جاگیردار کے وحشیانہ مظالم میں مذہب ان کا ساتھی تھا اور سرکردہ مذہبی شخصیات ان ظالموں کی پشت پناہ تھیں، اسی طرح جب سائنس نے ارتقا اور پیشرفت کا آغاز کیا تو مذہب اس کے خلاف فریق بن گیا اور سائنس دانوں پر کفروالحاد کے فتوے جاری کرنے شروع کردیے۔ اس پس منظر میں مغرب کی مذہب سے دست برداری سمجھ میں آتی ہے، لیکن ہمارا پس منظر یہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تو مذہب اور مذہبی شخصیات نے جبروظلم کا ساتھ دینے کے بجائے ہمیشہ دلیل اور حق کا ساتھ دیا ہے اور اس حوالے سے علماء کرام کی قربانیوں، شہادتوں اور قیدوبند کی صعوبتوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمارے ہاں مذہب اور مذہبی اداروں نے سائنس کی راہ میں کبھی مزاحمت کی دیوار کھڑی نہیں کی، بلکہ یورپ کی موجودہ سائنسی ترقی اسی مسلم اسپین کے تعلیمی اداروں کی رہین منت ہے جس نے یورپ کو آزادی اور سائنسی ترقی وارتقا کا راستہ دکھایا، مگر خود میدان جنگ میں شکست کھاکر پیشرفت کی صلاحیت

سے محروم ہو گیا۔

اس پس منظر میں یہ ایک سنجیدہ علمی و فکری سوال ہے کہ یورپ اپنا فیصلہ ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے اور اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں اپنے روشن ماضی سے دست بردار ہونے پر مجبور کیوں کر رہا ہے؟

بہرحال دینی مدارس کو ایک چیلنج عالمی سطح پر یہ بھی درپیش ہے کہ انہیں عالمی میڈیا اور لابنگ کے ادارے یورپ کے قرون مظلمہ کے پس منظر میں ظلم اور جہالت کے نمائندے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح دینی مدارس کو اپنے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے امیج کو صحیح کرنے اور اپنی تصویر کو عالمی سطح پر بہتر بنانے کے چیلنج کا بھی سامنا ہے۔

یہ دو چیلنج وہ ہیں جو دینی مدارس کو خارج کی طرف سے درپیش ہیں۔ اب میں داخلی صورت حال کی طرف آنا چاہوں گا کہ اپنے داخلی نظام اور ترجیحات کے حوالے سے بھی دینی مدارس کے موجودہ نظام کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا ہے، لہٰذا ان کی طرف سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں اس بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام اور نیٹ ورک کے اصل اہداف جن کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے، تحفظاتی و دفاعی ہیں اور مدارس ابھی تک اسی دائرے میں محصور رہنے میں عافیت محسوس کر رہے ہیں، جبکہ عام مسلمان ان مدارس سے بہت سے ایسے کاموں کی توقع بھی کر رہے ہیں جن کا تعلق تحفظاتی اور دفاعی دائرے سے ہٹ کر اقدامی اور پیشرفت کے دائروں سے ہے اور اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے میں اس کی وجہ بتانا چاہوں گا۔

لوگ مدارس سے ان کے طے کردہ دائرے سے ہٹ کر مزید کاموں اور کارکردگی کا تقاضا آخر کیوں کر رہے ہیں؟ میرے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس نے اپنے ذمے جو کام لیا تھا، اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً مسجد کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے امام، خطیب، مدرس اور قاری و حفاظ حضرات کی تیاری اور فراہمی کی صورت حال دیکھ لیجیے۔ پورے جنوبی ایشیا میں کہیں بھی ایسی صورت نظر نہیں آئے گی کہ مسجد بن گئی ہے اور امام و خطیب نہیں مل رہے ہیں، مکتب قائم ہے مگر حافظ و قاری دستیاب نہیں، مدرسہ قائم ہوا ہے مگر مدرس اور مفتی تلاش کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ ایسا آپ کو کہیں بھی دکھائی نہیں دے گا، بلکہ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہم تو

اس معاملے میں بہت بڑے ایکسپورٹر ہیں اور دنیا بھر کو یہ مال سپلائی کر رہے ہیں۔ آپ دنیا کے کسی بھی براعظم میں چلے جائیں، آپ کو پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس سے تعلیم یافتہ حافظ، قاری، امام، خطیب اور مدرس ضرور ملیں گے، حتیٰ کہ عالم اسلام کے مرکز حرمین شریفین میں بھی آپ کو قرآن کریم پڑھانے والے قاری حضرات زیادہ تر پاکستانی مدارس کے تعلیم یافتہ ہی ملیں گے۔ اس مارکیٹ میں عالمی سطح پر ان دینی مدارس کو اگر اجارہ داری نہیں تو برتری ضرور حاصل ہے۔

دینی مدارس اپنی فیلڈ میں چونکہ پوری طرح کامیاب نظر آرہے ہیں، اس لیے زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ان سے ہی توقع کی جارہی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور جو کام انھوں نے اپنے اہداف میں شامل نہیں کر رکھے، انہیں بھی اپنے دائرہ کار میں لائیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی گھرانے کے دو چار نوجوانوں میں اگر ایک نوجوان کام کاج میں تیز ہو اور اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں مستعد ہو تو سارے کاموں کی توقع اسی سے وابستہ کر لی جاتی ہے، اور گھر والوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سارے کام وہی کرے۔ اسے "کاما پتر" سمجھا جاتا ہے اور گھر کے سارے افراد اسی سے اپنے کاموں کی بجا آوری کی خواہش رکھتے ہیں۔ مجھ سے بسا اوقات دوست پوچھتے ہیں کہ ہم سے ان کاموں کی توقع آخر کیوں کی جاتی ہے جو ہمارے پروگرام اور اہداف کا حصہ نہیں ہیں۔ میں ان سے عرض کیا کرتا ہوں کہ ہر گھر میں "کامے پتر" کا یہی حال ہوتا ہے اور ہمیں اس بات پر ناراض ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ یہ توقعات اور خواہشات دراصل دینی مدارس کی کارکردگی پر قوم کے اعتماد کا اظہار ہیں۔

مثلاً دینی مدارس سے بہت سے دوستوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کیوں نہیں دیتے، حالانکہ خود انہیں بھی معلوم ہے کہ یہ مضامین دینی مدارس کے اہداف کا حصہ نہیں ہیں، کیونکہ دینی مدارس کے اہداف متعیّن ہیں:

۱۔ دینی علوم کی حفاظت ہو اور وہ اصلی حالت میں اگلی نسل تک منتقل ہوں۔

۲۔ عام مسلمان کا قرآن و سنت اور دینی تعلیمات کے ساتھ رابطہ قائم رہے۔

۳۔ مسلمانوں کے عقائد اور ثقافت کا تحفظ ہو، اور

۴۔ مسجد و مکتب کا ادارہ باقی رکھنے کے لیے انہیں ضرورت کے مطابق تربیت یافتہ حضرات فراہم ہوتے رہیں۔

اس کے علاوہ دینی مدارس کے اہداف میں کوئی مقصد شامل نہیں ہے، جبکہ اپنے اہداف میں یہ مدارس بہرحال کامیاب ہیں، جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے الگ ادارے موجود ہیں، بجٹ موجود ہے، وسائل میسر ہیں اور رجال کار موجود ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کے بارے میں ان ذمہ دار اداروں سے باز پرس کرنے کے بجائے سارا غصہ دینی مدارس پر نکالا جاتا ہے اور سارے مطالبات ان کی طرف رخ کر کے کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے قیام اور اسے ایک اسلامی جمہوری ریاست قرار دیے جانے کے بعد عدلیہ، انتظامیہ اور دیگر شعبوں میں اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور رجال کار کی فراہمی اور تیاری اصولی طور پر ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے اور یہ ان کے کرنے کا کام ہے، لیکن چونکہ وہ یہ کام نہیں کر رہے، اس لیے توقعات بھی دینی مدارس سے وابستہ کر لی گئی ہیں اور ان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کام بھی وہی کریں۔

ان کاموں کی دینی مدارس سے توقع یا مطالبہ درست ہے یا نہیں، یہ ایک مستقل بحث ہے، لیکن ایک عوامی مطالبہ اور تقاضا اور بھی ہے جسے میں بھی درست سمجھتا ہوں اور دینی مدارس سے اسے اپنے اہداف میں شامل کرنے کے لیے کہتا رہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دینی مدارس اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں اور اپنی چار دیواری سے ہٹ کر ان لوگوں کی دینی تعلیم کی طرف بھی توجہ دیں جو ان کے چاروں طرف رہتے ہیں، مگر تعلیمی سہولتوں سے محروم ہیں۔ اب تو اس سلسلے میں صورت حال خاصی بہتر ہو رہی ہے، لیکن اب سے ربع صدی قبل کی بات ہے کہ گوجرانوالہ میں ایک مخیر دوست نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارے دینی مدارس میں طلبہ زیادہ تر کس علاقے کے ہوتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ پنجاب کے مغربی اور جنوبی اضلاع، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقوں سے ان کا تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ اساتذہ کن علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ اساتذہ بھی زیادہ تر انہی علاقوں کے ہوتے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ کیا ہمارا کام صرف چندہ دینا ہی ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ جس علاقہ میں مدرسہ موجود ہے، وہاں کے طلبہ کیوں نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو دینی مدارس میں تعلیم کے لیے نہیں بھیجتے۔ انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنے بچوں کو دین نہیں پڑھانا چاہتے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی پڑھانا چاہتے ہیں۔ آپ دینی تعلیم کے ساتھ اسکولوں کی تعلیم بھی شامل کر لیجیے، پھر دیکھیے کہ یہاں کے

لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے کیسے دینی مدارس میں نہیں بھیجتے۔ ان کی یہ بات درست تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں دینی مدارس نے اپنے نصاب میں عصری تعلیم کے ضروری حصے شامل کرنا شروع کیے ہیں، دینی مدارس میں مقامی طلبہ کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے اور اب کہیں بھی یہ صورت حال نہیں ہے کہ پڑھنے والے دوسرے علاقوں کے ہیں، پڑھانے والے دوسرے علاقوں کے ہیں، اور مقامی لوگوں کا کام صرف چندہ دے کر ثواب حاصل کرنا ہے۔

اس مثبت پیشرفت کے ساتھ میں اس بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس کو منظم طریقے سے اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان کے تعلیمی نظام کے ساتھ جو لوگ منسلک ہیں، ان کا باقی آبادی کے حوالہ سے کیا تناسب ہے؟ اور ان کا اس تناسب میں آبادی کا جو حصہ دینی مدارس کے ساتھ منسلک و متعلق نہیں ہے، اسے اس دائرے میں لانے کے لیے دینی مدارس کیا کر سکتے ہیں؟ ہر شخص کو عالم بنانا ضروری نہیں ہے، لیکن عام آبادی کے لیے کسی نہ کسی درجے میں دینی تعلیم کا کوئی نہ کوئی نظام دینی مدارس کو ضرور بنانا چاہیے اور جو آبادی ان سے منسلک نہیں ہے، اسے نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ یہ بات ان کی تعلیمی پیشرفت کے ساتھ ساتھ ان کی قوت کا ذریعہ بھی ہوگی۔

داخلی نصاب و نظام کے حوالے سے دینی مدارس کو ایک اور چیلنج بھی درپیش ہے، یعنی اسلامی ثقافت و اقدار کا تحفظ ان کے اہداف میں شامل ہے، لیکن جس مغربی ثقافت اور فلسفے سے اسلامی اقدار و ثقافت کو خطرہ درپیش ہے، اس سے واقفیت کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی۔ مغربی فکر و فلسفہ کیا ہے؟ اور مغربی ثقافت و اقدار کا پس منظر کیا ہے؟ اس سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی غالب اکثریت ناواقف ہے۔ یہ ایک افسوس ناک صورت حال ہے کہ جس دشمن سے ہم لڑ رہے ہیں، اس کی ماہیت، طریق کار، ہتھیاروں اور دائرہ کار سے ہمیں شناسائی تک حاصل نہیں ہے۔ مغربی فلسفہ و نظام اور ثقافت و اقدار کا ایک تاریخی پس منظر ہے، اس کی اعتقادی بنیادیں ہیں، اس کا ایک عملی کردار ہے اور اس کا وسیع دائرہ اثر ہے، مگر دینی مدارس کے نصاب میں اس سے آگاہی کا کوئی حصہ شامل نہیں ہے، حالانکہ ہمارے سامنے اسلاف کی یہ عظیم روایت موجود ہے کہ جب ہمارے معاشرے میں یونانی فلسفے نے فروغ حاصل کیا تھا اور ہمارے عقائد کے نظام کو متاثر کرنا شروع کیا تھا تو ہمارے اکابرین مثلاً امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام غزالی، امام ابن رشد اور امام ابن تیمیہ نے یونانی

فلسفے پر عبور بلکہ برتری حاصل کی تھی اور اسی زبان اور اصطلاحات میں یونانی فلسفے کے پیدا کردہ اعتراضات و شبہات کا جواب دے کر اسلامی عقائد کی حقانیت اور برتری ثابت کی تھی، ورنہ ایک دور میں یونانی فلسفہ ہمارے عقائد کے نظام میں اتھل پتھل کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب دکھائی دے رہا تھا۔ اس حوالے سے دینی مدارس سے بجاطور پر یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ مغربی فکر و فلسفے کو بطور فن اپنے نصاب کا حصہ بنائیں، اس کے ماہرین پیدا کریں اور اسی کی زبان و اصطلاحات میں شکوک و شبہات کے ازالے اور اسلامی عقائد و ثقافت کے تحفظ و دفاع کا اہتمام کریں۔

دینی مدارس کو درپیش ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ عالمی ماحول تو رہا ایک طرف، ہم عام طور پر اپنے اردگرد کے ماحول سے بھی باخبر نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں اب اردگرد کے ماحول اور عالمی ماحول میں فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے اور مزید مشکل ہو جائے گا۔ یہ معلومات کی وسعت کا دور ہے، ہر چیز سے باخبر رہنے کا دور ہے اور حالات پر نظر رکھنے کا دور ہے۔ اس ماحول میں دینی مدارس کو اپنے اس طرز عمل اور ترجیحات پر نظر ثانی کرنا ہوگی جو اپنے اساتذہ اور طلبہ کو بہت سے معاملات میں بے خبر رکھنے کے لیے ان کی پالیسی کا حصہ ہے۔ مثلاً:

- معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ انتہائی ضروری ہے، بالخصوص وہ چھ سات مذاہب جن کے پیروکار اس وقت دنیا میں وسیع دائرے میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مستقل ممالک اور حکومتیں قائم ہیں، مثلاً یہودی، عیسائی، ہندو، بدھ مت اور سکھ وغیرہ۔ ان کا تعارفی بلکہ اسلام کے ساتھ تقابلی مطالعہ دینی مدارس کے فضلاء کے لیے ضروری ہے۔
- مسلم امہ کا حصہ سمجھے جانے والے اعتقادی اور فقہی مذاہب مثلاً اہل سنت، اہل تشیع، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، سلفی، جعفری، زیدی وغیرہ کا تعارفی مطالعہ اور ان کے اصول اور تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی عصری مسلم فکری تحریکات، جو روایتی دائرے سے ہٹ کر ہیں، ان کے بارے میں ضروری معلومات سطحی اور نامکمل نہ ہوں بلکہ اصل ماخذ سے صحیح معلومات ہونی چاہئیں۔
- طب، سائنس، ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ وغیرہ کی عملی کارفرمائی سے بہت سے مسائل کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔ ان سے آگاہ ہوئے بغیر فتویٰ دینا یا مسئلہ بیان

کرنا شرعی اصولوں کے منافی ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ فن کو حاصل کرنا اور چیز ہے، اور اس کے بارے میں ضروری معلومات رکھنا اس سے مختلف امر ہے۔

- عالمی اور علاقائی زبانوں سے واقفیت اور ان پر عبور ایک مستقل مسئلہ ہے۔ دینی مدارس میں انگریزی کی تعلیم کا ایسا اہتمام کہ کوئی فاضل انگلش میں تقریر کر سکے یا معیاری مضمون لکھ سکے، سرے سے موجود نہیں ہے۔ ہماری عربی، کتاب فہمی تک محدود ہے اور سالہا سال کی تعلیم اور تدریس کے بعد بھی ہم عربی زبان میں اس سے زیادہ عبور حاصل نہیں کر پاتے کہ کتاب کو سمجھ لیں اور اس کو پڑھا سکیں۔ بول چال، فی البدیہہ تقریر اور مضمون نویسی کی صلاحیت حاصل کرنا ہمارے اہداف میں شامل نہیں ہے، بلکہ اپنی قومی زبان اردو میں بھی ہماری حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر فضلاء اچھی اردو نہیں بول سکتے اور نہ ہی اردو میں ڈھنگ کا کوئی مضمون تحریر کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا افسوس ناک خلا ہے جس نے ہمیں ابلاغ کے شعبے میں بالکل ناکارہ بنا رکھا ہے۔
- ابلاغ کے جدید ذرائع مثلاً کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویڈیو وغیرہ تک ہماری رسائی محل نظر ہے اور نہ صرف یہ کہ زبان اور ذرائع عام طور پر ہماری دسترس سے باہر ہیں، بلکہ اسلوب کے حوالے سے بھی ہم آج کے دور سے بہت پیچھے ہیں۔ ہماری زبان ثقیل اور اسلوب فتویٰ اور مناظرہ کا ہوتا ہے، جبکہ یہ تینوں باتیں اب متروک ہو چکی ہیں۔ آج کی زبان سادہ اور اسلوب لابنگ اور بریفنگ کا ہے، مگر ہم ان دونوں سے ناآشنا ہیں جس کی وجہ سے ہم خود اپنے معاشرہ اور ماحول میں ہی بسا اوقات اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں اور ابلاغ کی ذمہ داری پوری نہیں کر پاتے۔
- ہمارے ہاں عمرانی اور معاشرتی علوم کا ارتقا مسلم اسپین کے دور تک رہا ہے۔ اس کے بعد ایسی بریک لگی ہے جیسے ہمارے ہاں معاشرت اور عمرانیات کا ارتقا ہی رک گیا ہو۔ تب سے اس شعبہ میں ہم پر جمود طاری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اجتہادی کام کے علاوہ اس دوران میں کوئی پیشرفت دکھائی نہیں دیتی اور شاہ صاحبؒ کے بعد بھی تین صدیوں سے سناٹا طاری ہے۔ معاشرت کا ارتقا تو ظاہر ہے، رک نہیں سکتا مگر معاشرت و تہذیب کے حوالہ سے ہماری سوئی ابھی تک مسلم اسپین پر اٹکی ہوئی ہے اور ہم اس سے آگے بڑھتے نظر نہیں

آرہے ہے۔ اس جمود کو توڑے بغیر ہم معاشرت و تمدن اور ثقافت و عمرانیات کے بارے میں دنیا کی راہ نمائی کا مقام آخر پھر سے کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ مگر دینی مدارس میں عمرانی علوم کے حوالے سے کوئی اجتہادی کام اور علمی پیشرفت تو رہی ایک طرف، ان علوم تک ہمارے فضلاء اور اساتذہ کی رسائی بھی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

- دینی مدارس میں ہمارے اعتقادی اور فقہی مباحث اور اختلافات پر خوب کام ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ صرف ہوتا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں۔ بسا اوقات اولیٰ اور غیر اولیٰ کے مسائل اور فروعی اختلافات کفر و اسلام کے معرکے کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی اصولی اور بنیادی مسائل بھی نظر انداز ہونے لگ جاتے ہیں۔ اعتقادی مسائل اور فقہی اختلافات پر ضرور بات ہونی چاہیے اور طلبہ کو ان سے متعارف کرانا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات بھی ان کے سامنے واضح ہونی چاہیے اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ کون سی بات کفر و اسلام کی ہے اور کون سی بات اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہے، کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کسی مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔
- تحقیق کے حوالے سے ہمارے ہاں صرف تین شعبوں میں کام ہوتا ہے: (۱) اعتقادی و فقہی اختلافات پر خوب زور آزمائی ہوتی ہے، (۲) افتاء میں ضرورت کے مطابق تحقیق ہوتی ہے، (۳) دینی جرائد میں عام مسلمانوں تک اپنے اپنے ذوق کے مطابق دینی معلومات پہنچانے کے لیے تھوڑی بہت محنت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ امت کی اجتماعی ضروریات اور ملت اسلامیہ کے عالمی ماحول کی مناسبت سے کسی تحقیقی کام کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ کچھ افراد اپنے ذوق اور محنت سے ایسا ضرور کر رہے ہیں، لیکن بحیثیت ایک ادارہ اور نیٹ ورک کے دینی مدارس کے پروگرام میں یہ چیز شامل نہیں ہے۔
- معلومات کی وسعت، تنوع اور ثقاہت کا مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ کسی بھی مسئلہ پر بات

کرتے ہوئے ہم میں سے اکثر کی معلومات محدود، یک طرفہ اور سطحی ہوتی ہیں، الاّ یہ کہ کسی کا ذوق ذاتی محنت اور توجہ سے ترقی پا جائے اور وہ اس سطح سے بالا ہو کر کوئی کام کر دکھائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق، مطالعہ اور استدلال و استنباط کے فن کو ایک فن اور علم کے طور پر دینی مدارس میں پڑھایا جائے اور طلبہ کو اس کام کے لیے باقاعدہ طور پر تیار کیا جائے۔

- دینی مدارس کی لائبریریوں کا حال بھی ناگفتہ بہ ہے۔ گنتی کے چند بڑے مدارس کے استثنا کے ساتھ عمومی طور پر دینی مدارس کی لائبریریوں میں درسی کتابوں سے ہٹ کر جو کتابیں پائی جاتی ہیں، وہ کیف ما اتفق کے اصول پر کسی منصوبہ بندی اور ہدف کے بغیر ہوتی ہیں۔ ان تک طلبہ کی رسائی اور استفادہ کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض مدارس میں تو روزانہ اخبارات کا داخلہ بھی بند ہوتا ہے اور طلبہ پر پابندی ہوتی ہے کہ وہ اخبارات و جرائد کا مطالعہ نہیں کریں گے۔ خدا جانے اپنے طلبہ کو دنیا، اپنے ملک اور ارد گرد کے ماحول سے بے خبر رکھ کر یہ مدارس انہیں کون سے ماحول میں کام کرنے کی تربیت دے رہے ہوتے ہیں۔
- مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان مکالمہ کی ضرورت بھی دن بدن عالمی سطح پر بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی طرف بین الاقوامی حلقے متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مکالمہ کے اصل فریق کون ہیں اور مکالمہ کا ایجنڈا کیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر الگ سے گفتگو ہونی چاہیے، لیکن مذاہب کے درمیان مکالمہ جس انداز سے آگے بڑھ رہا ہے، اس سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کا بے خبر اور لاتعلق رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس مکالمہ کے پس منظر، ضرورت، دائرہ کار اور مضرت و منفعت سے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کا آگاہ ہونا ضروری ہے، بلکہ اس مکالمے کے تو اصل فریق ہی دینی مدارس ہیں اور انہیں اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔

یہ تو وہ مختلف پہلو ہیں جو دینی مدارس کے اس نظام کو خارجی اور داخلی طور پر چیلنج کے طور پر درپیش ہیں۔ اب آخر میں موزوں حکمت عملی کے حوالے سے چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں جن پر دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے:

۱۔ اپنے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے تحفظ کے لیے دینی مدارس کو باہمی اتحاد اور اشتراک وارتباط میں اضافہ کرنا ہوگا، کیونکہ دینی مدارس کے مختلف وفاق جس طرح اب اکٹھے ہیں، اسی طرح متحد رہے تو کسی کو ان کے جداگانہ تشخص اور آزادانہ کردار کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔

۲۔ اپنے امیج کو صحیح بنانے کے لیے انہیں عالمی میڈیا تک رسائی حاصل کرنا ہوگی اور اپنے موقف، خدمات اور عزائم سے دنیا کو باخبر کرنے کے لیے میڈیا اور لابنگ کے تمام ممکنہ ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔

۳۔ لوگوں کی توقعات، تجاویز، شکایات اور تقاضوں سے پوری طرح آگاہی حاصل کر کے ان پر باہمی بحث و مباحثہ اور مختلف درجات و مراحل میں ان کے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت ہے اور جن باتوں پر عمل ہو سکتا ہو، انہیں دائرۂ عمل میں لانے سے حتی الوسع گریز نہ کیا جائے۔

۴۔ متعلقہ ارباب علم و فن سے رابطہ اور مشاورت کا اہتمام کیا جائے اور ان کے تجربات اور آرا و افکار سے استفادہ کیا جائے۔

۵۔ رائے عامہ کو اعتماد میں لینا اور اعتماد میں رکھنا بھی ضروری ہے اس کے لیے قومی اخبارات اور ممتاز اصحاب قلم سے رابطہ اور ان کی بریفنگ کا اہتمام ضروری ہے۔

مجھے امید ہے کہ اگر دینی مدارس موجودہ عالمی تناظر میں اپنے کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں گے اور خود احتسابی کے جذبے سے اپنی ترجیحات، دائرۂ عمل اور طریق کار پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کریں گے تو ان چیلنجوں سے بخوبی نمٹ سکیں گے جن کا انہیں اس وقت سامنا ہے اور نئے حوصلے، اعتماد اور ولولے کے ساتھ مستقبل میں اپنے کردار کو زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کی راہ بھی ہموار کر پائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۷ تا ۱۹ / مارچ ۲۰۰۶ء)

فکری و مسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو

[۵/ دسمبر ۲۰۰۳ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں اساتذہ کے دو روزہ مشاورتی اجتماع کی چوتھی نشست سے خطاب]

بعد الحمد والصلوۃ۔

کل سے مختلف مسائل پر گفتگو چل رہی ہے۔ ہم نے صبح کی نشست میں نصاب اور اساتذہ کی تدریسی اور تربیتی مشکلات کے حوالے سے بات کی، جس کے نتیجے میں تفصیلی تجاویز سامنے آئی ہیں۔ اس نشست میں میری گفتگو کا عنوان ہے: "فکری و مسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو"۔ فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ جب ایک خاص نصاب کی تعلیم پا کر سوسائٹی میں جاتے ہیں اور انہیں آج کے مسائل اور حالات سے سابقہ پیش آتا ہے تو ان کی فکر اور سوچ کیا ہو؟ ان کا نصب العین اور زندگی کا مقصد کیا ہو؟ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی فکری نصب العین بن جاتا ہے جس کے ارد گرد اس کی زندگی کی ساری تگ و دو گھومتی ہے۔ طالب علمی کے دوران میں اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ترجیح قائم ہو جاتی ہے کہ میں نے تو یہ کام کرنا ہے، اور پھر وہ ساری زندگی اسی میں لگا رہتا ہے۔ یہ مرحلہ یعنی کسی طالب علم کی فکری تربیت کے رخ کا تعین، ہم نے اسے آزاد چھوڑا ہوا ہے اور طالب علم اپنی مرضی سے اس کا تعین کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق بھی اس بات سے ہے جو اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے ہماری مشاورت میں زیر غور آئی، یعنی چونکہ ہمارے ہاں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظم موجود نہیں، اس لیے ہوتا یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ میں سے جس استاذ کے ساتھ طالب علم زیادہ مانوس ہو جاتا ہے، تو جو ذہنی سوچ اس کی ہوتی ہے، وہی طالب علم کی بھی بن جاتی ہے۔ ایک مدرسے میں اساتذہ کے ذہنی رجحانات مختلف ہیں تو دو دو، چار چار طالب علم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح فکری تربیت تو ہوتی ہے لیکن یہ فکر کوئی اجتماعی فکر نہیں ہوتی۔ ہر طالب علم اپنے

ذوق کے مطابق کسی استاد کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ذہنی و فکری تربیت ہوتی ہے اور وہ اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ میں اس کو خون کے گروپ سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں خون کے مختلف گروپ کام کر رہے ہیں۔ سپاہ صحابہ کا خون گروپ ہے، جہادی خون گروپ ہے، جمعیت علمائے اسلام کا خون گروپ ہے۔ اسی طرح تبلیغی جماعت، اشاعت التوحید اور خدام اہل سنت کے خون گروپ موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ گروپ آپس میں ملتے ہیں اور کچھ نہیں ملتے۔ اور لطیفے کی بات یہ ہے کہ اتفاق سے میرا خون کا گروپ سب سے مل جاتا ہے۔ میرا خون سب کو لگ جاتا ہے اور سارے خون اس کو لگ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طالب علم کو مجموعی فکر ہم نے کیا دی ہے؟ میں وفاق والوں سے اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کریں تاکہ وہ طلبہ کا کوئی اجتماعی ذہن تو بنائیں اور انہیں کوئی بنیادی سوچ تو دیں۔ یہ تو انہیں بتائیں کہ ملک و ملت کے تقاضے کیا ہیں، عالمی صورت حال کے تقاضے کیا ہیں، اور آپ کے مسلک کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ انہیں کوئی اجتماعی سوچ دیں، اس کے ساتھ ساتھ ضمنی ترجیحات کا دائرہ بھی موجود رہے۔

آپ تقریباً اتفاق کریں گے کہ صورت حال ایسی ہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہے کہ اساتذہ، جنہوں نے سوچ دینی ہے اور فکری تربیت کرنی ہے، خود ان کی اپنی اجتماعی فکر کا کوئی اہتمام نہیں۔ عصری تعلیم میں ہر سطح کے اساتذہ کے لیے اس سطح کا تربیتی کورس کرنا ضروری ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی نظم نہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ فکری طور پر ہم خلفشار کا شکار ہیں۔ ہم پر مغرب کی فکری اور تہذیبی یلغار ہے۔ اس کی صحیح تعبیر وہ ہے جو ہمارے شیخ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے کی ہے کہ 'ردۃ ولا ابابکر لہا'۔ یہ فکری ارتداد کا زمانہ ہے۔ آپ ذرا محدود حلقے میں ہیں، اللہ آپ کے ایمان کو سلامت رکھے، لیکن اگر آپ جدید حلقے میں چلے جائیں، کسی کے ذہن کو ٹٹولیں تو احتراماً اور عقیدتاً یا فتوے کے ڈر سے تو وہ شاید کوئی بات نہ کہے لیکن جب آپ اس کی فکر کا تجزیہ کریں گے تو کہیں نہ کہیں ارتداد، ارتیاب اور شک کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہوگا۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ آج کی فکری ارتداد کی لہر سے متاثر ہوگا۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کشمکش کو سرے سے سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، ہمارے گرد حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے اور ہم بالکل ایک دائرے میں محصور ہوتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں نکاح وطلاق یا دوسرے مسائل کے بارے میں شریعت کے احکام کے بارے میں شک ہے۔ اس نے جدید لٹریچر پڑھا ہوا ہے۔ ہم اس کے شک اور اس کی وجہ کو سمجھ کر شک کا کانٹا نکالنے کے بجائے اس کے ساتھ طعنے اور فتوے کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے تو احتراماً خاموش ہو جاتا ہے لیکن اس کا شک پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے، اس لیے یہ جواب نہیں دے سکے اور مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ ہم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کو شک کیا ہوا ہے، اس لیے کہ خود ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے پس منظر میں کون سا فکری الجھاؤ کارفرما ہے۔

بات سمجھانے کے لیے ایک حوالہ دوں گا۔ میں ایک عرصے سے مدارس کے منتظمین سے گزارش کر رہا ہوں کہ آج کا بین الاقوامی قانون جو رائج الوقت ہے، جس کی بنیاد پر ہم پر اعتراضات ہوتے ہیں اور الزام لگایا جاتا ہے، وہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس کی تیس دفعات ہیں۔ ہم نے اس کو تسلیم کر رکھا ہے اور اس پر دستخط کر رکھے ہیں۔ اس وقت عالمی کشمکش میں ایک جھگڑا یہ ہے کہ مغربی اقوام کا موقف یہ ہے کہ جب آپ نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں، اس کے نظام میں شریک ہیں، اس سے فائدے اٹھاتے ہیں، یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے جس کے آپ رکن ہیں، آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ اس میں لکھی ہوئی باتوں کی اپنے دستور میں پابندی کریں گے، تو آپ اس کے خلاف اقدامات کیوں کر رہے ہیں؟ یہ موقف اس حوالے سے درست ہے کہ جب ہم نے باقاعدہ معاہدہ کر رکھا ہے تو یا تو اس پر عمل کریں یا اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے کہ اگر اس چارٹر کو اور اس کی ان تشریحات کو قبول کر لیا جائے جو اقوام متحدہ کے باضابطہ ادارے مثلاً جنیوا انسانی حقوق کمیشن، یونیسکو اور یونیسف وغیرہ کرتے ہیں، تو ہمیں احکام شرعیہ میں سے کم از کم ۸۰ فیصد سے دستبردار ہونا ہوگا۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو یقینی بنایا جائے اور جنس کی بنیاد پر کوئی امتیازی قانون نہ بنایا جائے۔ مرد اور عورت کے مابین تمام معاملات میں مساوات ضروری ہے۔ اب آپ اپنے قوانین کو

دیکھ لیں کہ مرد اور عورت کے لیے قوانین میں کہاں کہاں فرق نہیں ہے۔ نماز سے شروع ہو جائیں۔ عائلی قوانین کو دیکھ لیں۔ آپ مرد کو طلاق کا حق دیتے ہیں، عورت کو نہیں دیتے۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ وراثت میں آپ مرد کو حصہ زیادہ دیتے ہیں، عورت کو کم دیتے ہیں۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ شہادت میں آپ بعض معاملات میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کرتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ عورت کو آپ صدر اور وزیر اعظم بننے کا حق نہیں دیتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ اس طرح آپ کی فقہ میں بہت سے ایسے احکام نکلیں گے جہاں آپ امتیاز کے قانون پر عمل کر رہے ہیں جو کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے اور اس پر فوراً کہا جائے گا کہ آپ اس کو منسوخ کریں۔

ایک دوسری مثال لیں۔ عالمی قانون میں آزادی رائے اور تبدیلی مذہب کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ ہر شخص کو کوئی بھی مذہب چھوڑنے یا اختیار کرنے کا اور کسی بھی قسم کی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ لیکن ہم نے توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون نافذ کر رکھا ہے جو رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ ہم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے، ان کو مسجدیں نہیں بنانے دیتے، ان کو اسلامی اصطلاحات استعمال نہیں کرنے دیتے جو مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

یا مثلاً بین الاقوامی قانون میں غلامی کی تمام صورتیں ممنوع ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ غلامی اسلام کی مطلوبہ چیزوں میں سے نہیں، اس لیے بین الاقوامی معاہدے کے تحت یہ ممنوع سہی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب ممنوع ہے اور آپ مانتے ہیں کہ غلامی درست نہیں تو پھر پڑھاتے کیوں ہیں؟ تعلیمی نصاب سے خارج کیوں نہیں کرتے؟ قرآن پاک سے وہ آیات اور حدیث و فقہ سے وہ ابواب خارج کیوں نہیں کرتے؟

اسی طرح اس میں ایک دفعہ ہے کہ کوئی سزا ایسی نافذ نہیں کی جائے گی جس میں جسمانی تشدد یا ذہنی اذیت ہو یا جس میں توہین و تذلیل ہو۔ یعنی سزا کو تین چیزوں، جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین و تذلیل سے خالی ہونا چاہیے۔ اب آپ کی کون سی سزا اس سے خالی ہے؟ آپ کی ساری حدود میں تشدد ہے، ہاتھ پاؤں کاٹنا، سنگسار کرنا، کوڑے مارنا، کھلے بندوں سزا دینا ہے جس میں توہین اور تذلیل ہے۔ گویا حدود کا نظام لے لیں، خاندانی نظام لے لیں، وراثت کا نظام لے لیں، نکاح و طلاق کا مسئلہ لے لیں، ہمارا کوئی بھی مسئلہ نہیں بچتا جس پر اعتراض نہ ہو۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی ان تیس دفعات کو ہمارے ہاں نصاب میں پڑھایا جانا چاہیے، اس حوالے سے کہ آج کا مروجہ بین الاقوامی قانون کیا ہے، ہمارے قوانین کیا ہیں، ٹکراؤ کہاں ہے، ان کا موقف کیا ہے اور ہمارا موقف کیا ہے؟ ہمارے عالم دین کو پتہ تو ہونا چاہیے۔ جب کوئی اعتراض سامنے آئے تو وہ سمجھ تو سکے کہ اعتراض کیوں ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہم نے ان کی کون سی بات قبول کرنی ہے اور کون سی نہیں، لیکن کم از کم ہمارے علماء کو اس جھگڑے سے واقف تو ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں سرے سے اس کا کوئی پتہ نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بحث کو اپنے دائرے میں محدود رکھتے ہیں تو اپنے لوگوں کو تو مطمئن کر لیں گے لیکن جب بات جدید تعلیم یافتہ ماحول میں کریں گے تو ہماری بات سنی نہیں جائے گی کیونکہ ہماری بات ادھوری اور بے علمی پر مبنی ہوگی۔

تو فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علماء کو یہ پتہ ہو کہ آج کا عالمی ماحول کیا ہے، ہماری کشمکش کس سے ہے، لڑائی کس سے ہے، اس کے مقابلے میں ہم نے کیا تیاری کی ہے؟ اس انداز سے ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں، احادیث کا مطالعہ کریں۔ سارا ذخیرہ موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہر چیز موجود ہے، احادیث کے ذخیرے میں ہر بات کا جواب موجود ہے، البتہ فقہی کتابوں میں اس کی نئی تعبیرات کرنے کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ ہماری اپنی اس انداز سے مطالعہ کرنے کی تربیت نہیں ہے، اس لیے آج کی اس فکری کشمکش میں ہم مؤثر طور پر حصہ لینے اور کوئی عملی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی پہلے بات اساتذہ کی آئے گی۔ استاد کو پتہ ہوگا تو وہ شاگرد کو بتائے گا۔ اگر اسے خود پتہ نہیں ہوگا تو شاگردوں کو کیا بتائے گا؟ میں نے وفاق والوں سے گزارش کی تھی کہ آج کے مغربی فلسفہ، عالمی کشمکش اور تہذیبی جنگ پر اساتذہ کے لیے بریفنگ کورس کا اہتمام کریں اور نصاب میں بھی ایسی چیزیں شامل کریں، خواہ وہ محاضرات کی شکل میں ہوں یا کسی کتاب کی صورت میں۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر کام نہیں ہو رہا لیکن عرب دنیا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ اس میں سے اچھا مواد مل جائے گا۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ ہے مسلکی تربیت کا۔ ہمارا مسلک کیا ہے اور دیوبندیت کیا ہے؟ یہاں میں تھوڑی سی گستاخی کروں گا جس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میری عادت یہ ہے کہ جو بات سمجھ میں

آتی ہے، کہہ دیا کرتا ہوں۔ اگر ناراض نہ ہوں تو ایک کہاوت عرض کرتا ہوں۔ کہتے کہ چار پانچ نابینا کہیں اکٹھے ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ طے یہ ہوا کہ اس کا فیصلہ 'مشاہدہ' کرنے کے بعد کیا جائے۔ اب وہ گئے اور جا کر ہاتھی کو ٹٹولنے لگے۔ دیکھا تو تھا نہیں، تو کسی کے ہاتھ کان پر آ گئے، کسی کے سونڈ پر اور کسی کے سینگ پر۔ اب وہ تبصرہ کر رہے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ ایک نے کہا کہ ہاتھی لمبا سا ہڈی کا سینگ ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں وہ تو چھاج کی طرح لمبا اور چوڑا سا ہوتا ہے۔ تیسرے نے کہا کہ پانی کا ایک نل ہے جس کو ہاتھی کہتے ہیں۔ چوتھے نے کہا کہ چمڑے کے ایک بڑے سے ستون کو ہاتھی کہا جاتا ہے۔

ہمارا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہم میں سے جس شخص کو جس ماحول میں جس سے واسطہ پڑ جاتا ہے، ہماری دیوبندیت اسی تک محدود ہو جاتی ہے۔ ایک ماحول میں شیعہ سے واسطہ ہے تو دیوبندیت یہی ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ہماری دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ کہیں اہل حدیث سے سابقہ پیش آ جائے تو وہاں دیوبندیت صرف حنفیت کے دفاع میں محصور ہو جاتی ہے، باقی سارے تقاضے ختم ہو جاتے ہیں۔ کہیں بریلویوں سے لڑائی آ گئی ہے تو دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ میں ان مسائل سے انکار نہیں کر رہا۔ یہ تمام شعبے ہیں۔ مجھے نہ حنفیت کے دفاع کی اہمیت سے انکار ہے، نہ بریلویت کے مقابلے سے اور نہ انکار حدیث اور شیعہ کا جواب دینے سے، لیکن یہ تمام جزوی شعبے ہیں۔ ہم ان الگ الگ شعبوں کی بات تو کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اہل السنت والجماعت کا جو اجتماعی دھارا چلا آ رہا ہے، اس کی بات ہم میں سے کوئی نہیں کرتا۔

قیام دیوبند کا اصل مقصد کیا تھا؟ جب انگریز یہاں آیا تھا اور اس کے ہاتھوں دین مٹ رہا تھا تو کچھ اللہ والوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی کہ دین کو جس حد تک ممکن ہو، بچا لیا جائے۔ مجموعی دین کو، اس کے اجتماعی حصے کو اور سب شعبوں کو بھی۔ میرے نزدیک دیوبندیت تین چیزوں کا نام ہے۔ اگر دیوبندیت میں کسی کو معیار سمجھا جائے تو میرے نزدیک سب سے بڑا معیار شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ تینوں باتیں تھیں: علم بھی بدرجہ اتم، روحانیت بھی بدرجہ اتم، اور جہاد بھی بدرجہ اتم۔ گویا دیوبندیت یہ ہے کہ علم میں بھی کمال ہو، روحانیت میں بھی کمال ہو اور ملی غیرت اور جہاد کے جذبے میں بھی کمال ہو۔

دیوبندی مسلک کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ ہم عقائد کے لحاظ سے اہل سنت ہیں اور فقہی اعتبار سے حنفی ہیں۔ کوئی نیا تشخص ہم نے قائم نہیں کیا۔ ایک مدرسے کے ساتھ ہماری نسبت ہے، جس کے اجتماعی مقاصد کے حوالے سے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے ضمنی طور پر سارے کام کیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو لے لیں۔ کیا انہوں نے حنفیت کا دفاع نہیں کیا؟ ان کے اس پر رسالے موجود ہیں، لیکن اس حد تک جتنی ضرورت پڑی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے 'الشہاب الثاقب' لکھی، لیکن یہ کام ضرورت کی حد تک محدود رہا۔ ان کا اصل مقصد ملی وجود اور ملی مقاصد تھے۔ جہاں ضرورت پڑی، ضمنی اور فروعی مسائل سے بھی تعرض کیا، لیکن اس کے لیے اپنے آپ کو وقف نہیں کر دیا۔ میں بھی یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دیوبندیت سے مراد اگر ہم نے الگ الگ شعبے لے رکھے ہیں تو میں اس کو دیوبندیت نہیں سمجھتا۔ دیوبندیت نام ہے ملت کے اجتماعی دینی کام کا۔ جہاں کسی ضمنی کام کی ضرورت پڑتی ہے، وہاں وہ ضرور کیا جائے لیکن ہمارا اجتماعی اور مین دھارا یہ ہے کہ اس ملک میں، اس معاشرے میں دین کی اجتماعی حفاظت کی جائے اور نئی نسل تک دین صحیح حالت میں منتقل ہو۔ اجتماعی مقاصد اور ملی مقاصد کے حوالے سے ہم طلبہ کی تربیت کریں۔

ہمیں اس پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ فکری تربیت، ملکی مقاصد اور مسلک کے اصل اہداف کے حوالے سے ہمیں تھوڑا سا ماضی کی طرف پلٹ کر اپنے بزرگوں کو دیکھیں اور اس کے مطابق علمی کمال، روحانیت اور ملی غیرت و حمیت کی خصوصیات اپنے طلبہ میں پیدا کر کے اجتماعی مقاصد اور ضروریات کے لیے ان کو تیار کریں۔

باتیں تو میں اور بھی بہت سی کہنا چاہتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ان پر تفصیل سے بات ہوگی۔ اس وقت میں چاہوں گا کہ مولانا محمد بشیر صاحب سیالکوٹی آپ حضرات کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید اسلوب اور اس کی اہمیت کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری/فروری ۲۰۰۴ء)

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے

۱۴ر نومبر ۲۰۰۶ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ”دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے“ کے عنوان پر ایک روزہ ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف دینی مدارس اور کالجوں کے اساتذہ نے شرکت کی۔ پہلی نشست کی صدارت بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی، دوسری نشست مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض سواتی کی زیر صدارت منعقد ہوئی جبکہ تیسری نشست کے لیے راقم الحروف کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ ورکشاپ سے خطاب کرنے والوں میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبدالرؤف فاروقی، پاکستان شریعت کونسل صوبہ پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر، پروفیسر حافظ منیر احمد، پروفیسر محمد اکرم ورک، پروفیسر میاں انعام الرحمٰن اور دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے بطور مہمان خصوصی خطاب کیا، جبکہ الشریعہ اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف نے گزشتہ سال کی رپورٹ اور آئندہ سال کے پروگرام کی تفصیل پیش کی۔ ورکشاپ کی ایک نشست دینی مدارس کے اساتذہ کے درمیان باہمی مشاورت کے لیے مخصوص تھی جس میں اساتذہ نے ورکشاپ میں مختلف حضرات کی طرف سے کی جانے والی گفتگو کی روشنی میں تبادلہ خیالات کیا اور متعدّد سفارشات پیش کیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے ایک مستقل تربیتی نظام کی ضرورت ہے جس کا اہتمام دینی مدارس کے وفاقوں اور ملک کے بڑے دینی اداروں کو کرنا چاہیے۔ اس نظام میں ایسا جامع کورس ترتیب دیا جائے جو فکری، روحانی، اخلاقی، علمی اور فنی حوالوں سے اساتذہ کو ضروری

تقاضوں سے باخبر کرنے اور ان کے مطابق ان کی عملی تربیت پر مشتمل ہو اور اس میں تعلیمی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حالات زمانہ اور مستقبل کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہو۔

- دینی مدارس کے مہتمم حضرات کو توجہ دلائی جائے کہ وہ کسی استاذ کے انتخاب کے لیے اپنی موجودہ اور روایتی ترجیحات کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور ادارہ سے وابستگی اور علمی استعداد اور ذوق تدریس کے ساتھ ساتھ فکری رجحانات اور اخلاقی و دینی معیار کا بھی لحاظ رکھیں اور اجتماعی و ملی سوچ اور وسیع تر دینی مفادات کو ترجیح دی جائے۔
- بڑے دینی مدارس میں سال کے مختلف حصوں میں اساتذہ کے لیے تین روزہ ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے جن میں انہیں تعلیم و تدریس کے فنی تقاضوں اور دینی و فکری تربیت کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی جائے اور جدید تحقیقات و معلومات سے انہیں آگاہ کیا جائے۔
- دینی مدارس اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو صرف دینی مدرسہ کی چار دیواری تک محدود نہ رکھیں بلکہ اردگرد بسنے والے عام مسلمانوں کو بھی اپنے تعلیمی نظام میں شریک کریں اور ان کے لیے ترجمہ قرآن کریم، عربی گریمر اور فہم دین کورس کا اہتمام کریں، وغیر ذلک۔

اس موقع پر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اس سال اکادمی میں دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تین ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے گا جن میں سے پہلا تین روزہ کورس محرم الحرام کے آخر میں اس عنوان پر ہوگا کہ ائمہ مساجد اور مدرسین کے ساتھ تعلیمی رابطہ کس طرح استوار کرنا چاہیے؟

ورکشاپ میں راقم الحروف نے خطبہ استقبالیہ کے طور پر جو معروضات پیش کیں، وہ درج ذیل ہیں:

علم انسان کا وہ امتیاز ہے جس نے انہیں فرشتوں پر فضیلت عطا کی اور معلّم وہ منصب ہے جسے سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اپنے تعارف کے طور پر پیش کیا کہ 'انما بعثت معلما' (میں معلم اور استاذ بنا کر بھیجا گیا ہوں) جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی

پہلی وحی قراءت، قلم اور تعلیم کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اسی لیے اسلام میں تعلیم کے مشغلہ اور معلم کے منصب کو ہمیشہ عزت اور وقار کا مقام حاصل رہا ہے اور دنیا کی ہر مہذب اور متمدن قوم میں معلم کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ البتہ اسلام نے معلم خیر اور معلم شر کا فرق ضرور کیا ہے اور علم کو نافع اور ضار کے شعبوں میں تقسیم کر کے خیر و نفع کے معلم کو فضیلت و وقار کے مقام سے نوازا ہے جبکہ شر اور ضرر کا باعث بننے والے علوم کی مذمت کرتے ہوئے ان کی تعلیم کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ شیطان بھی اصل میں ایک معلم ہی تھا لیکن چونکہ اس نے شر اور ضرر کا راستہ اختیار کر لیا تھا، اس لیے راندۂ درگاہ قرار پایا اور قیامت تک کے لیے لعنت کا طوق اس کی گردن میں پڑ گیا۔

اسلام علم برائے علم کا قائل نہیں ہے بلکہ صرف ان علوم کو اپنے تعلیمی نظام کے دائرہ میں جگہ دیتا ہے جو انسان اور انسانی سوسائٹی کے لیے نفع اور خیر کا باعث ہوں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو اور اس نوعیت کے دیگر علوم کی فنی اور واقعاتی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی تعلیم و تعلّم سے منع فرمایا ہے، بلکہ قرآن کریم نے تو جائز علوم کی بھی درجہ بندی کر کے یہ اصول پیش کیا ہے کہ ہر علم ہر شخص کے لیے موزوں نہیں ہے، بلکہ ذہنی سطح، منصبی فرائض اور مقام و حیثیت کو ملحوظ رکھ کر تعلیم و تعلّم کے لیے مضامین کے انتخاب کی سمت قرآن کریم نے راہنمائی فرمائی ہے جیسا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے کہ: 'وما علمناه الشعر وما ینبغی له' (ہم نے آپ کو شعر و شاعری نہیں سکھائی اور وہ آپ کے لیے مناسب بھی نہیں ہے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی علم کا حصول صرف اس لیے ضروری یا مناسب نہیں ہو جاتا کہ وہ علم ہے بلکہ ضرورت و مناسبت کے لیے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ علم حاصل کرنے والے کو اس کی عملی زندگی میں اس علم کی کس حد تک ضرورت ہے اور وہ اس کے لیے کس درجہ میں مناسب حال ہے۔

اسلام نے علم کو نافع اور ضار کے درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ نفع و ضرر دنیا اور آخرت دونوں حوالوں سے ہے اور آج کے عالمی تعلیمی نظام اور اسلام کے فلسفہ تعلیم میں یہی جوہری فرق ہے کہ آج کی دنیا کے نزدیک نفع و ضرر صرف اس دنیا کے حوالے سے ہے۔ جو بات اس دنیا کی زندگی کو بہتر بنانے اور شخصی، طبقاتی یا اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے مفید ہے، وہ تعلیمی نظام کا حصہ ہے لیکن اسلام اس دنیا کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ آخرت کی فوز و فلاح اور اس ابدی زندگی میں نجات کو اپنے

تعلیمی و تربیتی نظام کا اساسی ہدف قرار دیتا ہے۔ اسلام اس دنیا کی زندگی اور اس کی بہتری اور کامیابی کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے ہر جائز صورت کو اختیار کرنے کی اجازت بلکہ بعض صورتوں میں حکم دیتا ہے مگر اس شرط اور ترجیح کے ساتھ کہ دنیا کی زندگی کی آسائش، سہولتیں اور اس کی بظاہر بہتری کی کوئی صورت انسان کی اخروی زندگی میں اس کے لیے خرابی کا باعث نہ بن جائے اور دنیاوی زندگی کی سہولتیں اخروی نجات کی قیمت نہ ہوں۔

میری طالب علمانہ رائے میں اسلام نے علوم کو دنیاوی اور دینی حوالے سے تقسیم نہیں کیا بلکہ نفع و ضرر کو علوم کی تقسیم کا باعث سمجھا ہے اور یہ نفع و ضرر دنیا اور آخرت دونوں حوالوں سے ہے۔ اس لیے جو علوم انسان کے لیے فرد اور معاشرہ کے دونوں دائروں میں اس کی آخرت کی نجات اور فوز و فلاح اور دنیا کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ بہتر، پر امن اور باسہولت بنانے کے لیے مفید ہے، وہ اسلام کی نظر میں مطلوب علم ہے، اور جو علم ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے لیے نقصان کا باعث بنتا ہے، وہ علوم ضارہ میں شمار ہوتا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اسی سمت ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ ''اے اللہ! مجھے وہ علم عطا فرما جو نفع بخش ہو اور اس علم سے محفوظ رکھ جو ضرر کا باعث ہو یا نفع بخش نہ ہو۔'' میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس میں تعلیم کا انتظام کرنے والے ارباب بست و کشاد اور تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دینے والے اساتذہ کو آج کے عالمی ماحول میں اس کے تعلیمی فلسفہ و نظام کی اس بنیاد اور امتیاز کو ہر وقت سامنے رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے زیر تعلیم اور زیر تربیت افراد کو ایک بہتر انسان اور مسلمان کے طور پر اچھی زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے ساتھ ساتھ پوری انسانی سوسائٹی کے سامنے اسلام کے صحیح نمائندہ کا مقام دے سکیں۔

اب سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال قبل جب ہمارے معاشرہ میں دینی مدارس کا یہ نظام وجود میں آیا تھا، اس وقت ہمارے بزرگوں کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں مسجد و مدرسہ کا ادارہ موجود رہے اور اسے امام، حافظ، قاری، مدرس، مفتی اور خطیب کے طور پر رجال کار ملتے رہیں تاکہ مسلمانوں کی عبادات اور دینی تعلیم کے ماحول اور تسلسل کو باقی رکھا جا سکے اور اس میں کوئی تعطل یا رکاوٹ نہ ہو۔ بحمد اللہ ہمارے دینی مدارس اپنے اس مقصد اور ہدف میں کامیاب ہیں اور آج بھی اس پورے خطے میں مسجد و مدرسہ کے ادارے کے لیے ضروری رجال کار یہ دینی مدارس فراہم کر رہے

ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ضروریات کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی دینی راہ نمائی کا تقاضا بڑھ رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ وقت کی ضرورت ہے بلکہ ہماری ذمہ داری بھی ہے۔ اسی طرح آج کی گلوبل دنیا اور مستقبل کا بین الاقوامی ماحول ہمیں اس طرف توجہ دلا رہا ہے کہ ہم اپنے محدود اور مقامی و علاقائی ماحول کا اسیر رہنے کی بجائے عالمیت، گلوبلائزیشن اور بین الاقوامیت کے تقاضوں اور ضروریات کو بھی سمجھیں اور اس کے لیے اپنے تعلیمی نصاب اور تربیتی نظام میں جس ردوبدل اور تنوع کی ضرورت ہو، اس سے گریز نہ کریں تاکہ دینی مدارس اپنے مستقبل کے کردار کو امت مسلمہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکیں۔ ہمارے اکابر نے ہر دور میں یہ عمل سرانجام دیا ہے اور آج بھی یہ عمل ہم سے پیشرفت کا متقاضی ہے۔

ان تمام امور کے حوالہ سے سب سے پہلی ضرورت دینی مدارس کے اساتذہ کو اس طرف توجہ دلانے، انہیں وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی ضروریات سے آگاہ کرنے اور فکری، علمی اور فنی طور پر اس کے لیے تیار کرنے کی ہے اور اسی مقصد کے لیے اس ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ ہم باہمی مشاورت اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ اس سلسلے میں کوئی قابلِ عمل پروگرام وضع کر سکیں۔

میں تمام مہمانان گرامی اور شرکائے محفل کا تشریف آوری پر شکریہ ادا کرتے ہوئے ملتمس ہوں کہ اس بارے میں ہماری راہ نمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کارِ خیر کو بہتر طور پر آگے بڑھانے کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

ائمہ مساجد اور علماء کرام کی معاشرتی ذمہ داریاں

بنگلہ دیش میں ضلع سونام گنج کے ایک قصبہ دیرائی میں ۸ جنوری ۲۰۰۴ء کو ائمہ و علماء کانفرنس کے عنوان سے اجتماع تھا۔ لندن میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے دینی مرکز ''المرکز الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمد شعیب اس کے منتظم تھے۔ مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور مولانا محمد فاروق ملا کے ہمراہ وہاں پہنچا تو علماء کرام نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔ استقبال کرنے والوں میں مولانا نور الاسلام خان بھی شامل تھے جو دیکھتے ہی چمٹ گئے اور کان میں کہا کہ میں نصرۃ العلوم کا فاضل ہوں، میں نے ۱۳۹۱ھ میں دورۂ حدیث کیا تھا۔ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ ایک دوسرے سے حال احوال دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ دارالعلوم درگارپور میں شیخ الحدیث ہیں اور ایک عرصے سے تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ درگارپور واپسی پر راستہ میں تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے دارالعلوم میں رکے اور دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق دامت برکاتہم کی زیارت کی جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔ ائمہ و علماء کانفرنس ایک ہال میں تھی جس میں علاقہ بھر کے علماء کرام اور ائمہ کرام کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ کانفرنس کا مقصد علماء اور ائمہ کو ان کی معاشرتی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا تھا۔ راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

علماء کرام کے بارے میں ایک حدیث نبوی کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں جبکہ ائمہ جس مصلے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں، اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلیٰ سمجھا جاتا ہے اور جس منبر پر خطبہ دیتے ہیں، اسے منبر رسول کے عنوان سے پکارا جاتا ہے۔ اس حوالے سے علماء اور ائمہ اس معاشرہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی کے منصب پر فائز ہیں اور ہمیں اس منصب کی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ جائزہ لینا چاہیے کہ ہم ان ذمہ داریوں کو کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی مختلف حیثیات میں سے اس وقت تین چار امتیازی حیثیات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ ان حیثیات میں ہم لوگ جو علماء کرام کہلاتے ہیں اور امامت کے منصب پر فائز ہیں، اپنے فرائض کی انجام دہی میں کہاں تک کامیاب ہیں؟

احادیث نبوی کے مطابق غار حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سب سے پہلا تعارف روایات میں ملتا ہے، ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی زبان سے ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے ان کا وہ معاشرتی رول اور کردار یاد دلایا ہے جسے ایک سوشل ورکر کا کردار کہا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں پہلی وحی کے اچانک واقعہ کی وجہ سے گھبراہٹ کا شکار تھے جس پر ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں، اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، بیواؤں کے کام آتے ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

غارِ حرا کی وحی کے بعد ہمیں احادیث نبوی میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا تعارف یہی ملتا ہے اور ہمیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی کی بات کرتے ہوئے اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ اس حیثیت سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نمائندگی کر رہے ہیں؟

اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا تعارف ایک داعی اور مصلح کا ہے۔ آپ نے لوگوں کو توحید کی طرف دعوت دی اور معاشرہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی ان برائیوں کے خلاف آواز بلند کی جن کی وجہ سے وہ معاشرہ جاہلی معاشرہ کہلاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار اور اس کی بندگی کی دعوت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی دعوت تھی، لیکن اس کے ساتھ آپ نے عرب معاشرے کو جن باتوں کی طرف توجہ دلائی، ان کا تذکرہ قیصر روم کے دربار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت کے سب سے بڑے حریف حضرت ابوسفیانؓ نے ان الفاظ سے کیا تھا کہ وہ ہمیں صدق، صلہ اور عفاف کا حکم دیتے ہیں۔ ابوسفیانؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قریش کی قیادت کر رہے تھے، لیکن انہیں دنیا کے ایک بڑے بادشاہ کے دربار

میں یہ کہنا پڑا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ایک بڑا حصہ یہ ہے کہ لوگ سچ بولیں، آپس کے تعلقات اور روابط کو قائم رکھیں اور پاک دامنی اختیار کریں۔ عرب معاشرے میں اس وقت پھیلی ہوئی باہمی رقابتوں، بدکاری اور جھوٹ کے ماحول میں یہ معاشرتی اصلاح کی بہت بڑی دعوت تھی جس سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرب معاشرہ میں ایک عظیم داعی اور مصلح کے طور پر سامنے آئے۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندگی اور نیابت کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا ہوگا کہ جس معاشرہ میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں داعی اور مصلح کے طور پر ہمارا کردار کیا ہے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے، نیز معاشرتی برائیوں سے سوسائٹی کو نجات دلانے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟

اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم کردار کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے اور وہ ان کی معلم کی حیثیت ہے جسے قرآن کریم نے کئی جگہ بیان کیا ہے اور خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اردگرد رہنے والوں کو اور اپنے پاس آنے والوں کو براہ راست اور ان کے ذریعے سے مختلف اطراف کے لوگوں کو جن باتوں کی تعلیم دی، ان کا دائرہ بہت متنوع اور وسیع ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ آپ علماء کرام ہیں، خوب جانتے ہیں۔ البتہ میں اس طرف ضرور توجہ دلانا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم کے کردار کو سامنے رکھ کر ہم اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں کہ جس ماحول میں ہم رہتے ہیں، وہاں کے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ ایک معلم کی حیثیت سے ہمارا کیا رابطہ ہے؟

اگر گستاخی معاف فرمائیں تو میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جو لوگ مسجد میں ہمارے پاس آجاتے ہیں اور مدرسہ میں ہم سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں، ان پر تھوڑی بہت محنت کر کے ہم مطمئن ہیں کہ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہم نے ان افراد پر قناعت کر لی ہے اور ان کے علاوہ باقی لوگوں سے رابطہ اور تعلق کی ہمیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ میری درخواست ہے کہ مسجد اور مدرسہ میں ہمارے پاس آنے والوں کا معاشرہ کے باقی افراد کے ساتھ عددی تناسب ہمیں ضرور معلوم کرنا چاہیے اور پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ماحول اور آبادی کی وہ عظیم اکثریت جس کا ہمارے

ساتھ مسجد یا مدرسہ کا کوئی رابطہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک مصلح اور معلم کے طور پر ہمارا کیا معاملہ ہے؟ یہ بات سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے روز یہی لوگ ہمارا گریبان پکڑلیں کہ ہماری اصلاح اور تعلیم کے لیے ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشرتی کردار کی اور بھی بہت سی حیثیات ہیں۔ آپ حکمران بھی تھے، کمانڈر بھی تھے اور قاضی بھی تھے، لیکن میں سرِدست سوشل ورکر، داعی، مصلح اور معلم کی حیثیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء کرام اور ائمہ عظام کو غور و فکر کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ ان معاملات میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نیابت کر رہے ہیں اور ان کے وارث ہونے کا حق کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟ معاف کیجیے! ہم نے صرف نماز پڑھا دینے اور اپنے پاس آجانے والوں کو تھوڑی بہت تعلیم دینے پر قناعت کر لی ہے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت، نیابت اور نمائندگی سمجھ لیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور ہمیں اس حوالے سے اپنے کردار، طرز عمل اور ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

دوسری بات جس کی طرف ائمہ اور علماء کی اس کانفرنس کے شرکاء کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے احتساب اور اپنی سرگرمیوں کے ناقدانہ جائزہ کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں اس بات کو نہ صرف غیر ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ بعض دوست جب یہ بات کرتے ہیں کہ طالبان ہمارے بھائی ہیں، بہت نیک ہیں، مخلص ہیں اور انہوں نے قربانی اور ایثار کی شاندار روایات زندہ کی ہیں، اس لیے ان کی غلطیاں نہیں نکالنی چاہئیں اور ان کے طرز عمل کا ناقدانہ جائزہ نہیں لینا چاہیے تو مجھے تعجب ہوتا ہے اور میں عرض کرتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سب سے بہترین اور مقدس طبقہ صحابہ کرام کا گروہ ہے، لیکن جب انہیں غزوہ احد میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور حنین کی لڑائی میں تھوڑی دیر کے لیے ان کے قدم اکھڑے تو قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور ان کی ناکامی کا اعتراف کیا، اس کے اسباب بیان کیے اور ان وجوہ کی نشان دہی کی جن کی وجہ سے انہیں ان دونوں غزووں میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے حضرات صحابہ کرامؓ کے تقدس اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور ان کے خلوص اور قربانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اس لیے قرآن کریم

کا اسلوب اور ہدایت ہمارے لیے یہی ہے کہ اگر کسی مرحلہ میں ناکامی ہو تو اس کے اسباب کا جائزہ لو اور وجوہات کی نشاندہی کرو تاکہ ان کے ازالہ کے لیے کوئی صورت نکال سکو۔

اس پس منظر میں آج کی اس ائمہ و علماء کانفرنس کی وساطت سے میں علماء کرام اور ائمہ عظام کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ کسی بھی جگہ دینی خدمات سرانجام دے رہے ہوں، دو باتوں کا ہر وقت خیال رکھیں۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث کہلاتے ہوئے اور آپ کے مصلے پر کھڑے ہو کر آپ کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ انسانی معاشرے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حیثیات سے جو عظیم کردار ادا کیا تھا، ہم ان میں سے کس حیثیت کی نمائندگی کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ کہ ہم اس وقت ہر محاذ اور ہر شعبہ میں جس پسپائی کا مسلسل شکار ہو رہے ہیں، اس کے اسباب اور وجوہات کیا ہیں؟ کیونکہ اسی صورت میں ہم انبیائے کرام علیہم السلام کے ورثاء کی حیثیت سے اپنے کردار کو بہتر بنا سکتے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

(روزنامہ اسلام، ۲۶/ جنوری ۲۰۰۴ء)

دینی مدارس میں عمدہ تعلیم

مفتی محمد جمیل خان شہید اور مولانا محمد نذیر احمد تونسوی شہید کے المناک قتل کی خبر مجھے لندن میں ملی۔ مفتی محمد جمیل خان سے ۸ ر ستمبر کو جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر کے سالانہ جلسہ ختم بخاری شریف میں ملاقات ہوئی تھی۔ ۱۳ ر ستمبر کو بیرونی سفر پر روانہ ہو گیا تھا، اس لیے یہ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ پہلی ملاقات، جہاں تک یاد پڑتا ہے، ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی جب وہ مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ میں طالب علم تھے اور میں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبد الواحد رحمہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ چناب نگر (ربوہ) کے ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے مسلمان طلبہ کے ساتھ قادیانی نوجوانوں کے متشددانہ سلوک اور مسلمان طلبہ کے زخمی ہونے کے ردعمل میں قادیانیوں کے خلاف مختلف شہروں میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جنہوں نے آگے چل کر باقاعدہ تحریک ختم نبوت کی شکل اختیار کر لی اور منتخب پارلیمنٹ نے اسی تحریک کے نتیجے میں قادیانیوں کو دستوری ترمیم کے ذریعے سے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا تھا۔

گوجرانوالہ میں تحریک ختم نبوت کا ہیڈ کوارٹر مرکزی جامع مسجد تھی اور کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے سیکرٹری کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ اس دوران میں مختلف دینی مدارس کے جن طلبہ نے تحریک ختم نبوت میں سرگرم کردار ادا کیا، ان میں مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ کے طالب علم محمد جمیل خان کا نام نمایاں ہے۔ اس کے بعد ملاقاتوں، بلکہ رفاقت کا ایک ایسا تسلسل ہے کہ اسے احاطہ تحریر میں لانا مشکل نظر آ رہا ہے۔ وہ جمعیت علمائے اسلام کے سرگرم رہنماؤں میں رہے ہیں، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے، صحافت کے ساتھ تعلق اور قومی اخبارات میں دینی حلقوں کی نمائندگی بھی ہماری ایک قدر مشترک رہی ہے، جبکہ بیرونی اسفار میں بہت جگہ رفاقت رہی ہے۔ مجھے ان کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کا خدمت گزاری کا جذبہ تھا جو سفر میں عروج پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ سفر کے انتظامات، ویزے لگوانا، ٹکٹ خریدنا، کنفرم کرانا، سامان ایک جگہ

سے دوسری جگہ منتقل کرنا، رہائش کے انتظامات اور دیگر امور کے ساتھ ساتھ ذاتی خدمت کے لیے بھی مستعد رہنا ان کے من پسند مشاغل شمار ہوتے تھے۔

میں نے ان کے ساتھ حج بھی کیا ہے اور جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں انہیں حاجیوں، بالخصوص علماء کرام کی خدمت میں ہمہ تن مصروف بھی دیکھا ہے۔ میں ان کے ساتھ ازبکستان کے سفر میں بھی شریک رہا ہوں۔ تاشقند، سمرقند اور خرتنگ وغیرہ میں انہیں رفقائے سفر کی خدمت اور سہولت کے کاموں میں اس بے تکلفی کے ساتھ مصروف پایا ہے جیسے وہ کسی دوسرے ملک میں نہیں، بلکہ کراچی میں ہیں۔ برطانیہ کے مختلف اسفار میں بھی ان کے ساتھ رفاقت رہی ہے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام برمنگھم کی مرکزی جامع مسجد میں منعقد ہونے والی عالمی ختم نبوت کانفرنس کے لیے ان کی شب و روز کی مصروفیات دیکھی ہیں۔ انہیں اسٹیج پر آنے کا شوق نہیں تھا، بلکہ کانفرنس کی خبریں اور رپورٹ اخبارات میں بروقت شائع کرانا ان کی سرگرمیوں کا مرکزی ہدف ہوتا تھا۔ ختم نبوت کانفرنس برمنگھم کی ہو یا چناب نگر کی، ایسے مواقع پر ان کا صحافتی ذوق انتہا کو چھونے لگتا تھا۔ ایک بڑے اخبار سے ان کا بطور سب ایڈیٹر تعلق تھا۔ کانفرنس کے موقع پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کرنا، مضامین فراہم کرنا، خبریں مہیا کرنا اور کانفرنس کی رپورٹنگ کا خود ذاتی طور پر اہتمام کرنا ان کا مشن تھا اور ان کی موجودگی میں ہم ایسے بہت سے کاموں سے بے نیاز ہو جایا کرتے تھے۔

خدمت کے حوالے سے ان کے ذوق کا یہ پہلو بطور خاص قابلِ ذکر ہے کہ بزرگ علماء کرام تک رسائی حاصل کرنا اور ان کی خدمت کے بہت سے کام اپنے کھاتے میں ڈال لینا ان کا مشغلہ تھا۔ انہیں جن بزرگوں کی ذاتی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ہے، ان میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا مفتی ولی حسنؒ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ انہی میں میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ بھی ہیں جو ترانوے برس کی عمر میں چند سالوں سے مسلسل صاحب فراش ہیں۔ ہمارے چھوٹے بھائی قاری ساجد خان اور قاری راشد خان ان کی خدمت میں رہتے ہیں۔ مجھے اپنی نالائقی اور مختلف النوع پیہم مصروفیات کی وجہ سے ان کی خدمت میں رہنے کا موقع نہیں مل پاتا، مگر مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ اور ان کے رفقاء حاجی محمد لقمان میر، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور مولانا محمد نواز بلوچ نے بیماری اور معذوری

کے ایام میں ان کی خدمت کے کاموں کو جس طرح سنبھالا، اس پر ان حضرات کے لیے بے ساختہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کی دینی خدمت کا ایک وسیع میدان ”اقراء روضۃ الاطفال“ کا وہ وسیع نیٹ ورک ہے، جس کے تحت کراچی سے گلگت تک مختلف علاقوں میں ایسے مدارس کا جال بچھا دیا گیا ہے جس میں کھاتے پیتے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بچے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اسکول کی ضروری تعلیم بھی پاتے ہیں۔ قرآن کریم حفظ کرنے یا دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں کچھ عرصے تک تو یہی تاثر رہا ہے کہ غریب گھرانوں کے بچے ہی یہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور عام طور پر معذور بچوں یا ایسے گھرانوں کے بچوں کو ان مدارس میں بھیجا جاتا ہے جو اپنے بچوں کی کفالت نہیں کر پاتے۔ ہمارے ہاں یہ بات عام حلقوں میں کچھ عرصہ پہلے تک بطور خاص کہی جاتی رہی ہے کہ جو بچہ آنکھوں سے معذور ہو یا خدانخواستہ لولا لنگڑا ہو یا ذہنی طور پر کمزور ہو اور اسکول میں نہ پڑھ سکے، اسے مدارس میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ویسے یہ میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ گوجرانوالہ میں ایک دیہاتی خاتون دو بچے لے کر میرے پاس آئی۔ وہ اتنے چھوٹے تھے کہ انہیں سنبھالنا خود ایک مسئلہ تھا۔ میں نے بچے واپس کرا دیے۔ دو روز کے بعد وہ خاتون ہمارے ایک دوست کو سفارشی بنا کر لے آئی اور کہا کہ خدا کے لیے ان بچوں کو رکھ لیں۔ میرا خاوند بیمار ہے، کمانے کے قابل نہیں ہے اور میں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے گزارا کرتی ہوں۔ مجھ سے یہ بچے نہیں سنبھالے جاتے، اس لیے انہیں مدرسے میں رکھ لیں۔ ہم نے ترس کھا کر ان بچوں کو رکھ لیا اور خدا کی قدرت، ان میں سے ایک بچے نے صرف گیارہ ماہ میں قرآن کریم مکمل حفظ کر لیا اور اگلے سال رمضان المبارک میں مجھ سے بطور سامع قرآن کریم سنا۔

بحمد اللہ تعالیٰ اب دینی مدارس میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ اب ان مدارس میں کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے گھرانوں کے بچے قرآن کریم حفظ کرتے اور دینی علم کی تعلیم پاتے ہیں، بلکہ ایسے مدارس میں جو حفظ قرآن کریم اور دیگر دینی علوم کے ساتھ ساتھ اسکول کی تعلیم دیتے ہیں اور تعلیم و انتظام کا معیار دوسرے اسکولوں اور کالجوں کی طرح عمدہ رکھتے ہیں، داخلے کے لیے امیدواروں کی لمبی لمبی ویٹنگ لسٹیں ہوتی ہیں اور باقاعدہ سفارشیں کرائی جاتی ہیں۔ گوجرانوالہ میں اقراء روضۃ الاطفال کی

شاخوں میں داخلے کے لیے مجھ سے کئی معزز شہری مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کے نام سفارشی رقعے لکھواتے رہے ہیں۔

صورت حال میں اس خوشگوار تبدیلی کے اسباب میں میرے نزدیک سب سے زیادہ کریڈٹ تبلیغی جماعت کو جاتا ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات میں دین کی دعوت اور دینی اقدار کی طرف مسلمانوں کی دلچسپی کے لیے متحرک ہیں اور مسجد کے ساتھ عام مسلمانوں کو جوڑنے کے کام میں مصروف ہیں۔ اس کے بعد اس تبدیلی کے اسباب میں ''اقراء روضۃ الاطفال'' کا بھی بڑا کردار ہے جس نے سوسائٹی کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں اور کھاتے پیتے خاندانوں میں یہ ذوق پیدا کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول اور کالج کی تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم حفظ کرائیں، دینی تعلیم سے بھی بہرہ ور کریں اور پھر ان کے معیار کے مطابق انتظامات بھی کیے تا کہ انہیں اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے میں معاشرتی طور پر کوئی عار یا حجاب محسوس نہ ہو۔

مجھے یاد ہے کہ اب سے ربع صدی قبل جب ہم مالدار یا افسر طبقے کے کسی دوست کو ترغیب دیتے کہ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلائیں تو عام طور پر ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کے خواہش مند تو ہیں لیکن ایک تو ہم انہیں چندے اور زکوٰۃ کے مال سے پڑھانا نہیں چاہتے اور دوسرے صرف دینی تعلیم نہیں بلکہ عصری تعلیم سے بھی بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔ اقراء روضۃ الاطفال نے ان دونوں تقاضوں کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے طبقاتی معاشرے کی بالائی سطح کو دینی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے میں ''اقراء روضۃ الاطفال'' کا بہت اہم کردار ہے اور اس کا کریڈٹ سب سے زیادہ مفتی محمد جمیل خان شہید کو جاتا ہے۔

خاص طور پر کراچی میں تو میں ''اقراء روضۃ الاطفال'' کے اس کردار کو ایک اور حوالے سے بھی دیکھتا ہوں کہ پاکستان کا یہ سب سے بڑا شہر، جو معاشی حوالے سے ملک کا اعصابی مرکز ہے، ایک عرصے سے بین الاقوامی سازشوں کی زد میں ہے اور اسے کئی بار لسانی اور نسلی عصبیتوں کا نشانہ بنا کر سازشوں کے فریم ورک میں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زہر کا اصل تریاق دینی تعلیم اور دینی ماحول ہے جسے فراہم کرنے میں کراچی کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دینی مدارس کے وسیع جال کے ساتھ ساتھ ''اقراء روضۃ الاطفال'' کا بھی بڑا حصہ ہے اور قومی وحدت کے تحفظ میں مفتی محمد جمیل

خان شہید کی اس محنت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ کی شہادت کے بعد میں مسلسل اس سوچ میں ہوں کہ ان کی تعزیت کس سے کروں یا کس کس سے کروں؟ وہ کسی ایک خاندان، ادارے یا حلقے کا فرد تو نہیں تھا، اس کا معاملہ سب سے یکساں تھا اور سب کی خوشیوں اور دکھ درد میں ایسے شریک ہوتا تھا جیسے خود اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، اور بیوی بچوں میں خوشیاں بانٹ رہا ہے یا ان کے غم کا بوجھ ہلکا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اور مولانا نذیر احمد تونسوی شہید کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور سب پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

دینی تعلیم کے مختصر کورسز: ضرورت و اہمیت

گزشتہ روز تھوڑی دیر کے لیے فیصل آباد جانا ہوا۔ ملت ٹاؤن میں واقع جامعہ دار الارشاد والاصلاح میں ''فہم دین کورس'' کے آغاز کی تقریب تھی۔ مولانا اشرف ہمدانی کا شمار ایک دور میں ملک کے معروف خطباء میں رہا ہے۔ جس دور میں وہ گوجرانوالہ کی جامع مسجد، پل لکڑوالا میں خطیب تھے، میرا طالب علمی کا آخری دور تھا۔ اس کے بعد وہ جناح کالونی فیصل آباد کی مرکزی جامع مسجد میں خاصا عرصہ خطیب رہے ہیں اور اب ملت ٹاؤن فیصل آباد میں مذکورہ بالا عنوان سے ادارہ قائم کر کے سرگرم عمل ہیں۔ عالمی تحفظ ختم نبوت کے سرگرم رہنماؤں میں شامل رہے ہیں، اب کچھ عرصہ سے صاحب فراش ہیں اور ان کے فرزند مولانا کفایت اللہ ہمدانی جامعہ میں ان کی نیابت و معاونت کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسکولوں اور کالجوں میں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں چالیس روزہ ''فہم دین کورس'' کا اہتمام کیا ہے اور اس کی افتتاحی تقریب میں حاضر ہو کر میں نے جمعرات کو مغرب کے بعد کچھ گزارشات پیش کی ہیں۔

کچھ برسوں سے مختلف شہروں میں اسکولوں اور کالجوں کی سالانہ تعطیلات سے فائدہ اٹھانے کا خوش آئند رجحان بڑھ رہا ہے اور بہت سے ادارے ان چھٹیوں میں اس طرح کے تعلیمی پروگرام کر رہے ہیں۔ خود ہماری الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف نے اس سال ایک نئے تجربے کا آغاز کیا ہے۔ وہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ میں درس نظامی کی تعلیم کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں اور اس حوالے سے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے طلبہ نے ان کے اس ذوق سے استفادہ کیا ہے اور ایف اے اور بی اے کے امتحانات کے ساتھ ساتھ درس نظامی میں وفاق المدارس کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سال انہوں نے اڑھائی ماہ کے دورانیہ کی ایک کلاس شروع کی ہے جس کا افتتاح راقم الحروف نے ۱۰ر جون کو کیا ہے اور یہ ۲۵ر اگست تک جاری رہے گی۔ مولانا حافظ محمد یوسف کا ارادہ ہے کہ وہ اس کلاس کے طلبہ کو اڑھائی

ماہ میں وفاق المدارس العربیہ کے درجہ اولیٰ کا پورا نصاب پڑھا دیں گے اور طلبا اس کا باقاعدہ امتحان دے سکیں گے۔ اس کلاس میں انہیں مڈل، میٹرک اور بی اے کی سطح کے طلبہ میسر آئے ہیں اور انہیں اطمینان ہے کہ وہ ان شاء اللہ آسانی کے ساتھ مقررہ مدت کے دوران میں اپنا ہدف پورا کر لیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو میرے خیال میں یہ ایک نیا انقلابی تجربہ ہوگا اور اس سے ملک بھر کے دینی مدارس کو راستہ ملے گا اور وہ اپنے معمول کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو موسم گرما کی تعطیلات میں درس نظامی کا نصاب پڑھا کر اپنے طلبہ و فضلاء کی تعداد میں معقول اضافہ کر سکتے ہیں۔

۱۷/ جون کو گوجرانوالہ شہر میں مجھے اسی طرح کے ایک کورس کے افتتاح کا موقع ملا جو ہمارے پرانے ساتھی مولانا حافظ گلزار احمد آزاد نے مسجد ختم نبوت ابوبکر ٹاؤن سیالکوٹ روڈ میں ''فہم دین کورس'' کے نام سے شروع کیا ہے اور اس پچیس روزہ کورس میں وہ شرکاء کو قرآن کریم کی تعلیمات کے حوالے سے ضروریات دین کی تعلیم دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سے ملتا جلتا ایک کورس ضلع نارووال میں ظفروال کے قریب ''اونچہ کلاں'' میں مولانا افتخار اللہ شاکر نے شروع کیا ہے جو ۱۵/ جون سے شروع ہو کر ۲۹/ جون تک جاری رہے گا اور اس کورس کا موضوع قادیانیت، انکار حدیث اور دیگر فتنوں کے خلاف نوجوانوں کو تیار کرنا ہے۔ یہ کورس انہی دنوں میں ہر سال ہوتا ہے اور اس میں مولانا منظور احمد چنیوٹی اور حضرت مولانا سید عبد القادر آزاد اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ مجھے بھی کم و بیش ہر سال حاضری کا موقع ملتا ہے اور اس سال میں نے ۲۲/ جون جمعرات کو ظہر سے عشاء تک کا وقت کورس کے شرکاء کے ساتھ گزارنے کا وعدہ کیا ہے۔ ماشاء اللہ! اس طرح کے کورسز ملک کے مختلف شہروں میں اب سینکڑوں کی تعداد میں ہونے لگے ہیں اور مختلف مکاتب فکر کے ادارے ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ گزشتہ روز میں نے ایک بینر عربی زبان کے ایک کورس کا بھی دیکھا جو ہمارے محترم دوست مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کے مرکز کی طرف سے تھا۔ مولانا موصوف مسلکاً اہل حدیث ہیں، لیکن معتدل مزاج بزرگ ہیں اور مشترکہ دینی کاموں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ مسلک کے اظہار و بیان میں بھی اعتدال کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف رحمہ اللہ یاد آجاتے ہیں۔ وہ میرے بزرگ دوستوں میں سے تھے اور ہمیشہ شفقت

فرماتے تھے۔ ساری زندگی ملی مسائل کے لیے جدوجہد میں گزاری، ذاکر و شاغل بزرگ تھے اور وحدت ملت کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہتے تھے۔ مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کو عربی زبان کے فروغ سے بطور خاص دلچسپی ہے اور مختلف سطحوں پر عربی زبان کے مختصر کورسز کراتے رہتے ہیں۔ ان کا مرکز اسلام آباد میں ہے لیکن اس مرکز کے تحت دوسرے شہروں میں بھی کورسز کا اہتمام کرتے ہیں۔

یہ مختصر کورسز عربی زبان کے حوالے سے ہوں، قرآن فہمی کے حوالے سے ہوں، ضروریات دین کی تعلیم کے لیے ہوں یا عقائد کے تحفظ کے نقطہ نظر سے ہوں، وقت کی ایک اہم ضرورت ہیں اور ان کی طرف دینی اداروں اور مراکز کا بڑھتا ہوا رجحان یقیناً ایک خوش آئند امر ہے، لیکن اس کے لیے چند امور کی طرف بروقت توجہ دینا ضروری ہو گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان مختصر کورسز میں پڑھایا جانے والا مواد کیا ہو؟ کیونکہ یہ مواد اگر باہمی مشاورت سے طے ہو گا تو اس سلسلے کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہو گا اور ہم آہنگی کا دائرہ بھی قائم رہے گا، لیکن اگر کیف ما اتفق ہر جگہ الگ الگ نصاب زیر تعلیم ہو گا تو ترجیحات میں تفاوت اور اہداف و مقاصد کا تنوع ضرور فکری و ذہنی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سطح پر جو امور سب سے زیادہ ضروری ہیں، انہیں درج ذیل ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے:

- قرآن پاک صحیح تلفظ کے ساتھ اور تجوید کے بنیادی قواعد کے مطابق پڑھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور عوامی سطح پر اس کا اہتمام کم ہوتا ہے، اس لیے یہ کوشش کی جائے کہ ان کورسز کے شرکاء کو صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی اس حد تک مشق کروائی جائے کہ وہ خود محنت کر کے قرآن کریم کی صحیح تلاوت کر سکیں۔
- نماز کے ضروری احکام و مسائل اور طریقہ و آداب کے علاوہ نماز میں پڑھے جانے والے وظائف، تسبیحات اور دعاؤں کا تلفظ صحیح کرانے کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی سکھایا جائے تاکہ نماز پڑھتے ہوئے نمازی ذہنی طور پر یہ محسوس کر رہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیوں پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ضروری مسائل سے واقف کرایا جائے۔
- قرآن پاک کی چند سورتیں اور آیات اور ان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث ترجمہ کے ساتھ یاد کرا دی جائیں اور روزمرہ معمولات کے حوالے سے مختصر دعائیں

بھی ترجمہ کے ساتھ یاد کرائی جائیں۔

- معاشرتی زندگی کے مسائل، خاندانی نظام کی اہمیت، باہمی میل جول کے شرعی آداب، چھوٹے بڑے کے حقوق و آداب اور انسانی حقوق کے اسلامی تصور و احکام سے متعارف کرایا جائے۔
- حلال و حرام کے مسائل اور ضروری احکام بتائے جائیں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے احکام و مسائل ذہن نشین کرائے جائیں۔
- وجود باری تعالیٰ، توحید، رسالت، قیامت، ختم نبوت، حجیت حدیث، مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر ضروریات کے حوالے سے عقائد سے روشناس کرایا جائے اور اہل السنۃ والجماعت کے متفقہ عقائد مناسب ترتیب کے ساتھ اہتمام سے پڑھائے جائیں۔
- ☆فکر و تہذیب کی موجودہ عالمی کشمکش سے انہیں آگاہ کیا جائے اور فکری و تہذیبی مسائل کے حوالے سے اہل دین کے موقف اور جدوجہد سے انہیں روشناس کرایا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر موسم گرما کی تعطیلات میں چالیس روز یا دو ماہ کے لگ بھگ دورانیہ کے ایسے کورسز کا اہتمام کر کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات کو ان میں شرکت کی ترغیب دی جائے تو ملک بھر میں دینی تعلیم کے فروغ اور دینی ماحول کے استحکام کی فضا قائم ہو سکتی ہے جو اسلام اور اہل دین کے خلاف عالمی میڈیا اور لابیوں کی ہمہ گیر یلغار کے ماحول میں دن بدن زیادہ ضروری ہوتی جا رہی ہے۔ میڈیا اور ذرائع ابلاغ جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا علاج ہمارے پاس اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین کی تعلیم کے نظام سے وابستہ کر لیں اور معاشرہ میں قرآن و سنت کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ عام مسلمانوں اور خاص طور پر اسکولوں اور کالجوں کے طلبا و طالبات میں دینی تعلیم کے فروغ اور مسائل و احکام سے واقفیت کا ذوق بیدار کرنے سے بڑی حد تک اس زہر کا تریاق ہو جائے گا جو عالمی میڈیا اور لابیاں مغربی تہذیب و فلسفہ اور ثقافت کے فروغ کے لیے مسلسل پھیلا رہی ہیں۔

ضروریات دین کی حد تک بنیادی تعلیم تو بہرحال ہر سطح پر ضروری ہے اور اس کے لیے ہر دینی ادارے اور مرکز کو کوئی نہ کوئی پروگرام ان تعطیلات میں ضرور بنانا چاہیے۔ باقی رہی بات درس نظامی

کے پورے کورس کی تعلیم کی تو اگر ہمارا الشریعہ اکادمی کا ابتدائی تجربہ کامیاب ہو جائے تو یہ بہت خوشی اور پیشرفت کی بات ہوگی اور اس سے مستقبل کے بہت سے وسیع امکانات کا دروازہ کھلے گا، البتہ اس موقع پر دینی مدارس کے وفاقوں بالخصوص وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے یہ گزارش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ ملک بھر میں مختلف موسموں میں اسکولوں اور کالجوں کی سالانہ تعطیلات کے دوران میں ان کے طلبہ کو کسی نہ کسی درجہ میں دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا کوئی نظم ضرور قائم کریں اور وفاق کی طرف سے دینی مدارس کو ایسے مختصر کورسز کا ٹاسک دیں جن سے عام لوگوں کے دینی تعلیم کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم کے دائرہ میں شامل کیا جا سکے۔ انفرادی طور پر تو یہ رجحان ملک کے مختلف حصوں میں بڑھ ہی رہا ہے لیکن یہی کام اگر وفاق المدارس العربیہ اور دیگر دینی وفاقوں کی سطح پر ہوگا تو اس کی افادیت اور ثمرات میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور وفاقوں کی تعلیمی جدوجہد میں ایک اہم پیشرفت ہوگی۔

(روزنامہ اسلام، ۲۰ جون ۲۰۰۴ء)

دینی مدارس، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ

حاجی محمد بوستان صاحب تبلیغی جماعت کے سرکردہ حضرات میں سے ہیں۔ میرپور آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ ایک عرصہ سے برطانیہ کے شہر شیفیلڈ میں رہائش پذیر ہیں۔ عالمی سطح پر تبلیغی اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ خود عالم دین نہیں مگر علماء کی مجالس میں بیٹھتے ہیں اور دعوت و تبلیغ اور دینی تعلیم کے مسائل پر اپنی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے میرپور آزاد کشمیر میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے نام سے ایک دینی درس گاہ قائم کر رکھی ہے جس میں دورۂ حدیث تک کے اسباق ہوتے ہیں اور وہ شیفیلڈ میں بیٹھ کر اس دینی مدرسہ کو کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ سال میں ایک دو بار آتے ہیں اور جامعہ سے متعلق ضروری امور نمٹا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے فون پر راقم الحروف سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ وہ اس جامعہ میں طلبہ کے لیے کمپیوٹر کلاس کا اجرا کر رہے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ میں اس موقع پر میرپور آکر جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے کمپیوٹر سنٹر کے افتتاح کی رسم ادا کروں اور اس کے ساتھ ہی اساتذہ، طلبہ اور دیگر شرکائے تقریب کے سامنے کمپیوٹر اور دیگر ذرائع کی اہمیت کے عنوان پر اظہار خیال بھی کروں۔ چنانچہ ان کی دعوت پر ۹/ مئی کو میرپور جانے کا اتفاق ہوا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے ایک کشادہ کلاس روم میں تین کمپیوٹر سیٹوں کی فراہمی کے ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور ان کے اساتذہ کے لیے کمپیوٹر ٹریننگ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ راقم الحروف نے بٹن دبا کر کمپیوٹر کا افتتاح کیا جبکہ کمپیوٹر نے شرکائے محفل کو سورۃ الفاتحہ سنا کر اور اسکرین پر اس کی کتابت دکھا کر تقریب کا آغاز کیا۔ تقریب میں جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ شہر کے متعدّد سرکردہ حضرات بھی شریک تھے۔ حاجی بوستان صاحب نے تمہیدی گفتگو میں کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ اور دینی تعلیم و تربیت کے شعبہ میں ابلاغ کے جدید ترین ذرائع سے استفادہ کیا جائے اور شرعی احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ابلاغ کے ہر میسر ذریعہ کو استعمال میں لایا جائے اور

اسی مقصد کے لیے انہوں نے کمپیوٹر کلاس کا اہتمام کیا ہے تاکہ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ یہ ٹریننگ حاصل کریں اور اسے استعمال میں لانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس سنٹر میں انٹرنیٹ کی سہولت بھی فراہم کرنا چاہتے ہیں لیکن میرپور میں ٹیلی فون کا ڈیجیٹل ایکسچینج نہ ہونے کی وجہ سے سردست یہ ممکن نہیں ہے۔

راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں جس نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے ہر دور میں ابلاغ کے ہر میسر ذریعہ کو اختیار کرنا، مخاطب کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر گفتگو کرنا اور گفتگو کے مروجہ اسلوب سے استفادہ کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی پیغام اور دعوت مخاطب کے ذہنوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ میں ہمیں اس سلسلے میں واضح راہنمائی ملتی ہے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستی اور شرک کے خلاف آواز اٹھائی اور کلمہ توحید بلند کیا تو مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔ اس دوران میں قریش کے سرکردہ حضرات کا ایک وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ آپ جو دعوت دے رہے ہیں، ہم اس کی غرض سمجھنا چاہتے ہیں کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس پر غور کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا:

> ”میں ایک کلمہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اگر تم اسے قبول کر لو تو عرب پر تمہاری حکمرانی ہو گی اور عجم بھی تمہارے تابع ہو گا۔“

یہ سردار ٹائپ لوگ تھے۔ قیامت، جنت اور قبر کی بات ان کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے انہی کی زبان میں بات کی کہ چودھراہٹ قائم رکھنے بلکہ اس کا دائرہ وسیع کرنے کا راستہ بھی وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔

اسی طرح غزوہ احزاب میں جب قریش اور ان کے حلیف قبائل کو مدینہ منورہ کے محاصرہ میں ناکامی ہوئی اور انہیں بے نیل مرام واپس جانا پڑا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں فرمائیں۔ ایک تو یہ کہا کہ اب قریش کو ہم پر حملہ آور ہونے کی ہمت نہیں ہو گی اور اب ہم ادھر جائیں گے، اور دوسری بات یہ فرمائی کہ قریش ہمارے خلاف ہتھیار کی جنگ میں شکست کھا چکے ہیں، اس لیے اب وہ عرب قبائل میں ہمارے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائیں گے اور ادب و شعر کی جنگ لڑیں گے۔ شعر گوئی اور خطابت اس دور کا امتیازی اسلوب تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابہ کرام کو ترغیب دی کہ وہ اس جنگ یعنی میڈیا وار کے لیے بھی تیار رہیں، چنانچہ تین حضرات نے اس معرکہ آرائی کے لیے خود کو پیش کیا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ، ان تینوں حضرات نے اس معرکہ میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان حضرات کی باہمی تقسیم کار یہ تھی کہ ایک صاحب جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و نعت کہتے اور کافروں کے اعتراضات کا جواب دیتے، دوسرے بزرگ کافروں کی ہجو اور مذمت میں اشعار کہتے اور تیسرے صاحب رزمیہ شاعری کرتے اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق ایسا بھی ہوتا تھا کہ مسجد نبوی میں منبر پر کھڑے ہو کر حضرت حسان بن ثابتؓ اشعار سناتے اور خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھے انہیں داد دیتے اور ان کے لیے دعا فرماتے تھے۔

یہ اس دور کا اسلوب تھا جس میں قبائل اور اقوام ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر اپنی برتری کا اظہار کرتی تھیں، اس لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسلوب کو اختیار کرنے سے گریز نہیں بلکہ اس کا بھرپور استعمال کر کے اس محاذ پر بھی قریش کو شکست دی۔ اس کے ساتھ ابلاغ کے ذرائع کو بھی دیکھ لیں۔ وہ دور مشینری کا دور نہیں تھا۔ آلات اس دور میں وجود میں نہیں آئے تھے، مگر اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا فطری جذبہ موجود تھا جسے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا خواہش مند ہر شخص اور گروہ پوری طرح استعمال کرتا تھا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے کسی موقع سے استفادہ کرنے سے گریز نہیں کیا۔

عکاظ کا میلہ کوئی مذہبی اجتماع نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک کلچرل اجتماع کی ہوتی تھی جس میں ناچ گانا بھی ہوتا تھا، شراب نوشی بھی ہوتی تھی، دنگل بھی ہوتے تھے، شعر و خطابت کے مقابلے بھی ہوتے تھے، خرید و فروخت بھی ہوتی تھی اور عرب کی جاہلی معاشرت کا ہر اچھا اور برا پہلو اس میں نمایاں ہوتا تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک رسائی کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ اس لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے اور اس سب کچھ کے باوجود اپنی بات وہاں آئے ہوئے مختلف قبائل کے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس طرح کے اور میلوں میں بھی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے جس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اپنا پیغام

لوگوں تک پہنچانے کے لیے جو ذریعہ بھی موجود ہو، اس کی قباحتوں کو دیکھ کر اسے ترک نہیں کر دینا چاہیے بلکہ جس حد تک ممکن ہو، اپنے مقصد اور مشن کے لیے اسے استعمال کرنا چاہیے۔

راقم الحروف نے اپنی گفتگو میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی اہمیت بھی بیان کی اور دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے گزارش کی کہ انہیں دونوں پر دسترس حاصل کرنی چاہیے کیونکہ مستقبل میں ان دونوں کے بغیر تعلیم اور دعوت، دونوں میدانوں میں مراکز اور لائبریریوں تک رسائی ممکن نہیں رہے گی اور اس سلسلے میں ہم معاصر اقوام اور طبقات سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اس گفتگو کے بعد جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی کی دعا پر یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

(روزنامہ اوصاف اسلام آباد، ۱۸ر مئی ۱۹۹۹ء)

تکملہ ۱

دینی مدارس کے معاشرتی کردار کے حوالے سے ایک مکالمہ

عطاء الحق قاسمی

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

ہمارے ذہنوں میں مولوی کا تصور وہی ہے جو آدھی رات کو مسجد کے چیختے چنگھاڑتے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے یا سیاسی مولویوں کی دو عملی ہمارے ذہنوں میں مولوی کا امیج مسخ کرنے کا باعث بنی ہے لیکن میں ''مولویوں'' میں اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ ان کے مثبت اور منفی پہلو دونوں میرے ذہن میں ہیں۔ وہ جو صحیح معنوں میں مولوی ہیں، ان کا وژن بہت وسیع ہے۔ مسٹر حضرات ان کی جہتوں سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ان کا طرز استدلال بڑے بڑے بزرجمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمارے مسٹر حضرات مولوی پر جہاں اور بہت سے اعتراضات کرتے ہیں، وہاں وہ بہت عرصے سے مولوی کو مسلم امہ کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کا ذمہ دار بھی ٹھہراتے ہیں اور ہم لوگ ان کی بات پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں۔

مجھے گزشتہ روز ڈاک میں مولانا زاہد الراشدی کی شائع شدہ ایک تحریر ملی جو انہوں نے مدرسہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کی تھی۔ اس میں مولانا نے دیگر الزامات کے علاوہ اس الزام کا جواب بھی دیا ہے جو مولوی حضرات پر مسلمانوں کے ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ مجھے مولانا کی بات میں وزن محسوس ہوا ہے اور یوں صورت حال 'ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا' والی لگتی ہے۔ مولانا کی تقریر سے ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے:

> ''سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے آج ہم دنیا میں اپنے جائز مقام سے محروم ہیں اور ہمارے مصائب و آلام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ صرف ایک مثال سے بات سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے آج سے پون صدی یا ایک صدی قبل ہم مسلمانوں کو بہت بڑی

دولت سے نوازا۔ خلیج میں تیل کی دولت دی۔ یہ ہمارا ادبار کا دور تھا، زوال کا دور تھا مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے وقت کی سب سے بڑی دولت عطا فرمائی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم تیل زمین سے نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے، چشمے کھودنے کی تکنیک سے بے بہرہ تھے، تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی صلاحیت سے ہم کورے تھے اور تیل کو ریفائن کرنے کے بعد دنیا کی مارکیٹ میں بیچنے کے لیے مارکیٹنگ کی صلاحیت بھی ہم میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے ہم مغربی ماہرین کو بلانے پر مجبور ہوئے۔ مغربی ماہرین آئے، پھر مغربی کمپنیاں آئیں، ان کے بعد بینک آئے، پھر سیاست کار آئے اور ان کے ساتھ مغرب کی فوجیں بھی آگئیں جو آج تیل کے چشموں کا گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

ذرا خیال کیجیے کہ تیل ہمارا، چشمے ہمارے، کنویں ہمارے، زمین ہماری لیکن ان پر قبضہ کس کا ہے؟ اور کس وجہ سے ہے؟ یہ ہماری نااہلی تھی کہ ہم تیل نکالنے، صاف کرنے اور عالمی مارکیٹ میں اسے بیچنے کی صلاحیت سے محروم تھے جس کی وجہ سے مغرب سے ماہرین آئے اور آج ماہرین، کمپنیاں، بینک اور پھر فوجیں خلیج میں تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تیل نکالنے، صاف کرنے اور مارکیٹنگ کی صلاحیت آج بھی ہم میں موجود نہیں ہے اور مغرب کے ارادے یہ ہیں کہ ابھی امریکی وزارت دفاع پینٹاگون میں یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی احکامات کی من وعن تابع داری نہ کی تو اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ کر لیا جائے گا اور مغربی ملکوں میں اس کے اثاثے اور مغربی بینکوں میں اس کے اکاؤنٹس ضبط کر لیے جائیں گے۔

اس لیے ہمیں اس کی تکلیف زیادہ ہے اور ہم اس کا درد زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے اور میں ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے، دعوت دیتا ہوں کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں امت کی محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟

میں تاریخ کے حوالے سے بات کروں گا۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمرانوں نے ہمارا پورا نظام تلپٹ کر دیا تھا، دینی مدارس ختم کر دیے تھے، نظام تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی تب دو طبقے سامنے آئے تھے اور انہوں نے ملت کو سہارا

دیا تھا۔ دونوں نے الگ الگ شعبوں کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ علماء کرام نے قرآن و سنت کی تعلیم کو باقی رکھنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور اسلامی ثقافت اور تہذیب کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے عوام سے تعاون کے لیے رجوع کیا، چندے مانگے، گھر گھر دستک دے کر روٹیاں مانگیں، زکوٰۃ و صدقہ کے لیے دست سوال دراز کیا اور سرکاری تعاون سے بے نیاز ہو کر عوامی تعاون کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے آثار کو بچانے کے لیے کردار ادا کیا۔ انہوں نے ایک ایک دروازے پر دستک دی، سر پر چنگیر رکھ کر گھر گھر سے روٹیاں مانگیں، ہاں ہاں میں نے خود روٹیاں مانگی ہیں، اور مجھے اس پر فخر ہے۔ میں نے اپنی طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے کئی محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم نے اپنی عزت نفس کی پروا نہیں کی، طعنے سنے ہیں، بے عزتی برداشت کی ہے لیکن قرآن و سنت کی تعلیم کو باقی رکھا ہے جس کی گواہی آج دشمن بھی دے رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور طبقہ سامنے آیا جس نے قوم کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی، سائنس اور ٹیکنالوجی پڑھانے کا وعدہ کیا، انگریزی اور جدید زبانوں کی تعلیم اپنے ذمے لی۔ انہیں اس کام کے لیے ریاستی مشینری کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے قومی خزانے کے کھربوں روپے خرچ کر ڈالے۔ انہیں سرکاری وسائل میسر تھے، ریاستی پشت پناہی حاصل تھی لیکن وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج کی قوموں کے برابر نہ لا سکے اور آج اپنی ناکامی کی ذمہ داری مولوی کے سر تھوپ کر اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج کی اجتماعی دانش سے سوال کرتا ہوں کہ وہ انصاف سے کام لے اور یہ فیصلہ کرے کہ نااہل کون ثابت ہوا اور اپنی ذمہ داری کس نے پوری نہیں کی؟ آج اگر ملک کے کسی گوشے میں دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، قرآن و سنت کی راہ نمائی لوگوں کو میسر نہیں ہے اور اسلام کی آواز نہیں لگ رہی تو ہم مجرم ہیں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہنے کی ذمہ داری ہم پر نہ ڈالیے۔ یہ ناانصافی ہے۔ اس کے بارے میں ان سے پوچھیے جنہوں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور اس کے لیے سرکاری خزانے کے کھربوں روپے اب تک انہوں نے خرچ کر ڈالے ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مساجد میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر

ہیں؟ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قاری مل رہے ہیں؟ رمضان میں قرآن سنانے کے لیے حافظ مل جاتے ہیں؟ جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب موجود ہیں؟ مسئلہ بتانے والے مفتی صاحبان کی کمی تو نہیں؟ دینی راہ نمائی دینے کے لیے علماء کرام سے ملک کا کوئی گوشہ خالی تو نہیں؟ اس سے اگلی بات کہ میدان جنگ میں کفر کے خلاف صف آرا ہونے والے مجاہدین بھی ان مدارس سے آپ کو مل رہے ہیں یا نہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو دینی مدارس پر اعتراض کس بات کا ہے؟

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی آج ہی ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ انہوں نے وفاقی وزراء سے کہا ہے کہ سرکاری نصاب تعلیم اور نظام کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قومی کمیشن قائم کیجیے اور ہمیں اور سرکاری تعلیم کے ذمہ داروں کو اس کے سامنے پیش کیجیے۔ ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

(روزنامہ جنگ ۷ دسمبر ۲۰۰۲ء)

عطاء الحق قاسمی

مولانا زاہد الراشدی کے جواب میں

کسی بھی لکھاری کے لیے اس کے قارئین کے خطوط بہت اہم ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ کالم میں شائع بھی ہوں لیکن ان سے مسئلے کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔ گزشتہ دنوں میرا ایک کالم ''ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا'' کے عنوان سے شائع ہوا جو دینی مدرسوں اور انگریزی تعلیم کے حوالے سے مولانا زاہد الراشدی کی ایک تقریر کے حوالے سے تھا۔ مجھے مولانا کی بات میں بہت وزن محسوس ہوا تھا چنانچہ میں نے ان کے نقطہ نظر کی تائید کی۔ مجھے اس کالم پر پاکستان کے مختلف شہروں سے تائیدی ٹیلیفون موصول ہوئے تاہم ٹورنٹو (کینیڈا) سے ایک قاری انصر رضا نے مجھے اپنا موقف بذریعہ فیکس ارسال کیا جو مولانا زاہد الراشدی کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ چونکہ انصر رضا صاحب نے بھی اپنی بات سلیقے سے اور دلیل سے کی ہے، سو ان کا موقف اور اس حوالے سے میری معروضات درج ذیل ہیں:

جناب عطاء الحق قاسمی صاحب

السلام علیکم

جناب زاہد الراشدی صاحب کے جس اقتباس میں آپ کو وزن محسوس ہو رہا ہے اور جس سے آپ بظاہر متاثر ہیں، وہ خود فریبی اور تاریخی حقائق کو مسخ کر کے بلکہ یکسر چھپا کر اپنی پاکئ داماں کی حکایت کو بڑھانے کی ایک کوشش ہے۔ اس میں ایک غلط بیانی یہ کی گئی ہے کہ انگریزوں نے دینی مدارس ختم کر دیے تھے۔ میں انگریزوں کا حامی نہیں ہوں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مدرسہ دیوبند اور دارالعلوم ندوہ انگریزوں کے دور میں ان کی سرپرستی میں بنے۔ دارالعلوم ندوہ کا سنگ بنیاد یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر نے رکھا تھا، لہٰذا انگریزوں پر یہ الزام کہ انہوں نے دینی مدارس ختم کر دیے تھے، نظام

تعلیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی، بالکل غلط ہے۔ کلکتہ اور دہلی کے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی علوم پر ریسرچ اور علماء کو 'شمس العلماء' کے خطابات سے ان کی عزت و توقیر بڑھانا اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریزوں نے نظام تعلیم کو ترقی دی۔

دوسری بات یہ ہے کہ دینی اور دنیاوی علوم کی تقسیم اسلام میں کہاں جائز ہے کہ علماء اس پر راضی ہو گئے کہ ہم صرف دینی علوم پڑھیں گے اور باقی لوگ دنیاوی علوم حاصل کریں؟ ماضی کے مشہور مسلمان مفکرین اور سائنس دان دونوں علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اقتدار کا مسئلہ ہو تو سیاست دین سے الگ نہیں ہو سکتی لیکن علم سیکھنے کی بات ہو تو مشکل علوم کا بوجھ عامۃ الناس کے کندھے پر ڈال کر خود حلووں پر راضی ہو جائیں۔

جس دوسرے طبقے نے یہ نام نہاد ذمہ داری قبول کی تھی، ان کی راہ میں ان علماء نے کتنے روڑے اٹکائے اور کفر کے فتووں سے کیسی کیسی گولہ باری کی، کون نہیں جانتا؟ مشہور ترین مثال سرسید احمد خان کی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کی ٹھانی اور بدترین ظلم کا نشانہ بنے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ علمائے دین کا بنیادی کام نیکی کی دعوت اور برائی سے بچنے کی تلقین کرنا ہے۔ انہیں نوید اور وعید دونوں سنانا ہیں، لیکن ہوا یہ کہ وہ لوگوں پر صرف آگ برسانے لگے۔ اگر آپ ان کے عقائد اور قرآن و سنت کی من مانی تشریح سے متفق ہیں تو آپ پکے مومن ہیں، چاہے آپ رشوت خور ہوں، ذخیرہ اندوز ہوں، مزارعوں اور ماتحتوں پر ظلم کرنے والے ہوں، دھاندلی اور دھونس سے الیکشن جیتنے والے ہوں۔ لیکن اگر آپ ان کے مفہوم دین سے متفق نہیں تو آپ قطعی طور پر زندیق اور فاسق ہیں، چاہے آپ پنج وقتہ نمازی ہوں، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا حتی الوسع خیال رکھتے ہوں۔ قول و فعل کے اس تضاد اور اقتدار کی ہوس نے عوام کو ان علماء سے متنفر کر دیا اور یوں ایسی مسلمان امت وجود میں آئی جسے خدا ہی ملا نہ وصال صنم، نہ وہ دین کی رہی اور نہ دنیا کی۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری علمائے دین پر ہے جنہوں نے ایک طرف تو عوام کی اصلاح و تربیت سے منہ موڑ لیا اور قرآنی معارف سے نہ خود آگاہ ہوئے نہ دوسروں کو اس کا شوق دلایا اور دوسری طرف دنیاوی علوم کو بے کار کہہ کر حوصلہ شکنی کی۔

والسلام۔ انصر رضا، ٹورنٹو، کینیڈا

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ایک انگریز گورنر نے دارالعلوم ندوہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا لہٰذا ثابت ہوا کہ انگریز دینی تعلیم کے پروموٹر تھے تو یہ بات حقائق سے لگا نہیں کھاتی۔ آج اگر صدر بش واشنگٹن کے اسلامی مرکز میں جوتے اتار کر اندر داخل ہوتے ہیں اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سادہ لوحی ہوگی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔ اسی طرح انصر رضا صاحب نے مشرقی علوم کے اداروں کی سرپرستی کے حوالے سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ بھی محل نظر ہیں۔ سمجھ دار، محکوم قوم کی نفسیات سے مکمل آگاہی اور یوں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے ایسے ادارے قائم کیا ہی کرتے ہیں۔ یہ ادارے مقامی زبانوں پر دسترس حاصل کرنے کے لیے بھی قائم کیے جاتے ہیں چنانچہ امریکہ میں بھی ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ سرپرستی میں اس نوع کے ادارے قائم ہیں اور اس نوع کے ایک ادارے کے نصاب میں راقم الحروف کی تصنیفات بھی شامل ہیں۔ نیز جن علماء کو شمس العلماء وغیرہ کے خطابات دیے گئے، وہ دینی تعلیم کے حوالے سے نہیں تھے۔ ان میں سے ایک "شمس العلماء" (مولانا محمد حسین آزاد) ایک اسلامی ملک میں باقاعدہ انگریزوں کے جاسوس تھے۔

البتہ دینی تعلیم اور انگریزی تعلیم کے حوالے سے انصر رضا صاحب نے جو دوسرے نکات اٹھائے ہیں، وہ واقعی قابلِ توجہ ہیں۔ ان کا جواب مولانا زاہد الراشدی پر واجب ہے۔ یہ جواب اگر اتنا ہی مختصر ہوا جتنا انصر رضا صاحب کا خط ہے تو ان شاء اللہ انہی کالموں میں شائع ہوگا!

(روزنامہ جنگ، ۶ جنوری ۲۰۰۳ء)

عطاء الحق قاسمی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

میرے ایک کالم میں دینی مدارس کے حوالے سے مولانا ابو عمار زاہد الراشدی صاحب کا نقطہ نظر شائع ہوا تھا اور اس کے بعد ایک قاری انصر رضا صاحب کا ایک تنقیدی خط بھی کالم میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد اس موضوع کی حمایت اور مخالفت میں بے شمار خطوط موصول ہوئے اور ظاہر ہے ان سب کی اشاعت ممکن نہ تھی، چنانچہ میں نے یہ سلسلہ وہیں روک دیا۔ قاری کے تنقیدی خط کا جواب مولانا زاہد الراشدی نے دفتر کے پتہ پر ارسال کیا جو مجھے نہ مل سکا۔ اب انہوں نے دوبارہ یہ زحمت کی ہے جس کی وجہ سے یہ خط تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی موقف یہ ہے کہ دینی تعلیم دینے والے اور دنیاوی تعلیم دینے والے دونوں طبقے صرف ”ضروری صورت“ کے عالم اور دانشور پیدا کر سکے ہیں۔ دینی مدرسوں سے کوئی رازیؒ اور کوئی غزالیؒ ابھر کر سامنے نہیں آیا اور دنیاوی مدرسے ہمیں کوئی آئن سٹائن، کوئی نیوٹن نہیں دے سکے۔ دونوں نے بس ”غریبی دعوے“ والا کام کیا ہے۔ باقی رہی تنگ نظری کی بات، تو اپنے رویوں کے حوالے سے ”ملّا“ دونوں طرف موجود ہیں۔ ایک طرف دین کے نام پر شٹل کاک برقعے کو لازمی قرار دینے والے بھی ہمارے درمیان ہیں اور دوسری طرف سیکولرازم اور روشن خیالی کے نام پر ترکی میں خواتین کے اسکارف اوڑھنے پر بھی پابندی۔ یعنی ”تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا“ والی صورت حال ہے۔ بہر حال مولانا راشدی کا خط ملاحظہ فرمائیں:

”برادر محترم عطاء الحق قاسمی صاحب

آپ کے کالم میں محترم انصر رضا آف ٹورنٹو کا خط پڑھا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہمارا نقطہ نظر ’جنگ‘ کے ذریعہ ایک وسیع دائرے تک پہنچایا اور انصر رضا صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس پر ناقدانہ نظر ڈال کر بہت سے قارئین کو میری

معروضات دوبارہ پڑھنے اور مجھے کچھ مزید باتوں کی وضاحت کا موقع فراہم کیا۔

انگریزوں کی طرف سے دینی مدارس کی سرپرستی کے حوالہ سے آپ کا موقف درست ہے مگر اس میں اتنا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جارج ڈبلیو بش صرف جوتے اتار کر مساجد میں نہیں جا رہے بلکہ اخباری رپورٹوں کے مطابق امریکی حکومت نے پاکستان کے دینی مدارس کی ترقی، تعمیر اور اصلاح کے لیے ایک خطیر رقم بھی مختص کر رکھی ہے اور اس رقم کا مصرف مہیا کرنے کے لیے ہوم ورک جاری ہے۔ اسے اگر انصر رضا صاحب دینی تعلیم کی سرپرستی سمجھتے ہیں تو انہیں مبارک ہو۔ ہم دینی مدارس والے اس مہربانی کے متحمل نہیں ہیں۔

جہاں تک دیوبند کے مدرسہ کی انگریزوں کی طرف سے سرپرستی کا سوال ہے، ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں دیوبند کے مدرسے اور مکتب فکر کا تاریخی استعمار دشمن کردار اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے اور کسی منصف مزاج شخص کے لیے اس سے زیادہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ انصر رضا صاحب کی خدمت میں یہ سوال ضرور پیش کرنا چاہوں گا کہ اگر ان کے بقول انگریزوں نے دینی مدارس کو ختم کرنے اور ان کے نظام کو تلپٹ کر دینے کے بجائے ان کی سرپرستی کی تھی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے جو تعلیمی نظام اور نصاب پورے برصغیر میں رائج کیا تھا، اسے ختم کر کے اس کی جگہ نئے تعلیمی نظام کو کس نے نافذ کیا تھا؟ اگر انصر رضا صاحب نظام تعلیم کی اس تبدیلی کے محرکات اور اہم مراحل سے آگاہ کر سکیں تو ان کا ہم پر بہت کرم ہو گا۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی مدارس نے صرف دینی تعلیم پر اکتفا کیوں کیا اور دینی علوم اور دنیاوی علوم کی تقسیم کیوں کی تھی، اس کے بارے میں عرض ہے کہ دینی علوم کے وارثین نے کبھی دین و دنیا کی تقسیم نہیں کی اور نہ ہی وہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ ہاں اس دور کے معروضی حالات میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے غریبی دعوے کے ساتھ اتنا کام ہی کر سکتے ہیں اور وہ انہوں نے بحمد اللہ پورا کر دکھایا۔ یہ تقسیم علوم کا نہیں بلکہ تقسیم کار کا مسئلہ ہے اور اگر غصہ تھوک کر میری گزشتہ کالم کی معروضات پر سنجیدگی سے ایک نظر پھر ڈال لیں تو مجھے یقین ہے کہ خود انصر رضا صاحب محترم کے ذہن میں بھی یہ اشکال باقی نہیں رہے گا۔

انصر رضا صاحب نے سرسید احمد خان مرحوم کے کام میں رکاوٹ ڈالنے اور ان کی دینی تعبیرات کی مخالفت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری استدعا ہے کہ سرسید احمد خان مرحوم نے قرآن و سنت کی جس نئی تعبیر وتشریح کی داغ بیل ڈالی تھی، اس کی صرف علماء نے مخالفت نہیں کی بلکہ انہیں خود سرسید مرحوم کے رفقاء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم، شبلی نعمانی مرحوم اور ان کے دیگر معاصرین مثلاً اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی قبول نہیں کیا تھا اور ان تعبیرات وتشریحات سے کھلے بندوں براءت کا اظہار ضروری سمجھا تھا اور اس سے بڑھ کر سرسید احمد خان مرحوم کے شاگردوں میں سے بھی کسی نے دین کی اس تعبیر وتشریح کو اختیار نہیں کیا تھا۔ اگر سرسید احمد خان مرحوم کے کسی ساتھی یا شاگرد کا نام انصر رضا صاحب کو معلوم ہو کہ اس نے سرسید احمد خان کی دینی تعبیرات کو اختیار کیا تھا اور انہیں آگے بڑھانے میں دلچسپی لی تھی تو وہ اس کی نشاندہی فرما دیں۔ میں اس پر ان کا بے حد شکرگزار ہوں گا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سرسید کی مخالفت کے الزام کا نزلہ عضوِ ضعیف مولوی پر ہی کیوں گرتا ہے اور ان تعبیرات کو رد کر دینے والے دیگر حضرات انصر رضا صاحب جیسے دوستوں کو کیوں یاد نہیں رہتے؟

اس سلسلے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ علماء کرام نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ یہ بات بھی قطعی بے بنیاد اور خلاف واقعہ ہے۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا دور ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا ہے اور ان کے فتاویٰ عزیزی میں آج بھی وہ فتویٰ موجود ہے جس میں انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قرار دیا تھا جبکہ مولانا رشید احمد گنگوہی سرسید احمد خان مرحوم کے معاصرین میں سے ہیں بلکہ یہ دونوں بزرگ ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد ہیں اور مولانا گنگوہی کے فتاویٰ رشیدیہ میں بھی یہ فتویٰ موجود ہے کہ انگریزی زبان کو بطور زبان سیکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں اور یہ جائز ہے۔

انصر رضا صاحب اگر اس دور کے حالات کا مطالعہ رکھتے ہیں تو یہ بات بھی یقیناً ان کے علم میں ہوگی کہ سرسید احمد خان مرحوم نے جب علی گڑھ میں کالج قائم کیا تو اس کے شعبہ دینیات کے پہلے سربراہ مولانا عبد اللہ انصاری تھے جو بانی دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے اور انہیں خصوصی فرمائش پر علی گڑھ بھیجا گیا تھا۔ انہی مولانا عبد اللہ انصاری کے فرزند مولانا محمد میاں انصاری ہیں جنہوں نے راجہ مہندر پرتاب،

پروفیسر برکت اللہ بھوپالی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے ساتھ مل کر آزادی ہند کے لیے جاپان، جرمنی اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ رابطے کر کے آزاد ہند گورنمنٹ کی بنیاد رکھی تھی اور جلاوطنی کی حالت میں کابل میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

ان حالات میں بھی اگر انصر رضا صاحب کو یہی نظر آتا ہے کہ علماء نے سر سید احمد مرحوم کے کام میں روڑے اٹکائے تھے، انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی، خود انگریز کی سرپرستی میں مدرسے چلائے تھے اور وہی ساری قوم کی سب خرابیوں کے ذمہ دار ہیں تو ہم فقیر لوگ ان کے لیے دعائے صحت ہی کر سکتے ہیں۔

میں ایک بار پھر آپ کا شکر گزار ہوں لیکن کالم کی تنگ دامنی کے شکوہ کے ساتھ کہ بہت سی اور ضروری باتیں بھی اس خط میں شامل کرنا چاہتا تھا مگر.......“

(روزنامہ جنگ، لاہور)

ڈاکٹر عبد الخالق صاحب کا مکتوب گرامی

محترمی و مکرمی مولانا زاہد الراشدی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی

آپ سے تعارف خاصا پرانا ہے۔ آپ کی تحریر اور تقریر کی صلاحیت کا معترف بھی ہوں اور مداح بھی۔ ندائے خلافت کے تازہ شمارہ نمبر ا مؤرخہ ۸ جنوری ۲۰۰۳ء میں آپ کے مضمون ''قصور وار کون؟'' نے اتنا متاثر کیا کہ آپ سے تحریری رابطہ کرنے پر مجبور ہو گیا، حالانکہ میں تحریر کا کافی ''چور'' واقع ہوا ہوں۔ ٹیلی فون پر یا بالمشافہ ملاقات مجھے آسان محسوس ہوتی' بہ نسبت تحریر کے۔

مولانا! آپ نے آج کے جدید علوم کے علمبردار طبقہ کو بہت ہی مدلل اور مؤثر جواب دیا ہے اور باوجود اس کے کہ میں نہ عالم دین ہوں اور نہ کسی روایتی مدرسے سے تعلیم یافتہ بلکہ علم کے نام پر زیادہ تر ان ''نام نہاد جدید تعلیمی اداروں'' ہی سے استفادہ کیا ہے جن پر آپ نے تنقید کی ہے، اس کے باوجود مجھے آپ کی تحریر پسند آئی ہے۔

لیکن مولانا! آپ سے کچھ ''آپس کی بات'' کرنے کو بھی دل چاہتا ہے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ کی یہ تحریر جدید علوم کے علمبردار طبقے پر ''ایک الزامی جواب'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے بقول علامہ اقبال

کہا اقبال نے شیخ حرم سے تہہ محراب مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون؟

یہ بات درست ہے کہ جدید علوم کے نام پر اتنے وسائل خرچ کرنے (جن میں سب سے زیادہ حکومتی وسائل ہی خرچ ہوتے ہیں) کے باوجود ہم ٹیکنالوجی کے میدان میں اتنے پیچھے کیوں ہیں؟ اور

آپ نے اس پر جدید علوم کے علمبرداروں اور مسلمان حکومتوں اور مسلمان حکمرانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اس کے مقابلے میں دینی علوم کے علمبرداروں نے باوجود وسائل کی کمی اور نامساعد حالات کے قرآن و حدیث کے علم کا سلسلہ جاری رکھا اور آج نہ کسی خطیب کی کمی ہے اور نہ حافظ قرآن کی۔

مولانا! آپ نے جدید ٹیکنالوجی میں مہارت کے مقابلے میں عام دینی تعلیم کا حوالہ دے دیا۔ جدید تعلیم میں مہارت کے مقابلے میں تو دینی علوم میں مہارت کی مثال پیش کی جانی چاہیے تھی۔ جہاں تک عام مروجہ تعلیم کا تعلق ہے، اس کے ذریعے مروجہ حکومتی نظام چلانے والے کارندوں کی ضرورت ہے جو بحسن و خوبی پوری ہو رہی ہے۔ جہاں تک عام ٹیکنیکل علم و مہارت کا تعلق ہے، اس میں تو کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاں البتہ جہاں تک جدید ٹیکنالوجی اور اس میں تحقیق اور ایجادات اور اس میں مہارت کا تعلق ہے، قریباً تمام ہی مسلمان ممالک اس میں ''پھسڈی'' ہیں۔ صرف ایک استثنا ہے کہ پاکستان نے کم از کم ایٹمی ٹیکنالوجی میں تو وہ ترقی کی ہے جس کا اعتراف ہمارا دشمن اور مغرب بھی کرنے پر مجبور ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ مہارت بھی ہمیں اللہ تعالیٰ نے خالصتاً معجزانہ انداز میں عطا فرما دی ہے، بغیر کسی باقاعدہ منصوبہ بندی اور علم و تحقیق میں عمومی ترقی کے۔ اب آئیے دینی علم کی طرف۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام دینی علوم کی ترویج کا سلسلہ جاری رہا ہے لیکن جدید ٹیکنالوجی میں مہارت کے مقابلے میں دینی حلقوں نے کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق دین کو کس نے اور کہاں پیش کیا ہے؟

بعض خود ساختہ شرائط کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ ہم نے بند کر رکھا ہے۔ طبقہ علماء میں کوئی ایسی قیادت ابھر کر آئی ہے جس نے واقعتاً مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا ہو؟ پوری امت مسلمہ ''ایک امام'' سے محروم ہے۔ بلکہ برا نہ مانیے، اس عام دینی علم نے جہاں خطیب اور حافظ فراہم کیے ہیں، وہیں بدترین قسم کی فرقہ بندی اور فرقہ پرستی بھی اسی طبقے سے ابھری ہے اور دین کے غلط تصورات کو بنیاد بنا کر تخریب کاری اور دہشت گردی کی ترویج کا باعث بھی یہی طبقہ بنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام طبقات ایسے نہیں ہیں لیکن جو ہیں، ان کا بھی تعلق تو اسی طبقے سے ہے نا!

میں تو محسوس کرتا ہوں کہ: ع 'ہم الزام ان کو دیتے ہیں قصور اپنا نکل آیا'۔

۵۶ کے قریب مسلمان ملکوں میں کہیں بھی طبقہ علماء نے دین کو بطور نظام زندگی برپا کرنے کی کوئی

سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ دورِ جدید میں اسلامی فلاحی ریاست کے قیام، کہ جس کے ذریعے ہم اسلام کے زریں اصولوں اخوت و مساوات اور عدل و قسط کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتے، میں ہم ناکام رہے ہیں۔ (ایران میں اسلامی نظام کے نام پر جو کچھ ہوا، اس میں معاشرتی سطح پر تو تبدیلی آئی لیکن معاشی سطح پر سود اور جاگیرداری نظام جاری ہے اور سیاسی سطح پر قرآن و سنت کی بجائے ''رہبر'' کی بالادستی کا طوق بھی موجود ہے۔ گویا فلاحی ریاست کا تصور وہاں بھی عنقا ہے۔) بلکہ افسوس تو یہ ہے کہ اس کی اہمیت کا احساس بھی ہمارے طبقہ علماء کے بیشتر حصے میں موجود نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اگر ہم اپنے معاملات میں خود مختار ہوتے تو یہ جدید ٹیکنالوجی بھی ہمارے ہاتھ میں ہوتی اور اسے ہم اپنی مرضی سے استعمال کرتے، کجا یہ کہ ہم خود اغیار کے زیر تسلط ہیں۔ کرنے کا اصل کام تو دینی حلقوں نے بھی نہیں کیا۔

بری الذمہ کوئی بھی نہیں! ہم سب ''قصوروار'' ہیں۔

والسلام، ڈاکٹر عبدالخالق
ناظم نشر و اشاعت تنظیم اسلامی
۹ جنوری ۲۰۰۳ء

جناب آفتاب عروج کا مکتوب گرامی

۱۵/ مارچ ۲۰۰۳ء

مکرم و محترم جناب ابو عمار مولانا زاہد الراشدی صاحب

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ قاسمی صاحب سے رابطہ کے بعد آپ کا ڈاک کا پتہ دستیاب ہوا۔ انہی کی حوصلہ افزائی سے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ عرض حال یہ کہ یہ دور دلیل و برہان، حقائق و واقعات کا دور ہے۔ جذباتیت، اشتعال انگیز تقاریر و بیانات سے حقائق تبدیل نہیں ہوا کرتے۔ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے ہمیں اپنی اصلاح کے لیے اپنی غلطیوں، فروگزاشتوں کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد گزشتہ غلطیوں سے اجتناب کے عہد صمیم کے بعد نہایت خلوص دل کے ساتھ صراط مستقیم پر سفر زندگی کا آغاز کر کے ہی ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کو حاصل کر سکتے ہیں۔

مسلم امہ، اگر کہیں ہے، تو اس کا جاہ و جلال، اقتدار و تمکنت کیوں چھن گیا؟ اس تالے کی کلید کہاں کھو گئی؟ اس کا کھوج لگانے کی اشد ضرورت ہے۔ اسباب زوال امہ تو بے شمار ہیں لیکن سر دست ہمیں فوری طور پر درج ذیل اقدامات سے آغاز کرنا ہوگا: ۱۔ ہمیں مسٹر اور ملا کی تخصیص ختم کر دینی چاہیے، ۲۔ دینی اور دنیاوی تعلیم کے خانے ختم کرنا ہوں گے، ۳۔ فرقہ واریت کی غیر اسلامی آہنی دیواریں مسمار کرنا ہوں گی، ۴۔ ہمیں مکالمہ و برداشت کے بند دروازے کھولنا ہوں گے۔ جیسا کہ آپ نے ایک نکتہ اٹھایا ہے، اس طرح آپ جیسے دوسرے ہمدرد دین و ملت اصحاب کو بھی موقع دیا جانا چاہیے تاکہ وہ بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں۔ اس طرح ہم اپنے مستقبل کی راہ کا تعین کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ اس مسئلہ کو مملکتی سطح پر زیر بحث لانے کے لیے آپ کی سربراہی میں ایک ادارہ جس کا نام بھی میں تجویز کیے دیتا ہوں، ”ادارہ مکالمہ و برداشت بین المسلمین“ تشکیل دیا جا سکتا

ہے۔

دوران تحریر اگر کسی مقام پر سوءادب کا مرتکب ہوا ہوں تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ کی دعاؤں کا طلب گار

آفتاب عروج

آفتاب عروج

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا؟

مورخہ ۷ ۲ دسمبر ۲۰۰۲ء کو اپنے کالم ”ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا“ میں آپ مولانا زاہد الراشدی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ صحیح مولوی کا وژن بہت وسیع اور اس کا طرز استدلال بڑے بڑے بزر جمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے آپ اپنی اس دلیل کے حق میں کسی ایک مولوی کی وسیع النظری اور اس کے طرز استدلال کی کوئی ایک مثال بیان کرتے۔ اس کے بعد آپ زاہد الراشدی کی ہم نوائی کرتے تو بات جچتی اور سمجھ میں آتی۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ کیا مصلحت تھی؟ کیوں نہیں کیا؟

میں نے آپ کے اور مولانا زاہد الراشدی کے نقطہ نظر کو تاریخی اور قرآنی حوالہ سے رد کیا ہے۔ اس پر آپ اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے۔ میں آپ کو اور مولانا زاہد الراشدی اور ہر اس شخص کو جس کے دل میں انصاف کی ایک رتی بھی موجود ہے اور ضمیر نام کی کوئی چیز وہ اپنے پاس رکھتا ہے، دعوت دیتا ہوں کہ آپ سنجیدگی سے اس بات کا جائزہ لیں کہ امت کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں محرومی کا ذمہ دار کون ہے؟ میرے ان دلائل کی تردید آپ کے اور مولانا زاہد الراشدی کے ذمہ ہے۔ میں منتظر رہوں گا۔

گزشتہ صدی میں ایک شخصیت ہو گزری ہے جنہیں ہم علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔ انہوں نے بھی مولوی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

مکتب و ملا و اسرار کتاب\
کور مادر زاد و نور آفتاب

تاریخ کی چند کتب اس ناچیز کے بھی زیر مطالعہ رہی ہیں۔ مسلم امہ کی معلوم تاریخ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں مولوی کو اسلامی انقلاب برپا کرتے نہیں دیکھا۔ آپ کی یہ دلیل درست نہیں کہ صحیح مولوی

کا استدلال بڑے بڑے بزر جمہروں کا منہ بند کرنے والا ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب! مولوی کا علم قولی و نقلی ہوتا ہے۔ دلیل و برہان، تحقیق و جستجو، جدت و اختراع، روشن خیالی اس کے نصاب میں شامل نہیں۔

زاہد الراشدی صاحب کا ۱۸۵۷ء سے دو طبقات کا مفروضہ تاریخ سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ مسلم امّہ میں جتنے بھی سائنس دان ہو گزرے ہیں، ان میں کوئی بھی مولوی نہ تھا اور نہ ہی ان میں کوئی انگریزی جانتا تھا۔ لیکن انہوں نے تاحیات تحقیق و جستجو کے قرآنی حکم کو اپنا فریضہ زندگی سمجھ کر جاری رکھا۔ مصر فتح ہوا تو ہمارے سائنس دان منجنیق اور نیپام میزائل تیار کر چکے تھے۔ تمام عیسائی حکومتیں متحد ہو کر بھی مسلمانوں کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ یہ تمام محققین و سائنس دان آخری عباسی خلیفہ معتصم کے دور تک کے ہیں۔ تیرہویں صدی عیسوی کے بعد مسلم امہ کا سائنسی اور تحقیقی آفتاب علم غروب ہونا شروع ہو گیا اور چودھویں صدی عیسوی تک بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کی سات آٹھ صدیاں مولانا زاہد الراشدی صاحب کہاں رہے اور کیا کرتے رہے جبکہ برصغیر میں سیاسی طاقت بھی آپ کے ہاتھ میں تھی؟

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاحبان علم دانش کو کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب دوسروں کو الزام دینے کی بجائے اس دعوت قرآنی سے استفادہ کر لیتے تو انہیں اپنی ذمہ داری سے فرار کا راستہ اختیار نہ کرنا پڑتا۔ قاسمی صاحب کی ہم نوائی بڑی معنی خیز ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں بیسیوں آیات موجود ہیں لیکن کوئی پڑھے اور تدبر کرے تو۔ ایک دو آیات درج ذیل ہیں:

> ”اور اس کے نشانات اور تصرفات میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لیے ان باتوں میں بہت نشانیاں ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے اور کہتے ہیں کہ پروردگار تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔ تو قیامت کے دن ہمیں دوزخ سے بچائیو۔ (۱۹۱: ۳، ۱۹۲)

اس آیت کے الفاظ ”دوزخ سے بچائیو“ کی یہی صورت تھی کہ مولانا زاہد الراشدی مندرجہ قرآنی ہدایات پر عمل کرتے اور عقل و دانش کو کام میں لا کر تسخیر کائنات کے علوم میں مہارت حاصل کر کے

زندہ قوموں میں شمار ہوتے تو آج انہیں اس فریب میں مبتلا نہ ہونا پڑتا کہ ہم ملک میں قرآن و سنت کی راہنمائی دے رہے ہیں۔

کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس سے استفادہ کرنا نہ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ زندگی کی دوڑ میں جو انسان، گروہ یا قوم اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے آپ کو قانون خداوندی اور قانون فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے ہیں، وہی لوگ اللہ کی نعمتوں، سرفرازیوں، شادابیوں کے حق دار ٹھہرائے جاتے ہیں اور دنیا کی امامت انہیں کے حصے میں آتی ہے۔ بخشیش کی جنت خدا کسی کو بھی نہیں دیتا۔

"خدا کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ نہیں دے گا۔" (۱۴/۱۴۱)

"دیکھو بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔ اگر تم مومن صادق ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔" (۳/۱۳۹)

اللہ تعالیٰ نے کافروں پر غلبہ کے لیے مومن صادق کی شرط عائد کر دی ہے اور اس میں دیگر احکامات کے ساتھ ۳۲/۳۰ اور ۱۹۲،۱۹۱/۳ کی شرط بھی شامل ہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، لگ بھگ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلم امہ کا سائنسی اور تحقیقی زوال شروع ہو چکا تھا اور اس سائنسی تحقیقی علم کی شمع مغرب کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ بغداد جو اس وقت مسلم امہ کا دارالخلافہ تھا، مناظروں، مناقشوں اور نظری بحثوں کا اکھاڑا بن چکا تھا۔ عسکری قوت ختم ہو چکی تھی۔ پھر چنگیز خان آئے، ہلاکو خان آئے، بڑی لمبی دردناک داستان ہے اور پھر آخر میں وہ آئے جو ہم سے ہماری میراث لے گئے۔ پھر انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے کیا تھا۔ یہ ان کا حق تھا جو انہوں نے حاصل کر لیا۔ اب امریکہ اپنا حق وصول کر رہا ہے تو مولانا زاہد الراشدی صاحب فریاد کناں ہیں اور انصاف کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

اب ہم آتے ہیں ۱۸۵۷ء کی طرف کیونکہ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے اپنا سوال ۱۸۵۷ء سے ہی اٹھایا ہے۔ جب ۱۸۵۷ء میں روایتی سیاسی و مذہبی قیادت ناکام ہو گئی تو مسلمانوں میں شدید اضطراب، خوف، بے دلی و سراسیمگی پیدا ہو چکی تھی۔ ان حالات میں مسلم قوم کے دردمند غیر روایتی اہل علم و دانش مل بیٹھے اور پیش پا حالات پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ حالات میں عسکری قوت سے آزادی کا حصول ممکن نہیں، لہٰذا ہمیں اپنی حکمت عملی میں واضح اور نمایاں تبدیلی کی

ضرورت ہے۔ حصول آزادی کی موجودہ کوشش کچھ عرصہ کے لیے مؤخر کرنا پڑے گی اور جس ہتھیار سے انگریزوں نے ہمیں غلام بنایا ہے، اسی ہتھیار سے ہمیں بھی لیس ہونا پڑے گا۔ یعنی انگریزی زبان و دانش اور سائنسی علوم پر دسترس و آگہی۔ مزید یہ کہ اسلام کی تعبیر کو بھی بدلتے زمانے کے ساتھ متحد و ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ ان احباب علم و دانش نے علی گڑھ کے مقام سے اس علمی تحریک کا آغاز کر دیا اور متذکرہ مقاصد کے حصول کی خاطر مختلف مقامات پر اسکول و کالج اور سائنٹفک سوسائٹیز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ گویا یہ شعور و آگہی میں انقلاب برپا کرنے کی ابتدا تھی۔ اس تمام سوچ اور فکر و حکمت عملی کی منصوبہ سازی کے روح رواں سر سیّد احمد خاںؒ تھے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں روایتی سیاسی و مذہبی قیادت اور سر سیّد احمد خاں کی فکر و حکمت عملی میں تضاد کی خلیج پیدا ہوگئی جسے مولانا زاہد الراشدی صاحب انتہائی سادگی سے دو طبقات پر محمول کر بیٹھے جو واقعتاً غلط ہے۔ شکست خوردہ روایتی سیاسی و مذہبی قیادت نے کبھی بھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا اور وہ حصول آزادی کے اپنے فرسودہ طریق کار پر نہ صرف بضد رہے بلکہ اسے مبنی بر حق سمجھتے رہے۔ اس کا ثبوت تحریک خلافت اور ریشمی رومال ایسی تحریکیں ہیں جو ۱۹۱۵ء تک چلتی رہیں۔

تحریک علی گڑھ اور روایتی سیاسی و مذہبی قیادت میں جو فکری و عملی تضاد تھا، اب شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گیا جس کے نتیجہ میں سر سیّد احمد خانؒ کو کافر، ملحد، زندیق، بے دین، نیچری کے فتووں کی شکل میں گالیاں دی گئیں۔ ان کی تضحیک کی گئی۔ دیوبند کی بنیاد اسی نفرت اور تضاد فکر کا نتیجہ تھی۔ وہ نفرت مولانا زاہد الراشدی کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی پاکستان میں دیوبند کے سرخیل مولانا مفتی محمود اور ان کے خلف الرشید مولانا فضل الرحمٰن اب بھی پاکستان کو گالی دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کی دین سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے تمام علماء اور مفتی صاحبان مل کر بھی نہیں بتا سکتے کہ 'مسلم' کسے کہتے ہیں۔

پاکستان کا وجود روایتی سیاسی و مذہبی قیادت کی ناکامی اور تحریک علی گڑھ کی کامیابی کا ثمر ہے جس نے غیر روایتی اور غیر مذہبی لیکن بنیادی اسلامی نظریے کی حامل قیادت علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح جیسی عظیم لیڈر شپ قوم کو عطا کی جنہوں نے محض اپنی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی سے وہ بازی جیت لی جو روایتی مسلمان حکمران اور علماء ہار چکے تھے، اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا۔ ناممکن کو

ممکن بنادیا اور مولانا زاہد الراشدی کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کرلیا۔

آج ماشاء اللہ پاکستان پچپن برس کا ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق پچپن برس پچپن دن شمار ہوتے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک پچپن سال میں وجود میں نہیں آئے اور نہ پچپن سال میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرسکے۔ قوموں کے عروج وزوال صدیوں پر محیط ہوتے ہیں اور بے شمار ریاضتوں اور قربانیوں کے بعد ترقی حاصل ہوتی ہے۔

یہ جدید علوم پر دسترس رکھنے والوں ہی کا کمال ہے کہ پاکستان ایک ایٹمی طاقت بن چکا ہے اور جدید میزائل ٹیکنالوجی پر دسترس حاصل کرچکا ہے۔ جب پاکستان بنا تو ہمارے پاس ایک بندوق تک نہ تھی، فوج نہیں تھی، ائرفورس نہیں تھی، نیوی نہیں تھی، حتیٰ کہ پاکستان بن جانے کے بعد جو انتظامیہ ہمارے حصے میں آئی، انہیں تنخواہ دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اب ہم روایتی اسلحہ میں نہ صرف خود کفالت حاصل کرچکے ہیں بلکہ برآمد بھی کررہے ہیں۔ ہمارے پاس اسٹیل ملز ہیں، ہماری بہادر افواج ہیں، ایئرفورس ہے جو اپنا لوہا منوا چکی ہے، نیوی ہے، ہماری سول ایئرلائن ہے، ہماری صنعت ہے، انڈسٹری ہے، ہمارے کالج ہیں، یونیورسٹیاں ہیں، میڈیکل کالج ہیں جہاں ہم اپنے طالب علموں کو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم سے آراستہ کررہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں سے تحصیل علم کے بعد ملک میں اور بیرون ملک ہمارے نوجوان ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس دان اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ جدید علوم سے آراستہ ماہرین نے جو ذمہ داریاں قبول کی تھیں، وہ بحسن و خوبی پوری کررہے ہیں لیکن صدیوں کا خلا پچپن دن میں پورا ہونا قانون خداوندی کے خلاف ہے۔ پاکستان پائندہ باد۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

ابو عمار زاہد الراشدی

خطوط و مضامین میں اٹھائے گئے اہم نکات پر ایک نظر

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب، محترم انصر رضا صاحب، محترم ڈاکٹر عبد الخالق صاحب اور محترم آفتاب عروج صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس بحث میں حصہ لیا اور ایک اہم ملی اور قومی مسئلہ پر اپنے خیالات وارشادات کے ساتھ ہماری راہنمائی فرمائی۔ ان میں سے بہت سے اہم امور پر گزشتہ گزارشات میں ضروری بات ہو چکی ہے البتہ کچھ نکات پر اظہار خیال کی گنجائش موجود ہے جن کے بارے میں چند معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

محترم عطاء الحق قاسمی سے صرف یہ شکایت ہے کہ انہوں نے غریبی دعویٰ میں دونوں طبقات کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے حالانکہ ایک طرف عصری نظام تعلیم کی پشت پر پوری ریاستی مشینری اور وسائل چلے آ رہے ہیں اور دوسری طرف دینی مدارس کا سارا نظام زکوٰۃ و صدقات، چرم ہائے قربانی اور عوامی چندہ پر چلتا ہے۔ اس کے باوجود یہ دونوں غریبی دعوے میں محترم قاسمی کی نظر میں برابر ہیں تو.........۔

ڈاکٹر عبد الخالق صاحب نے فرمایا ہے کہ دینی مدارس نے عام دینی تعلیم تو دی ہے مگر ماہرین پیدا نہیں کیے۔ میرا خیال ہے کہ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا غلام محمد گھوٹویؒ، پیر سید مہر علی شاہ گولڑویؒ بلکہ غیر روایتی حلقوں کے حوالہ سے مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور ان جیسے بیسیوں شہرۂ آفاق علماء انہی دینی مدارس کی پیداوار ہیں جن کی علمی مہارت اور خدمات کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب محترم کی معلومات اس سے مختلف ہوں تو ہم ان کے اظہار کا خیر مقدم کریں گے۔

آفتاب عروج صاحب نے میری اس گزارش کو رد کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد قوم تعلیمی اور فکری حوالہ سے دو طبقات میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہ فرماتے ہیں: ''زاہد الراشدی صاحب کا ۱۸۵۷ء سے دو طبقات کا مفروضہ تاریخ سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔'' مگر اسی مضمون میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ: ''روایتی سیاسی و مذہبی قیادت اور سرسید احمد خان کی فکر و حکمت عملی میں تضاد کی خلیج پیدا ہو گئی۔'' اور پھر وہ اپنے مکتوب گرامی میں یہ مشورہ بھی دے رہے ہیں کہ ''ہمیں مسٹر اور ملا کی تخصیص ختم کر دینی چاہیے۔'' میرا خیال ہے کہ اس کے بعد مجھے اپنا موقف دہرانے اور اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

آفتاب عروج صاحب نے فرمایا ہے کہ عباسی خلیفہ معتصم باللہ تک مسلمانوں میں سائنسی ترقی اور تحقیق و ریسرچ میں پیشرفت کا دور تھا، اس کے بعد زوال کا آغاز ہو گیا۔ انہیں شکایت ہے کہ مولوی اس سے قبل بھی سائنس دانوں کی صف میں نظر نہیں آتا اور اس کے بعد بھی سائنسی ترقی اور تحقیق و ریسرچ میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ یہ درست ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سائنسی ترقی اور اس کے لیے تحقیق و ریسرچ مولوی کے فرائض میں کب شامل تھی اور اس نے کب اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا؟ یہ قطعی طور پر غیر منطقی بات ہے۔ ہر قوم میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ ہر طبقہ اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے اور پوری ملی جدوجہد میں مجموعی طور پر شریک سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو زوال کا شکار ہیں اس لیے ایک دوسرے پر اس کی ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جن اقوام نے سائنس میں ترقی کی ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں بالادستی کے باعث وہ ہماری قسمت کی مالک بھی بن بیٹھی ہیں، ان میں بھی سائنس کے شعبے میں صرف سائنس دانوں نے ہی کام کیا ہے۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ برطانیہ میں جتنے سائنس دان گزرے ہیں یا موجود ہیں، ان میں ایک بھی جسٹس نہیں ہے اس لیے برطانیہ کے ججوں کا سائنسی ترقی میں کوئی کردار نہیں ہے تو آفتاب عروج صاحب ہی فرمائیں کہ وہ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟

اصل قصہ صرف یہ ہے کہ ہمارے مہربانوں نے تاریخ میں یہ پڑھ رکھا ہے کہ یورپ میں جب سائنسی ترقی اور تحقیق و ریسرچ کا دور شروع ہوا تو عیسائیوں کی مذہبی قیادت نے اس کی مخالفت کی۔ سائنس دانوں کو گمراہ قرار دیا گیا، ان پر فتوے لگائے گئے اور ان میں سے بہت سوں کو گردن زدنی قرار

دے دیا گیا۔ ہمارے مہربان دوستوں نے معروضی حقائق کا جائزہ لیے بغیر مسلمانوں کے مولوی کو بھی عیسائیوں کے پادری پر قیاس کر لیا ہے اور لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑ پڑے ہیں حالانکہ مولوی غریب نے کبھی سائنس اور اس میں تحقیق و ریسرچ کی مخالفت نہیں کی اور اس کے ثبوت میں دور جانے کے بجائے صرف ایک بات پر غور کر لیا جائے تو بات واضح ہو جائے گی کہ ماضی قریب میں پاکستان کے لیے ایٹمی ٹیکنالوجی کو ضروری قرار دینے اور عالم اسلام کو ایٹمی قوت کے حصول پر ابھارنے میں مختلف حلقوں کی طرف سے اٹھنے والی آوازوں میں سے سب سے بلند آواز مولوی کی تھی اور اس قوت کے تحفظ و بقا کے لیے بھی سب سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ مولوی ہی آواز اٹھا رہا ہے۔

آفتاب عروج صاحب نے مولوی کے ذمہ اس الزام کو دہرانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ اس کی مخالفت کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا، اس لیے مولوی نے شکست کھائی ہے اور اسے ہمیشہ کے لیے عملی میدان سے آؤٹ ہو جانا چاہیے مگر یہ الزام بار بار دہرانے والے دیگر حضرات کی طرح انہوں نے بھی یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ پاکستان کے قیام و حصول میں علامہ اقبال اور قائداعظم کی جدوجہد کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس میں بھی مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الحامد پیر آف مانکی شریف اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی جیسے بڑے بڑے مولوی ان کے ساتھ شریک تھے اور اس تاریخی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اگر یہ مولوی تحریک پاکستان کا ہراول دستہ نہ بنتے تو تحریک پاکستان کے عملی نتائج قطعی مختلف ہوتے۔

آفتاب عروج صاحب نے مجھ غریب پر بھی کرم فرمائی کی ہے کہ مولانا زاہد الراشدی کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری تاریخ ولادت ۲۸/ اکتوبر ۱۹۴۸ء ہے اور جب قیام پاکستان کی حمایت و مخالفت کی برصغیر کے طول و عرض میں معرکہ آرائی ہو رہی تھی تو دنیائے وجود میں اس وقت میرا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔

ان گزارشات کے بعد ایک اصولی بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جس کا حوالہ محترم ڈاکٹر عبد الخالق صاحب اور محترم آفتاب عروج صاحب دونوں نے دیا ہے کہ غلطیاں ہر طرف سے ہوئی ہیں اور کوئی بھی ان سے مبرا نہیں ہے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے۔ ہمیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف میں کبھی حجاب نہیں رہا۔ الشریعہ اور اس کے علاوہ روزنامہ پاکستان، روزنامہ اوصاف اور

روزنامہ اسلام میں شائع ہونے والے میرے مضامین کے قارئین گواہ ہیں کہ اپنے حلقہ اور طبقہ کی غلطیوں کی نشاندہی، اعتراف اور اصلاح احوال کی تجاویز سامنے لانے میں ہم نے حتی الوسع گریز نہیں کیا، البتہ یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ ناکردہ گناہ ہمارے سر نہ تھوپے جائیں اور کسی بھی حوالہ سے ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے قبل ہم سے ہمارا موقف ضرور معلوم کر لیا جائے۔ یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ ہمارے معترضین ہمارا موقف و کردار بھی خود طے کریں، اس پر گواہی بھی اپنی ڈال دیں اور پھر منصف کا منصب سنبھال کر فیصلہ بھی خود ہی صادر فرما دیں۔ ہم اس طرح گردن زدنی قرار پانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ باقی رہی بات مکالمہ اور گفت و شنید کی تو اس کے لیے ہم ہر وقت حاضر ہیں۔ اس کے لیے کوئی الگ فورم قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ مسائل پر اس طرح کھلے دل کے ساتھ مختلف دانشوروں کا اظہار خیال ہی اس کام کے لیے سب سے موزوں فورم ہے۔ 'الشریعہ' اس کے لیے اس سے قبل بھی ہمیشہ حاضر رہا ہے اور اب بھی یہ خدمت سرانجام دیتے ہوئے اسے خوشی محسوس ہوگی۔

(ماہنامہ الشریعہ، مئی ۲۰۰۳ء)

تکملہ ۲

عصری مدارس میں دینی تعلیم اور بین الاقوامی لابیاں

عالمی طاقتیں اور نصاب تعلیم

نصاب تعلیم کا مسئلہ آج سے نہیں، صدیوں سے مغربی اقوام کے لیے درد سر بنا ہوا ہے۔ ایک تاریخی روایت ہے کہ برطانیہ کے وزیراعظم گلیڈ اسٹون نے آج سے کوئی سو برس قبل برطانوی پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر قرآن کریم کا نسخہ لہراتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب مسلمانوں میں پڑھائی جاتی رہے گی، اس وقت تک مسلمانوں میں مذہبی جنون (جہاد) باقی رہے گا اور جب تک مسلمانوں میں مذہبی جنون موجود رہے گا، تب تک انہیں غلام رکھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ روایت معلوم نہیں کہاں تک درست ہے، مگر حقائق کے اعتبار سے اس کی واقعیت میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جو مسلمان ایک دفعہ قرآن کریم کے مضامین سے اجمالی طور پر بھی واقف ہو جاتا ہے، اسے اسلام سے ہٹانا اور کفر کی کسی بات سے سمجھوتے اور مفاہمت کے لیے تیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ گزشتہ دنوں ایک محفل میں چند دوست حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کیے جانے والے مجوزہ دینی مدارس کے بارے میں بات کر رہے تھے اور کچھ خدشات کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ سرکاری خرچ سے پڑھایا جائے یا غیر سرکاری خرچ سے، اگر یہی قرآن کریم پڑھایا جائے گا تو عقیدہ و فکر کے اعتبار سے نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہو گا اور قرآن کریم اپنے پڑھنے والوں کے دماغوں پر یکساں اثرات قائم کرے گا۔

تحریک آزادی کے ممتاز رہنما مولانا محمد علی قصوریؒ کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی ندوۃ العلماء لکھنو کے سربراہ تھے، انہی دنوں یوپی کے انگریز گورنر سر جان ہیرٹ نے انہیں بلا کر پیشکش کی کہ اگر ندوہ کے نصاب میں حدیث رسول کو لازمی کے بجائے اختیاری مضمون قرار دے دیا جائے اور قرآن کریم کی تعلیم کے نصاب سے سورہ انفال، سورہ توبہ، سورہ ممتحنہ اور سورہ صف کو نکال دیا جائے تو انگریزی حکومت ندوۃ العلماء لکھنو کو ایک لاکھ روپے سالانہ گرانٹ دینے کے لیے تیار ہے، مگر مولانا شبلی نعمانی نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا شبلی نعمانی کا انتقال

۱۹۱۴ء میں ہوا تھا اور یہ اس سے پہلے کا قصہ ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ اس وقت کے ایک لاکھ روپے آج کے حساب سے کتنی رقم بنتی ہوگی اور انگریز حکمران ان معاملات میں کس قدر حساس اور سنجیدہ تھے۔

انگریز حکمرانوں کے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ ''درس نظامی'' کے جس نصاب و نظام کو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد یکسر ختم کر دیا تھا اور اس نظام کو چلانے والے ہزاروں مدارس بند کر کے ان کی جائیدادیں اور بلڈنگیں ضبط کر لی تھیں، وہ چند درویش صفت علماء کی مخلصانہ جدوجہد کی بدولت ایک متوازی نظام کی صورت میں نہ صرف قائم رہا بلکہ دن بدن ترقی کرتے ہوئے دنیا کی تمام استعماری قوتوں کے لیے ایک علمی اور فکری چیلنج کی حیثیت اختیار کر گیا۔

دوسری طرف سر سید احمد خان مرحوم نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی بنیاد پر جس جدید نظام تعلیم کی بنیاد رکھی تھی اور فکر کی آزادی کے نام پر قرآن و سنت کی نت نئی تعبیرات و تشریحات کا جو بیڑا اٹھایا تھا، وہ عام مسلمانوں کو ہضم نہ ہوا اور جدید تعلیم کا نظام راسخ العقیدہ اور دین دار مسلمانوں کے تعاون کے بغیر آگے بڑھتا نظر نہ آیا، اس لیے وہاں بھی مذہبی معاملات کی باگ ڈور ہر دور میں علماء ہی کے ہاتھ میں دینا پڑی جس کی وجہ سے علی گڑھ کا نظام تعلیم جدید تعلیم کا مرکز تو بن گیا مگر اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کا فلسفہ اس نظام میں ایڈجسٹ نہ ہو سکا۔ اس طرح اس جدید نظام تعلیم میں بھی دین اسلام کی جو تھوڑی بہت تعلیم شامل کی بھی گئی، وہ سر سید کے فلسفے کے بجائے علماء کرام اور امت کے اجماعی عقیدہ و تعامل کے مطابق تھی اور اس کو پڑھانے اور چلانے کے لیے بھی علماء کے روایتی طبقہ سے افراد کار فراہم کیے گئے، چنانچہ علی گڑھ محمڈن کالج میں، جو بعد میں یونیورسٹی کہلایا، شعبہ دینیات کے پہلے سربراہ حضرت مولانا عبد اللہ انصاریؒ تھے جو دار العلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد اور اپنے وقت کے بڑے عالم دین تھے۔ انہی مولانا عبد اللہ انصاریؒ کے بیٹے مولانا منصور انصاریؒ تحریک آزادی میں امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے دست راست تھے۔ مولانا منصور انصاریؒ کے فرزند مولانا حامد انصاری معروف کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' کے مصنف ہیں اور ان کے بیٹے ڈاکٹر عابد اللہ غازی آج کل شکاگو (امریکہ) میں اسلامی تعلیمات کے ایک بڑے پراجیکٹ کے نگران ہیں۔

علی گڑھ اور اس کی طرز پر چلنے والے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اگرچہ دینی تعلیم کا مواد بہت کم تھا مگر جتنا بھی تھا، اس کی بنیاد جدید فکر و فلسفہ کے بجائے قدیم روایت پر تھی جو پاکستان کے قیام کے بعد بھی بدستور قائم ہے اور اس میں دینی حلقوں کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے کچھ اضافہ ہی ہوا ہے، کمی نہیں ہو سکی۔ یہ بات آج کے عالمی تعلیمی حلقوں کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے کیونکہ قرآن کریم، حدیث رسولؐ اور فقہ اسلامی کا خواہ کتنا تھوڑا حصہ ہی کیوں نہ ہو، اگر اس کا مواد قدیمی ہے اور طرز روایتی ہے تو اس کے اثر انداز ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی اور اس کی تعلیم و تدریس کے مرحلہ سے گزرنے والا مسلمان عملی لحاظ سے خواہ کتنا ہی بے کار ہو، مگر قرآن و سنت اور دین کی بنیادوں کے ساتھ کمٹمنٹ کے اعتبار سے وہ یقیناً بے لچک ثابت ہوگا۔

اسی وجہ سے اقوام متحدہ کے تعلیمی اداروں اور دیگر بین الاقوامی تعلیمی حلقوں کی طرف سے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے تعاون سے پاکستان پر دباؤ بڑھایا جا رہا ہے کہ وہ سرکاری نصاب تعلیم کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائے جس کا مطلب یہ ہے کہ دینیات کا وہ حصہ جسے بین الاقوامی حلقے بنیاد پرستی میں اضافے کا باعث سمجھتے ہیں اور اس میں جہاد کے احکام کے علاوہ خاندانی نظام اور نکاح و طلاق اور وراثت کے شرعی احکام بھی شامل ہیں، اسے نصاب سے نکال دیا جائے۔ گزشتہ دنوں قرآنی تعلیم کے مواد سے سورہ توبہ اور سورہ انفال کو طلبہ اور طالبات کے لیے مشکل قرار دیتے ہوئے نصاب سے خارج کرنے کی جو آواز اٹھی تھی، وہ اسی پس منظر میں تھی اور اسی تقاضے کی صدائے بازگشت تھی جو ایک صدی قبل یوپی کے انگریز گورنر نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سربراہ مولانا شبلی نعمانی سے کیا تھا، لیکن یہ تقاضا جب خالص غلامی کے دور میں قابلِ قبول نہیں تھا تو آج بظاہر آزادی کے دور میں کس طرح قبولیت حاصل کر سکتا ہے؟ مگر سیکولر حلقوں کی چابک دستی کو داد دیجیے کہ جو بات وہ سیدھے راستے سے منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے، اس کے لیے انہوں نے بالواسطہ طریقہ اختیار کر لیا ہے اور وہ جنرل پرویز مشرف کی کابینہ سے یہ فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ نصابی کتابوں کی تیاری اور طباعت کی ذمہ داری سرانجام دینے والے ٹیکسٹ بک بورڈز ڈی ریگولیٹ کر دیے گئے ہیں اور اب یہ کام بین الاقوامی اداروں کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ یعنی اپنے تقاضوں اور مطالبات کو حکومت پاکستان سے براہ راست منوانے میں کامیابی کے امکانات واضح نہ دیکھتے ہوئے بین الاقوامی اداروں نے یہ سارا

کام ہی اپنے ہاتھ میں لینے کا راستہ صاف کر لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ملک کے دینی حلقے اور محب وطن تعلیمی ادارے اس صورت حال کا کس طرح سامنا کرتے ہیں اور بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے اس ”کامیاب وار“ کے توڑ کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

میٹرک کا نصاب اور سورہ توبہ

میرپور آزاد کشمیر کے ضلع مفتی مولانا قاضی محمد اویس خان ایوبی نے ’’اوصاف‘‘ میں شائع ہونے والے ایک مراسلے میں بتایا ہے کہ پاکستان کی وفاقی وزارت تعلیم کے بعض ذمہ دار حکام میٹرک کے نصاب تعلیم سے قرآن کریم کی سورہ توبہ کو خارج کرنے کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اس سے قبل بھی راقم الحروف کے علم میں بعض ذرائع سے یہ بات آچکی ہے کہ وفاقی وزارت تعلیم میں اس قسم کی کھسر پھسر جاری ہے اور اس سلسلہ میں اسلام آباد میں ایک اجلاس بھی ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ سورت بہت مشکل ہے اور ملک کے مختلف حصوں سے طلبہ کے خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ اس سورہ کا ترجمہ پڑھنا ان کے لیے دشوار ہے اور انہیں امتحان میں دقت پیش آتی ہے۔ ملک کے کسی بھی حصے سے وزارت تعلیم کے حکام کے نام اس قسم کے خطوط کا اہتمام کرنا ان این جی اوز کے لیے کوئی بھی انوکھا کام نہیں ہے جو رفاہی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نام پر بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے ملک میں ذہنی انتشار اور فکری انارکی کی فضا پیدا کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں، ورنہ جہاں تک مشکل مضامین کا تعلق ہے، میٹرک کے طلبہ کے لیے اس سے کہیں زیادہ مشکل انگریزی اور ریاضی کے مضامین ہیں اور میٹرک میں فیل ہونے والے طلبہ کی ایک بڑی تعداد بلکہ اکثریت ان دو مضامین کی وجہ سے فیل ہوتی ہے، مگر وزارت تعلیم کے حکام یا این جی اوز نے کبھی طلبہ اور طالبات کی اس مشکل کو دور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ایسی کسی شکایت کو توجہ کے قابل سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ تعلیم میں نصاب کی بنیاد اس پر نہیں ہوتی کہ طلبہ اپنے لیے کون سی بات کو آسان سمجھتے ہیں اور کون سی بات انہیں مشکل دکھائی دیتی ہے، بلکہ نصاب تعلیم کی بنیاد ضروریات اور ملی تقاضوں پر ہوتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس سطح پر ہم ان طلبہ اور طالبات کو کیا پڑھانا چاہتے ہیں؟ پھر اس دائرہ کے تعین کے بعد اس کے اندر رہتے ہوئے طلبہ کے لیے متوقع مشکلات کو آسان کرنے کی کوشش میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا۔

جہاں تک سورہ توبہ کا تعلق ہے، ہمیں مولانا قاضی محمد اویس خان ایوبی کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ یہ طلبہ اور طالبات کے لیے مشکل ہو یا نہ ہو، البتہ اس سورہ کے مضامین کو ہضم کرنا ان عالمی طاقتوں اور بین الاقوامی اداروں کے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے جو ملت اسلامیہ میں تیزی سے ابھرتے ہوئے جذبہ جہاد کو موجودہ عالمی نظام کے لیے خطرہ سمجھ رہے ہیں اور مسلمان بچوں کا قرآنی تعلیمات سے واقف ہونا ان کے نزدیک ان کے بنیاد پرست ہونے اور جہاد کے احکام و فضائل سے آگاہی ان کے دہشت گرد ہونے کی علامت ہے اور اسی وجہ سے تعلیمی نصاب کے حوالے سے کام کرنے والے عالمی ادارے اور تعلیم کے نام پر مالی امداد دینے والی بین الاقوامی تنظیمیں مسلمان ملکوں پر اپنے نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور اس میں دینی معلومات کا عنصر کم سے کم کرنے پر زور دیتی ہیں۔

کچھ عرصہ قبل صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں مسجد مکتب اسکیم کے عنوان سے ملک بھر میں ایک تعلیمی پروگرام شروع کیا گیا تھا جس کا مقصد تعلیمی دائرہ کو وسیع کرنا اور مساجد کو عوامی تعلیمی دائرہ میں شامل کرنا اور خواندگی اور تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ اس پروگرام کے تحت مساجد میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ پرائمری اسکولوں کی سطح تک تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا جس سے پرائمری سطح پر تعلیم کے اخراجات بہت کم ہو جاتے اور زیادہ سے زیادہ بچوں کو اس سے فائدہ ہوتا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا اور ملک کے بہت سے حصوں میں مساجد میں اس پروگرام کا آغاز بھی ہوا مگر بعد میں یہ اسکیم ختم کر دی گئی اور واقفان حال نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ عالمی اداروں کے خیال میں اس طرح ملک میں بچوں کی بہت زیادہ تعداد کو مساجد کے ماحول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا، اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی اکثریت بچپن میں ہی بنیاد پرستی کی خوگر ہو جاتی، اور اس کے نتیجے میں بنیاد پرستوں کے تناسب میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ مبینہ طور پر عالمی اداروں کی مداخلت کی وجہ سے یہ مفید اسکیم ختم کر دی گئی۔ اس سابقہ تلخ تجربہ کے پیش نظر محسوس ہوتا ہے کہ میٹرک کے نصاب سے سورہ توبہ کو خارج کرنے کی یہ تجویز بھی اسی پس منظر میں پیش کی گئی ہے اور اگر قارئین سورہ توبہ کے مضامین پر ایک نظر ڈال لیں تو انہیں اس تجویز کا پس منظر اور مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ان سطور میں سورہ توبہ کے سب مضامین کا احاطہ تو مشکل ہے، البتہ ان میں سے چند اہم امور کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے:

یہ سورہ قرآن کریم کے دسویں اور گیارہویں پارے میں ہے اور اس کے دو نام ہیں۔ اسے سورہ براءت بھی کہا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کے بہت سے قبائل نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن کے معاہدات کر رکھے تھے، لیکن بعض قبائل بالخصوص قریش نے ان معاہدات کی شرائط کی پاسداری نہیں کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان معاہدات سے براءت کے اعلان کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام معاہدے ٹوٹ گئے جن میں عرب قبائل نے شرائط کو ملحوظ رکھنے کے بجائے من مانی کرنے کی کوشش کی تھی، البتہ جن قبائل نے شرائط کی پابندی کی، ان کے ساتھ معاہدات کو برقرار رکھا گیا۔

اس سورہ کو سورہ توبہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اس لیے کہ اس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مخلص صحابہ کرام، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت ہلال بن امیہؓ اور حضرت مرارہ بن ربیعؓ کی توبہ قبول کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جو غزوہ تبوک میں کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ اس وقت کی ایک عالمی قوت رومن ایمپائر (اس وقت کا امریکہ) نے شام کے راستے سے مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا موقع دینے کے بجائے خود شام کی سرحد پر جانے اور وہاں ان کے خلاف محاذ آرا ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے مدینہ منورہ میں سب لوگوں کو جہاد کے لیے تیاری کرنے کا دے دیا۔ سخت گرمی کا موسم تھا، فصلیں پکی ہوئی تھیں، مالی سال کے اختتام کی وجہ سے وسائل اور پیسے کم تھے اور سفر لمبا تھا، اس لیے لوگوں کا جہاد کے لیے جانا بظاہر بہت مشکل تھا، لیکن حضرات صحابہ کرام نے ان تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا اور ہزاروں کی تعداد میں تیار ہو گئے۔ البتہ منافقوں نے حیلے بہانے شروع کر دیے اور مختلف عذر پیش کر کے ان کی ایک بڑی تعداد پیچھے رہ گئی، جبکہ صحابہ کرام میں سے مذکورہ بالا تین حضرات ساتھ نہ جا سکے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر لے کر تبوک تک گئے، وہاں ایک ماہ قیام کیا مگر رومی لشکر کو مقابلہ پر آنے کی ہمت نہ ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ مدینہ منورہ واپسی پر منافقین نے تو جھوٹے عذر اور حیلے بہانے پیش کر کے اپنی جان چھڑا لی، لیکن مذکورہ تین بزرگوں نے صاف گوئی کے ساتھ اپنے قصور کا

اعتراف کیا جس پر انہیں یہ سزا دی گئی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اور آپ کے حکم سے صحابہ کرام نے ان تینوں حضرات کا کئی روز تک سوشل بائیکاٹ کیے رکھا جس میں ان کے ساتھ بول چال اور لین دین کے سارے معاملات ترک کر دیے گئے اور ان کی مسلسل ثابت قدمی کے باعث اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی توبہ قبول کرنے کا اعلان فرمایا جس کا ذکر اس سورہ میں ہے اور اسی وجہ سے اسے سورہ توبہ کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اس سورہ میں غزوہ حنین کا ذکر ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قدم اکھڑ جانے کے بعد ان کی مدد کی اور انہیں فتح عطا فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی یہ حکم اس سورہ میں بطور خاص مذکور ہے کہ مشرکین کو آج کے بعد مکہ مکرمہ میں مسجد حرام اور بیت اللہ شریف کے قریب آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ پھر اس سورہ میں یہود و نصاریٰ کی سرکشی اور نافرمانی کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے علماء اور پیروں کی ایک بڑی تعداد نے خود کو خدائی مقام عطا کر رکھا ہے اور وہ لوگوں کا مال اس کے ذریعے سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اس سورہ میں مسلمانوں کو جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی ہے اور جہاد سے پیچھے رہنے والے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ اس میں جہاد کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا جنازہ پڑھنے سے روکا گیا ہے جبکہ سورہ کے اختتام پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ان میں دین کا علم اور تفقہ حاصل کرنے والی ایک جماعت ضرور موجود رہنی چاہیے جو دینی معاملات میں امت کی راہنمائی کرتی رہے۔

یہ سورہ توبہ کے بعض مضامین کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کو میٹرک کے نصاب سے نکالنے کی تجویز کا اصل مقصد کیا ہے۔

(روزنامہ اوصاف اسلام آباد، ۴؍ فروری ۲۰۰۰ء)

تعلیمی نظام اور بین الاقوامی مطالبات

ملک کا تعلیمی نظام اس وقت سہ طرفہ یلغار کی زد میں ہے اور اعلیٰ سطح پر اس سلسلہ میں جو سرگرمیاں نظر آرہی ہیں یا در پردہ جاری ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کا کوئی شعبہ بھی ان تبدیلیوں کے اہداف سے باہر نہیں ہے جو پاکستان کے حوالے سے طے کر لی گئی ہیں اور انہیں روبہ عمل کرنے کے لیے ''ہوم ورک'' تیزی کے ساتھ مکمل کیا جارہا ہے۔

ایک طرف دینی مدارس کا نظام و نصاب ہے جس میں اصلاح و ترمیم کے مختلف شعبے سرگرم عمل ہیں اور اصلاح و ترمیم کا اصل ہدف امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی اس حالیہ بریفنگ کے بعد بالکل واضح ہو گیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ دینی مدارس بنیاد پرستی اور دہشت گردی کی اصل آماج گاہ ہیں جو امریکہ کے لیے باعث تشویش ہے اور اس کا اصل حل یہ ہے کہ ان میں جو نظریہ پڑھایا جاتا ہے، اسے تبدیل کیا جائے۔ یہ بات اس سے قبل سابق امریکی صدر بل کلنٹن جدہ میں اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے سعودی عرب کے حوالے سے بھی کہہ چکے ہیں کہ سعودی عرب کے نصاب تعلیم میں عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اپنے مذہب کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ کا درس دیا جاتا ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

گویا بات بڑھتے بڑھتے اپنے اصل نکتہ اور ہدف تک آگئی ہے کہ امریکہ اور اس کے ہمنواؤں کو اصل اعتراض اس پر ہے کہ سعودی عرب، پاکستان یا دوسرے مسلم ممالک کے دینی تعلیمی اداروں میں عقیدہ کے حوالہ سے جو تعلیم دی جاتی ہے اور یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اسلام حق مذہب ہے اور دوسرے مذاہب باطل ہیں، اس لیے دنیا میں ایک حق مذہب کے طور پر اسلام کی بالادستی نسل انسانی کی ضرورت ہے، یہ تعلیم بعض مغربی دانشوروں کے نزدیک غلط ہے اور ان کے بقول عالمی رواداری اور ہم آہنگی میں رخنے پیدا کرتی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اپنے دائرہ میں مذہب کی تعلیم دی جائے لیکن دوسرے مذاہب کو غلط نہ کہا جائے اور انہیں باطل قرار دے کر ان کی مخالفت نہ کی جائے۔ یہ

بات اسلام کے مزاج اور بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے اور اسی طرح کی بات ہے جو مشرکین مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کے طور پر کہی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو غلط کہنا چھوڑ دیں اور ہم آپ کے رب کی پرستش میں شریک ہو جاتے ہیں، اس طرح ایک دوسرے کی مخالفت کیے بغیر ہم باہمی رواداری کے ساتھ اکٹھے رہ سکیں گے، لیکن قرآن کریم نے سورہ ''الکافرون'' کی صورت میں اس پیشکش کو یکسر مسترد کر دیا تھا اور عقیدہ کے حوالے سے کوئی لچک یا ایڈجسٹمنٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج بھی دینی نصاب تعلیم کے حوالہ سے یہی صورت حال ہے۔ مسلمانوں سے تقاضا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی نفی نہ کریں، انہیں بھی اسلام کی طرح ایک صحیح مذہب کے طور پر برداشت کریں اور ان کے بارے میں رواداری کا وہ ماحول پیدا کریں جو مغرب میں ہے جہاں دوسرے مذاہب کجا، خود اپنے مذہب کے بارے میں بھی رواداری کے نام پر بے تعلقی اور عدم دلچسپی کو عقیدہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

دینی مدارس سے دوسرا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے نصاب سے وہ تمام چیزیں خارج کریں جو آج کے مروجہ عالمی کلچر میں مسلم معاشرہ کے ضم ہونے میں رکاوٹ ہیں، لیکن دینی مدارس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ قرآن کریم اور سنت نبوی کا جو محفوظ اور مکمل ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے، وہ انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس لیے بھی قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چھانٹی کر کے ان میں کسی چیز کو حذف کرنے، ان میں کوئی اضافہ کرنے یا ان کی طے کردہ ترجیحات کو آگے پیچھے کرنے کا مسلمانوں میں سے کسی کے پاس کسی درجے میں کوئی اختیار موجود نہیں ہے۔ نہ حکمرانوں کے پاس، نہ منتخب اداروں کے پاس، نہ علماء کرام اور دانشوروں کے پاس اور نہ ہی براہ راست عوام کے پاس اس نوعیت کا کوئی اختیار ہے۔ اس لیے اس حوالہ سے مغربی حکمرانوں کا دباؤ اور امریکہ بہادر کے تحریص اور تخویف کے حربے دینی مدارس کی مشکلات میں تو ضرور اضافہ کریں گے اور اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ ریاستی قوت بلکہ بین الاقوامی طاقت دینی مدارس کے موجودہ ڈھانچے میں تھوڑے بہت ردوبدل میں کامیابی حاصل کر لے، لیکن ان کا یہ ہدف کہ قرآن و سنت کی تعلیمات میں آج کے عالمی نظام اور بالادست کلچر کے تقاضوں کی روشنی میں نظر ثانی ہو اور ترامیم یا ترجیحات میں تبدیلی کے کسی عمل سے انہیں گزارا جائے، یہ قطعی طور پر ناممکن ہے جو قیامت تک نہیں

ہو سکے گا۔

بہر حال یہ کشمکش جاری ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔ دینی مدارس اس سے قبل ۱۸۵۷ء کے بعد کے متحدہ ہندوستان، سیکولر ترکی اور کمیونسٹ وسطی ایشیا میں اس قسم کی بلکہ اس سے زیادہ شدید اور سنگین صورت حال کا سامنا کر چکے ہیں اور ان بحرانوں سے کامل سرخ روئی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس لیے ان کی قیادت زیادہ پر اعتماد نظر آتی ہے کہ وہ اس بحران میں بھی سرخرو ہوں گے اور دینی تعلیم کے بنیادی ڈھانچے کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے، ان شاء اللہ۔

دوسری طرف ملک کے ریاستی اور سرکاری تعلیمی اداروں کا نصاب و نظام تعلیم بھی ردوبدل کے اس عمل سے دوچار ہے اور اسے دو حوالوں سے یلغار کا سامنا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں جس درجہ میں بھی دینی تعلیم اور اسلامی اقدار کا مواد موجود ہے، اسے نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جہاد کی آیات نصاب سے نکالنے کی کوشش پر قومی اسمبلی میں ہنگامہ ہو چکا ہے اور حکمران گروہ لوگوں کو یہ یقین دلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے کہ نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا رہی، جبکہ سرکاری تعلیمی بورڈ کو آغا خان فاؤنڈیشن کے تعلیمی نظام کے ساتھ نتھی کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آغا خان فاؤنڈیشن کے ذریعے سے ایجوکیشن بورڈز اور تعلیمی نصابوں کو از سر نو سیکولر تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام کی تعلیم کا جو عنصر کسی بھی درجہ میں موجود ہے، اسے خارج کر کے بین الاقوامی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر پورے نصاب تعلیم کو سیکولر بنا دیا جائے۔ ایک طرف وفاقی وزراء نصاب سے اسلامی مواد خارج نہ کرنے کی یقین دہانی کرانے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ تعلیمی بورڈز کو نتھی کر کے عملاً تمام تبدیلیوں کی راہ ہموار کر دی گئی ہے۔

اس عالمی یلغار کے تیسرے ریلے کا رخ بھی ریاستی اور حکومتی تعلیمی نظام و نصاب کی طرف ہے اور اس کا ہدف یہ ہے کہ تعلیمی نصاب میں جو مواد بھارت کے بارے میں منفی جذبات کا باعث بن رہا ہے، وہ خارج کر دیا جائے۔ اس کی زد میں تاریخ بھی ہے کہ مغلوں کی بادشاہت کا تذکرہ بھارت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے، تحریک آزادی کے بہت سے مسلم ہیرو بھارت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے، کشمیر اور اس کی تحریک آزادی کا تذکرہ بھارت کے خلاف منفی جذبات ابھارتا ہے اور ۱۹۶۵ء کی

جنگ کے شہداء بھی بھارت کی جارحیت کے خلاف دفاع وطن کا جذبہ پیدا کرنے میں خاصا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ سارا مواد تعلیمی نصاب سے خارج کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ’’سب سے پہلے پاکستان‘‘ کا نعرہ لگا کر پاکستان کو عالم اسلام اور اسلامی برداری سے الگ کرنے کے بعد اب دوسرے مرحلے میں اسے جنوبی ایشیا کی کسی یونین یا کنفیڈریشن کا حصہ بنانے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے، اور ہمیں اس مہم کو دیکھ کر برادر مسلم ملک ترکی یاد آ رہا ہے جسے کہا گیا تھا کہ وہ ترکی ہے، یورپین ہے، اور مغرب کا حصہ ہے۔ اسے عالم اسلام کی چودھراہٹ سے کیا سروکار ہے؟ وہ مسلم دنیا کی چودھراہٹ چھوڑ دے، عالم عرب اور عالم اسلام سے الگ ہو جائے اور ’’سب سے پہلے ترکی‘‘ کو اپنا ہدف بنائے۔ اس غریب نے ایسا ہی کیا اور اس کے لیے بہت کچھ قربان کر دیا، لیکن ’نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم‘ کے مصداق اس کے ہاتھ سے عالم اسلام کی چودھراہٹ بھی گئی، خلافت اور اسلامی نظام قانون بھی ہاتھ سے جاتا رہا اور یورپی یونین میں شرکت کا خواب بھی پورا نہ ہوا۔

پاکستان بنانے والوں نے اسے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے مرکز اور مسلم دنیا کی قیادت کے لیے تشکیل دینے کا تصور پیش کیا تھا۔ علامہ اقبال کا خواب یہی تھا اور قائد اعظم تحریک پاکستان کے دوران میں مسلسل یہ بات دہراتے رہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے احیا اور ایک فلاحی اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنے کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن آج یہ سارا فلسفہ، پوری سوچ اور مکمل جدوجہد جنوبی ایشیا کی اجتماعیت اور عالمی ہم آہنگی کے نام پر عالمی استعمار کے ایک اشارۂ ابرو پر قربان کی جا رہی ہے۔ یہ امتحان کا وقت ہے اور آزمائش کا مرحلہ ہے، علماء کرام کے لیے بھی اور محب وطن دانشوروں کے لیے بھی کہ وہ قوم کو اس بحران سے نکالنے کے لیے کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دینی قیادت اور قومی دانش کو اس نازک مرحلہ میں صحیح اور دانش مندانہ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، ۱۹/ مارچ ۲۰۰۴ء)

تعلیمی نصاب میں اصلاحات کی نئی بحث

دینی مدارس کے نصاب و نظام میں اصلاح کی بحث ابھی جاری تھی کہ ریاستی تعلیمی نصاب میں اصلاحات و ترامیم کا ”پنڈورا باکس“ بھی کھول دیا گیا اور مختلف رپورٹوں اور تجاویز کی صورت میں یہ تقاضے شروع ہو گئے کہ عالمی اور جنوبی ایشیا کی سطحوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ریاستی تعلیمی نظام کی ”اوور ہالنگ“ کی جائے اور نصاب کے اہداف اور مواد، دونوں پر نظر ثانی کر کے اسے از سرِ نو ترتیب دیا جائے۔

عالمی تبدیلیوں اور جنوبی ایشیا کے حالات میں تغیر کے حوالے سے ہمارے بعض دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ مغرب نے ٹیکنالوجی، دولت اور عسکری بالادستی کے زور پر جو فلسفہ حیات اور تہذیب دنیا پر مسلط کر دی ہے، وہ اب ”حرف آخر“ ہے اور چونکہ مغربی دانش ور موجودہ دور کو ”اینڈ آف دی ہسٹری“ قرار دے کر اب مزید ارتقا اور تغیر کے امکانات کو رد کر رہے ہیں اور موجودہ عالمی صورت حال کو ہی انسانی سوسائٹی کی ترقی اور ارتقا کی معراج تصور کر رہے ہیں، اس لیے ہمیں بھی اس پر ”ایمان“ لے آنا چاہیے اور اپنی تعلیم و تہذیب، عقیدے اور روایات و اقدار کے ہر اس حصے سے دست بردار ہو جانا چاہیے جو مغرب کے فلسفے اور تہذیب سے متصادم ہے یا اس کی بالادستی اور عمل داری میں کسی بھی درجے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اسی طرح جنوبی ایشیا کے لیے دنیا کی بالاتر قوتوں نے مستقبل کا جو کردار متعیّن کر دیا ہے، وہ بھی کسی نظر ثانی، ترمیم یا استرداد کا محتاج نہیں ہے، لہٰذا ہمیں اسے صدق دل سے قبول کر کے وہ تمام لکیریں اور دائرے مٹا دینے چاہئیں جو دنیا کے اس خطے کے بارے میں بالادست قوتوں کے ایجنڈے کی تکمیل کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں۔

اس وقت دنیا میں ٹیکنالوجی، دولت اور اسلحہ پر جن قوتوں کی اجارہ داری ہے، وہ یہ سمجھتی ہیں کہ نسل انسانی کی علمی و فکری اور تہذیبی قیادت بھی انہی کا حق ہے اور ان کے علم، فلسفے اور تہذیب کے علاوہ اور کسی علم، فلسفہ و فکر اور ثقافت کو دنیا میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق حاصل نہیں رہا، اس

لیے وہ یہ چاہتی ہیں کہ سیاست و معیشت اور عسکریت کے شعبوں کی طرح تعلیم اور تہذیبی میدانوں میں بھی انہی کی بات مانی جائے اور انہی کی ہدایات پر عمل کیا جائے۔ مغرب کے بالادستی کے اس جنون کی راہ میں مذہب اور ثقافت کے دو عنصر ہی رکاوٹ بن سکتے تھے، اس لیے اس نے دنیا کے مختلف حصوں میں مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے اور علاقائی تقاضوں کو مغربی تقاضوں میں ضم کرنے کے لیے مسلسل محنت کی جس میں اسے خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی اور بہت سے مذاہب کے پیروکاروں اور علاقائی تقاضوں کے علمبرداروں نے ہتھیار ڈال کر دست برداری اختیار کر لی ہے، لیکن مسلم دنیا میں اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی عملی و تہذیبی وابستگی بالادست قوتوں کے اس جنون کی تکمیل میں "کباب کی ہڈی" ثابت ہو رہی ہے اور دو صدیوں کی مسلسل محنت کے باوجود مسلم معاشروں کو اس بات کے لیے تیار نہیں کیا جا سکا کہ وہ معاشرتی زندگی کے ساتھ مذہب کے تعلق سے دست بردار ہو جائیں اور اپنے علاقائی تقاضوں کو مکمل طور پر مغربی ثقافت میں ضم کر دیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشکل پاکستان میں پیش آ رہی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام ہی مسلم تہذیب و ثقافت کے تحفظ و احیا کے نعرے کے ساتھ عمل میں آیا تھا اور جنوبی ایشیا میں اس کا الگ تشخص صرف اور صرف یہ ہے کہ مسلم تہذیب و ثقافت کو اس خطے کی دوسری اقوام کی تہذیب و ثقافت سے الگ قرار دیتے ہوئے اس کے لیے الگ مملکت کا قیام ضروری سمجھا گیا تھا، ورنہ اگر یہ امتیاز اور تشخص تسلیم نہ کیا جائے تو ایک الگ ملک کے طور پر پاکستان کے قیام کا اور کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا جسے بطور ملک پاکستان کے الگ وجود کی بنیاد قرار دیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے تعلیمی نظام و نصاب میں اصلاح کی بات عالمی ماحول کے حوالے سے ہو یا جنوبی ایشیا کے پس منظر میں، دونوں صورتوں میں اس کا سب سے بڑا ہدف اسلامی تعلیمات ہی قرار پاتی ہیں اور قرآن و سنت کی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے مواد کو تعلیمی نصاب سے خارج کیے بغیر ملک کے تعلیمی نصاب کو ان گلوبل اور علاقائی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنا ممکن دکھائی نہیں دیتا جن تقاضوں کو ہماری "تقدیر" کا درجہ دے کر ہم سے انہیں بہر حال پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ جب تعلیمی نصاب میں قرآن کریم اور حدیث نبوی کا معتد بہ حصہ شامل ہو گا تو اسے ایمان و عقیدہ کے ساتھ پڑھنے والے نوجوانوں کے لیے نہ عالمی سطح پر بالاتر تہذیب و ثقافت کو

قبول کرنا آسان ہو گا اور نہ جنوبی ایشیا کی بالادست ہندو ثقافت کو ہضم کرنا ہی ان کے بس میں ہو گا، کیونکہ قرآن و سنت میں عقیدے، خاندانی نظام اور ثقافتی اقدار کے حوالے سے مسلمانوں کو اپنا الگ امتیاز و تشخص قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، دوسری قوموں کے عقائد، خاندانی سسٹم اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ اختلاط سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے اور اپنے عقیدہ و ثقافت کے ساتھ صرف وابستگی ہی کی تلقین نہیں کی گئی، بلکہ اسے دوسری قوموں کے سامنے پیش کرنے اور اس کا دائرہ دنیا کی تمام اقوام تک وسیع کرنے کی ہدایات بھی دی گئی ہیں جن میں موجودگی میں دنیا کی تمام اقوام کے عقیدوں، تقاضوں اور خاندانی نظاموں کے ادغام واختلاط کا وہ ہدف مسلم معاشرے میں حاصل ہونا قطعی طور پر ناممکن ہو جاتا ہے جو آج کی بالادست قوتوں کی تمام تر تگ و تاز کا سب سے بڑا ہدف بن چکا ہے۔

اسی طرح اسلامی تاریخ کا معاملہ ہے۔ عالمی حوالے سے حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طارق بن زیادؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور نور الدین زنگیؒ جیسے جرنیلوں اور جنوبی ایشیا کے پس منظر میں محمد بن قاسمؒ، محمود غزنویؒ، شہاب الدین غوریؒ، ظہیر الدین بابرؒ، اور احمد شاہ ابدالیؒ جیسے فاتحین کا تذکرہ نصاب میں ہو گا تو مسلمانوں اور ہندوؤں میں رواداری اور ہم آہنگی کا وہ ماحول پیدا نہیں کیا جا سکے گا جو آج کی بالادست قوتیں پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ پھر جہاد کا مسئلہ بجائے خود سب سے زیادہ اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم ہو گی تو جہاد کی تعلیم بھی ہو گی، اس کے فضائل بھی ہوں گے، اس کے احکام بھی ہوں گے اور اس کی ترغیب بھی ہو گی۔ اب یہ بات تو کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ قرآن کریم پڑھایا جائے، حدیث و سنت کی تعلیم دی جائے اور فقہ اسلامی کی تدریس ہو اور ان میں سے جہاد کے حصوں کو نکال دیا جائے۔

یہ بات سیکولر حلقوں کے لیے الجھن کا باعث بنی ہوئی ہے اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس سب کچھ کی موجودگی میں پاکستانی معاشرے کو نہ تو عالمی ماحول اور بالادست قوتوں کے لیے پوری طرح قابلِ قبول بنایا جا سکتا ہے اور نہ جنوبی ایشیا اور سارک ممالک کے ساتھ اس سطح پر ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے جس کو اس خطے میں عالمی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارے سیکولر دانشوروں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ سرے سے پاکستان کے ریاستی نصاب تعلیم سے قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ کے ان حصوں کو خارج کر دیا جائے جو مسلم اور غیر مسلم کا فرق قائم رکھنے کا ذہن پیدا کرتے اور

پاکستان کے اسلامی تشخص کو اجاگر کرتے ہیں، اس لیے ان دونوں حوالوں سے ملک کے مروجہ ریاستی تعلیمی نصاب ونظام کے بارے میں جو رپورٹیں سامنے آرہی ہیں، ان میں اس کا پوسٹ مارٹم کیا جارہا ہے، اس کی خامیوں کی نشان دہی کی جارہی ہے اور اصلاحات وترامیم تجویز کی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام آباد کے ایک ادارے ''سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ پالیسی انسٹیٹیوٹ'' (SDPI) کی ایک تفصیلی رپورٹ کا خلاصہ ہمارے سامنے ہے جس میں مروجہ ریاستی تعلیمی نصاب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مطابق پاکستان کے ریاستی نصاب تعلیم میں جو باتیں قابلِ اعتراض اور لائق اصلاح ٹھہرائی گئی ہیں، ان میں سے چند اہم باتیں درج ذیل ہیں:

- نظریہ پاکستان کے نام سے ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان نفرت پیدا کی جارہی ہے اور اسرائیل کے خلاف بھی ذہن سازی کی جارہی ہے۔
- جہاد اور شہادت کو عظمت دی جارہی ہے جس سے ہماری نسلوں میں دہشت گردی پیدا ہو رہی ہے۔
- قرآن کی تدریس غیر ضروری طریقے سے سب پر ٹھونسی جارہی ہے۔
- ہر طرف سے اسلامیات کے مضمون کو حاوی کر دیا گیا ہے۔
- جو لوگ مسلمان نہیں ہیں، انہیں کافر قرار دے کر ان کی تذلیل کی جارہی ہے۔
- راجہ داہر کو لٹیرا، راہزن اور برے حکمران کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے اور محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری کو ہیرو بنایا جارہا ہے جبکہ تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں۔
- پاکستان کو اسلامی ملک قرار دیتے ہوئے اس کے نظام تعلیم کو اسلامی رنگ میں رنگنے اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دینے پر زور بڑھتا جارہا ہے۔

یہ ان اعتراضات وتنقیدات کے چند پہلو ہیں جو صرف نمونے کے طور پر نقل کیے جارہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے ریاستی تعلیمی نصاب کو عالمی اور جنوبی ایشیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر اس میں کس قسم کی ترامیم کا خاکہ تیار کیا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی کم تشویش ناک نہیں ہے کہ ملک کے تعلیمی نصاب کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ وابستہ کیا جارہا ہے، اگرچہ اس کی عملی شکل اس وقت ہمارے سامنے واضح نہیں ہے۔

ہمیں عالمی ماحول اور جنوبی ایشیا کے مستقبل کے تقاضوں سے انکار نہیں، نہ ہی مشترکہ امور میں ہم آہنگی کی ضرورت کو مسترد کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے اپنے وجود، تشخص، عقیدے، تہذیب، مذہب اور ماضی سے دستبردار ہو کر ضم ہونا ضروری نہیں، بلکہ اپنے عقیدہ و ثقافت اور روایات و اقدار پر قائم رہتے ہوئے بھی مشترکہ امور میں تعاون و مفاہمت کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہم نے اپنے عروج و اقتدار کے دور میں ایک ہزار سال تک مذہب اور ثقافت کے فرق کو برقرار رکھتے ہوئے جنوبی ایشیا میں باہمی رواداری اور ہم آہنگی کا جو ماحول قائم رکھا ہے، آج اس رواداری اور ہم آہنگی کے لیے مذہبی تعلیمات اور تہذیبی امتیازات سے دست بردار ہونا کیوں ضروری سمجھا جا رہا ہے؟ سیکولر دانشوروں سے گزارش ہے کہ وہ گلوبلائزیشن اور جنوبی ایشیا کے سیاسی تغیرات کو سیاست ہی کے دائرے میں رہنے دیں اور اس تاریخی حقیقت کو نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے دیں کہ مسلمانوں نے اپنے عقیدے اور ثقافت کے حوالے سے کسی بھی کوشش کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۹/ مارچ ۲۰۰۴ء)

نصاب میں تبدیلی اور آغاخان فاؤنڈیشن

اسکولوں اور کالجوں کے نصاب تعلیم کے بارے میں متضاد خبریں سامنے آ رہی ہیں۔ حکومتی حلقوں کا کہنا ہے کہ نصاب میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں کی جا رہی ہے، وفاقی وزراء نصاب تعلیم سے اسلامی مواد کو خارج نہ کرنے کی یقین دہانیاں کرا رہے ہیں اور اب وزیر اعلیٰ پنجاب چودھری پرویز الٰہی نے بھی کہا ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم اسلامی ہے اور اس میں اس حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، لیکن دوسری جانب ملک کے تعلیمی حلقے مسلسل حالت اضطراب میں ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ کے مختلف فورموں کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ نصاب میں تبدیلیاں کر دی گئی ہیں، نئی نصابی کتابوں میں متعدّد ایسی تبدیلیاں موجود ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملک کے تعلیمی و امتحانی نظام کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ پیشرفت جاری ہے۔ ملک کے دینی حلقے بھی اس حوالے سے خاصے متحرک ہیں۔ گزشتہ روز جامعہ نعیمیہ لاہور میں مختلف دینی جماعتوں کے نمائندوں کے مشترکہ اجلاس میں صورت حال کو اضطراب انگیز قرار دیتے ہوئے تحریک ختم نبوت کی طرز پر جدوجہد منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ہم نے بھی پاکستان شریعت کونسل کے زیر اہتمام ایک مشاورتی اجلاس ۵/اپریل کو مسجد امن باغبانپورہ لاہور میں مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کی زیر صدارت منعقد کیا جس میں متعدّد دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے شرکت کی اور جامعہ نعیمیہ لاہور کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں شرکائے اجلاس کو بریف کیا۔

اس موقع پر دو باتیں خاص طور پر سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ وزیر اعظم پاکستان کی زیر صدارت منعقدہ اجلاس کے حوالے سے جو یہ خبر آئی ہے کہ نصاب تعلیم سے سورہ توبہ کے اخراج کا فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی جگہ تبدیل کر دی گئی ہے اور سورہ توبہ کو، جو زیادہ تر جہاد کے احکام و واقعات پر مشتمل ہے، میٹرک کے بجائے ایف اے کے نصاب میں شامل کر دیا گیا ہے جس سے وہ لاکھوں طلبہ اس کی تعلیم سے محروم رہیں گے جو میٹرک کے بعد تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں

گے۔ دوسری بات یہ کہ اصل مسئلہ ایک سورہ یا چند آیات قرآنی کا نصاب میں شامل کرنا یا ان کی جگہ تبدیل کرنا نہیں ہے، بلکہ اصل متنازعہ امر یہ ہے کہ ملک کے نظام تعلیم کو بتدریج آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے دینی حلقوں کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں اجلاس میں بتایا گیا کہ پاکستان کے تعلیمی نظام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلام آباد میں امریکی سفیر محترمہ نینسی پاؤل اور آغا خان فاؤنڈیشن کے جناب شمس الحق لاکھانی کے درمیان باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت آغا خان فاؤنڈیشن اس سلسلے میں بنیادی کردار ادا کرے گی اور حکومت امریکہ کی طرف سے اسے ساڑھے چار سو لاکھ ڈالر دیے جائیں گے۔ اس معاہدے پر وفاقی وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال اور سندھ کے وزیر تعلیم جناب عرفان مروت نے بھی دستخط کیے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے اس معاہدے کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اس پر عملدرآمد کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خبریں بھی منظر عام پر آ رہی ہیں کہ آغا خان فاؤنڈیشن کے تعلیمی بورڈ کو سرکاری سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے جو ۲۰۰۶ء سے باقاعدہ امتحانات لینا شروع کر دے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبریں بھی آ رہی ہیں کہ ملک کے تمام تعلیمی بورڈز کو، جن کی تعداد تیئیس بتائی جاتی ہے، اس بورڈ کے ساتھ ملحق کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اور آغا خان تعلیمی بورڈ کو امتحانی یونیورسٹی کا درجہ دے کر ملک کے تمام تر امتحانی نظام کو اس کی نگرانی میں دیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ ملک کے سرکاری تعلیمی نظام کی نگرانی آغا خان فاؤنڈیشن کرے گی اور ظاہر ہے، جب ایسا ہو گا تو بات صرف امتحانی سسٹم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ نصاب کی تیاری بھی اسی کی نگرانی میں ہو گی۔ اس طرح ملک کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت اور فکر و ثقافت کا تمام تر دار و مدار آغا خان فاؤنڈیشن کی پالیسی اور ترجیحات پر ہو گا۔ اگر حالات کی رفتار کا یہ تجزیہ اور مستقبل قریب کے خدشات کا یہ نقشہ درست ہے تو یہ انتہائی خطرناک بات ہے اور اس کے بارے میں ملک کے تعلیمی و دینی حلقوں کی طرف سے جس اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے، وہ نہ صرف درست ہے بلکہ اصل ضرورت سے کہیں کم ہے۔

پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں امریکی سفیر اور آغا خان فاؤنڈیشن کے مذکورہ معاہدے نے پاکستانیوں کے لیے دو مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ ایک یہ کہ اب ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کے

معاملات بھی امریکہ نے براہ راست سنبھال لیے ہیں اور ہمارے وزراء نے اس پر دستخط کر کے اس صورت حال کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں مغربی حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور جو مطالبات سامنے آ رہے ہیں، ان کی طرف عملی پیشرفت کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ مغرب کے ان مطالبات میں سرفہرست مطالبہ یہ ہے کہ تمام تر تعلیمی نصاب سے دینی مواد کو خارج کر دیا جائے، اس لیے کہ جب ایک مسلم نوجوان کو عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام حق مذہب ہے اور باقی مذاہب حق نہیں ہیں، پھر اس کے ساتھ جب اسے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی نظام اور عمومی معاشرت میں دوسری اقوام کی پیروی کرنے کے بجائے اپنے دین کے احکام و قوانین پر عمل کرنے کا پابند ہے تو وہ ذہنی، فکری اور عملی طور پر اس عالمی برادری کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہتا جس کی قیادت اس وقت مغرب کے ہاتھ ہے اور جسے "اینڈ آف دی ہسٹری" اور "ترقی یافتہ سولائزیشن" قرار دے کر مغرب اسے پوری دنیا پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے کے در پے ہے۔

مغرب کے نزدیک مسلمانوں اور پاکستانیوں کے عالمی برادری اور سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدہ و ثقافت اور خاندان و معاشرت کے حوالے سے وہ تمام مواد تعلیمی نصاب سے خارج کر دیا جائے جو اسلام کے جداگانہ تشخص اور مسلمانوں کے خاندانی و معاشرتی نظام کے دوسری قوموں سے امتیاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر تعلیمی نصاب کے بارے میں مغرب کا یہ موقف قبول کر لیا جائے تو پھر وہ چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتیں غیر اہم ہو جاتی ہیں جن کے حوالے سے ہمارے دینی حلقے اس وقت احتجاج کر رہے ہیں اور تعلیمی نظام کا اصل فکری ڈھانچہ اور ثقافتی فریم ورک ہی سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔ پھر بات صرف تعلیمی نصاب تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی تشخص، اس کے الگ ملک کے طور پر قیام کی نظریاتی اساس اور تہذیبی پس منظر کا جواز بھی دھندلکوں کی نذر ہونے لگتا ہے جسے ملک کا کوئی بھی محب وطن شہری ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔

نینسی پاؤل اور شمس الحق لاکھانی کے مذکورہ مبینہ معاہدے سے دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ امریکہ یا مغرب نے پاکستان کے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں اپنے مقاصد کی طرف پیشرفت

میں پاکستان کے معروف حلقوں میں سے کسی پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ اس نے ذریعے کے طور پر ایک ایسی اقلیت کا انتخاب کیا ہے جو اپنے عقیدے اور فکر کے حوالے سے پاکستان کی غالب اکثریت سے کسی طرح کی ہم آہنگی نہیں رکھتی اور عالم اسلام کے بارے میں اس کے سیاسی کردار پر پاکستان کے دینی و تعلیمی حلقے واضح تحفظات و خدشات رکھتے ہیں۔ آغا خان فاؤنڈیشن یا آغا خان یونیورسٹی یقیناً ایک تعلیمی ادارے کے طور پر متعارف ہے اور اسی حیثیت سے اسے سامنے لایا گیا ہے لیکن آغا خان فرقے کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ ایک الگ فرقہ ہے جو عقائد اور سیاسی کردار، دونوں حوالوں سے عالم اسلام کے سواد اعظم سے الگ طرز عمل کا حامل ہے۔ اس طرح مذکورہ معاہدے کی رو سے پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ایک نیا محاذ کھول دیا گیا ہے کہ وہ ایک طرف اپنے تعلیمی نظام اور تہذیب و ثقافت کو مغرب کے تقاضوں اور دباؤ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف داخلی محاذ پر اپنے اکثریتی عقائد و روایات کو اقلیتی مداخلت اور دستبرد سے بچانے کے لیے بھی محنت کریں۔ یہ ایک نیا محاذ ہے جو مغرب نے کھول دیا ہے اور اب ملک کے دینی حلقوں کو آغا خانی گروہ کے بارے میں ملک کے عوام کو یہ بتانا ہوگا کہ اس اقلیتی فرقے کے عقائد کیا ہیں؟ ملت اسلامیہ کی سیاسی تاریخ میں اس کا کیا کردار رہا ہے؟ عالم اسلام کی موجودہ صورت حال میں وہ کس کیمپ میں کھڑا ہے؟ اور اسلام اور مغرب کی ہمہ گیر کشمکش میں وہ کس کی خدمات سرانجام دے رہا ہے؟

آغا خانی دوستوں کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جس جگہ اور کیمپ کا انتخاب کیا ہے، وہ ان کے لیے کس حد تک مفید ثابت ہوگا اور انہیں اس کی مستقبل میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ جوں جوں بات آگے بڑھے گی، انہیں اس کا احساس ہوتا جائے گا، لیکن بدقسمتی سے جب وہ احساس و ادراک کی اصل منزل تک پہنچیں گے تو واپسی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔ گزشتہ صدی میں یہ رول اور کردار قادیانیوں نے پسند کیا تھا، وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچ چکے ہیں۔ مغرب نے اب ان کے بجائے اس کام کے لیے کسی اور کو چنا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مغرب کے نزدیک اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس کی ہے جسے دوبارہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ خیر یہ سوچنا آغا خان کمیونٹی کے ارباب دانش کا کام ہے۔ اگر انہوں نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے تو یقیناً اس کے نتائج و عواقب سے بھی وہ بے خبر نہیں ہوں گے۔ البتہ اپنے قارئین کو اس

بات سے آگاہ کرنا ہم ان کا حق سمجھتے ہیں کہ ''آغاخانی فرقہ'' کون ہے اور اس کا جداگانہ تشخص اور عقائد کیا ہیں؟

پنجاب یونیورسٹی کے ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق یہ ''اسماعیلی فرقہ'' کی ایک شاخ ہے۔ اسماعیلی فرقہ حضرت امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد باقی اہل تشیع سے اس اختلاف پر الگ ہو گیا تھا کہ باقی اہل تشیع نے امام جعفر صادقؒ کے فرزند امام موسیٰ کاظمؒ کو ان کا جانشین اور اپنا امام تسلیم کیا تھا، جبکہ اسماعیلیوں نے ان کے بجائے امام جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے امام اسماعیلؒ کو ان کے جانشین کے طور پر اپنا امام قرار دیا تھا۔ باقی اہل تشیع کے نزدیک بارہویں امام کے غائب ہونے کے بعد اب ان کی دوبارہ واپسی تک انہی کی امامت چلتی رہے گی، مگر آغاخانی فرقے کے نزدیک اماموں کا یہ تسلسل نسل در نسل چلا آرہا ہے اور ان کے موجودہ امام پرنس کریم آغاخان انچاسویں امام ہیں۔ اسماعیلیوں کے مختلف گروہ ہیں جن میں ہمارے ہاں خوجے، بوہرے، داؤدی اور آغاخانی معروف ہیں۔ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق آغاخانی فرقے کا عقیدہ یہ ہے کہ امام براہ راست خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اور عقائد و عبادات کی مختلف صورتیں متعیّن کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ قرآنی آیات کی تشریح میں اس کا قول آخری ہے، دنیا کا نظام اماموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اخروی نجات کے لیے امام سے تعلق قائم ہونا ضروری ہے اور جو شخص امام وقت کو تسلیم کیے بغیر مرگیا، وہ کافر کی موت مرے گا۔

اسماعیلی فرقے کی الگ شاخ کے طور پر آغاخانی گروہ کا آغاز ایران میں آقائے حسن علی شاہ کی امامت سے ہوا جو آغاخان اول کہلاتے ہیں۔ ان کی وفات ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔ ان کے جانشین آغاخان دوم علی شاہ کی وفات ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ آغاخان سوم سلطان محمد شاہ ۱۸۸۵ء میں امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کی ولادت کراچی میں ہوئی اور انہوں نے جنوبی ایشیا کی سیاست میں سرگرم کردار ادا کیا۔ وہ برطانوی وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے اور انہیں اس دور میں متعدّد اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ تحریک پاکستان میں بھی ان کے کردار کا بطور خاص تذکرہ ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی وفات کے بعد پرنس کریم، آغاخان چہارم کے لقب کے ساتھ آغاخانیوں کے امام بنے اور اب تک وہی امام چلے آرہے ہیں۔ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں آغاخان فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے جو جنوبی ایشیا، انڈونیشیا، چین، ملایا، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے

مختلف ممالک کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں آباد ہیں، جبکہ کراچی کو آغاخانی سرگرمیوں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔

اس پس منظر میں اگر ملک کے تعلیمی اور دینی حلقے اپنے تعلیمی نصاب و نظام کے حوالے سے تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں اور تعلیمی سسٹم کو ایک اقلیت کے سپرد کر دینے پر ان کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے تو یہ غیر متوقع اور غیر منطقی ردعمل نہیں ہے۔ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اضطراب کو محسوس کریں، اس کے اسباب و عوامل اور نتائج و عواقب کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیں اور اس چنگاری کو شعلہ بننے سے قبل حکمت عملی اور تدبر و حوصلے کے ساتھ قابو کرنے کی کوشش کریں، ورنہ پانی سر سے گزر جانے کے بعد پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۱/اپریل ۲۰۰۴ء)

قومی نظام تعلیم اور آغا خان تعلیمی بورڈ

”آن لائن“ کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی نے گزشتہ روز اسلام آباد میں ”فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن“ کے بہترین اساتذہ میں انعامات کی تقسیم سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ دینی مدارس کے لیے چھ ارب روپے رکھے گئے تھے جن میں سے پانچ ارب روپے دیے جا چکے ہیں اور ایک ارب روپے اب بھی موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خبر ”انکشاف“ کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے کہ یہ بات تو درست ہے کہ وفاقی حکومت نے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی طرف سے دینی مدارس کی اصلاح کے لیے دی گئی خطیر رقم میں سے چھ ارب روپے دینی مدارس کے لیے مختص کر رکھے ہیں، لیکن ان میں سے پانچ ارب روپے دیے جانے کی بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دینی مدارس کی غالب اکثریت ان وفاقوں سے وابستہ ہے جو مختلف مکاتب فکر نے اپنے اپنے دینی مدارس کے نظام اور امتحانات کو مربوط بنانے کے لیے قائم کر رکھے ہیں۔ اس وقت موجودہ پانچ وفاقوں، دیوبندی مکتب فکر کے وفاق المدارس العربیہ، بریلوی مکتب فکر کے تنظیم المدارس، اہل حدیث مکتب فکر کے وفاق المدارس السلفیہ، شیعہ مکتب فکر کے وفاق المدارس الشیعہ اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے رابطۃ المدارس العربیہ نے متفقہ طور پر اس رقم میں سے کوئی امداد قبول نہ کرنے بلکہ امداد قبول کرنے والے کسی بھی مدرسے کو اپنے اپنے وفاق سے خارج کر دینے کا اعلان کیا ہوا ہے، اس لیے اس صورت حال میں پانچ ارب کی خطیر رقم مدارس میں دیے جانے کی بات قابلِ فہم نہیں ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو بہت سے مدارس نے یہ پیسے لے لیے ہیں اور وفاقوں کی قیادت نے معلوم ہوتے ہوئے بھی دھیان دوسری طرف کر لیا ہے اور یا پھر یہ رقم تقسیم کرنے والوں نے ادھر ادھر کر لی ہے اور ریکارڈ میں دینی مدارس کے نام لکھ دی گئی ہے۔ بہر حال جو بھی صورت ہے، قوم کو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ ایم ایم اے کے کسی سینیٹر یا ایم این اے کو

اگر دوسرے جھمیلوں سے فرصت ہو تو اسے یہ بات پارلیمنٹ کے فلور پر حکومت سے دریافت کرنی چاہیے کہ پانچ ارب کی اتنی بڑی رقم جن مدارس کو دی گئی ہے، ان کے نام بتائے جائیں اور دینی مدارس کے نام پر مختص کی جانے والی رقم کی تقسیم کے بارے میں پارلیمنٹ کو اعتماد میں لیا جائے۔

وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی نے اپنے مذکورہ خطاب میں آغا خان تعلیمی بورڈ کو امتحانی اختیارات دینے کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس سے کوئی طوفان نہیں آئے گا، اس کی مخالفت بلاجواز ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پرائیویٹ تعلیمی ادارے آغا خان بورڈ کے ساتھ الحاق کر سکتے ہیں، تاہم انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ آغا خان بورڈ کو امتحانی اختیارات دینے کے بارے میں تعلیمی بورڈ میں اختلاف پایا جاتا ہے جسے دور کرنے کے لیے چیئرمین فیڈرل بورڈ کی سربراہی میں تین رکنی کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ آغا خان تعلیمی بورڈ کے حوالے سے ہم اپنے تحفظات کچھ عرصہ قبل اس کالم میں بیان کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں ملک بھر کے تعلیمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔

آغا خان یونیورسٹی کو ''ایگزامینیشن بورڈ'' کے قیام کا اختیار دینے کا اعلان صدر جنرل پرویز مشرف کے دستخطوں سے جاری ہونے والے آرڈیننس کے ذریعے سے اب سے دو سال قبل ۸/ نومبر ۲۰۰۳ء کو کر دیا گیا تھا۔ ''غیر معمولی آرڈیننس'' کے عنوان سے یہ حکم نامہ ''دی گزٹ آف پاکستان'' میں موجود ہے۔ اس میں ''آغا خان یونیورسٹی ایگزامینیشن بورڈ'' کو منظور کرتے ہوئے فوری طور پر اس کا نفاذ عمل میں لایا گیا ہے اور پورے پاکستان کو اس کے دائرہ کار میں شامل کیا گیا ہے۔ آرڈیننس کے ذریعے سے اس بورڈ کو مکمل طور پر خود مختار اور اپنے مقاصد کے لیے قواعد و ضوابط وضع کرنے میں کامل طور پر آزاد قرار دیا گیا ہے۔ آغا خان یونیورسٹی کو یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کلی صواب دید پر امتحانی بورڈ قائم کرے۔ آرڈیننس میں بتایا گیا ہے کہ آغا خان یونیورسٹی اپنے کلی اختیار کے تحت امتحانی بورڈ کو پرائیویٹ امیدواروں، پاکستان اور پاکستان سے باہر کے غیر سرکاری اسکولوں اور ان کے طالب علموں کو امتحانات کی پیشکش قبول کرنے کی ہدایت کر سکتی ہے اور امتحانی بورڈ وفاقی و صوبائی حکومتوں کی اجازت کے ساتھ اپنی حدود کار کو سرکاری اسکولوں تک وسعت دینے کا مجاز ہو گا، جبکہ وفاقی حکومت کے زیر انتظام اسکول اور ان کے طالب علم بشمول اسلام آباد کے وفاقی علاقے، نیز وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقے (فاٹا)، شمالی علاقہ جات اور چھاؤنیوں کے علاقوں کے اسکول بھی آغا خان امتحانی بورڈ کے

امتحانات کو طے شدہ شرائط پر اختیار کر سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا صدارتی آرڈیننس کے تحت قائم ہونے والے ”آغا خان تعلیمی بورڈ“ نے اس کے بعد اب تک جو پیشرفت کی ہے، اس سلسلے میں اسلام آباد کے ایک انگریزی روزنامہ میں ۹/فروری ۲۰۰۴ء کو شائع ہونے والی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت نے وفاقی تعلیمی بورڈ کو آغا خان بورڈ سے منسلک کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وفاقی وزیر تعلیم اور فیڈرل ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے ڈائریکٹر جنرل نے سرگرمی کے ساتھ دباؤ بڑھانا شروع کر دیا ہے، لیکن والدین اور اساتذہ کی انجمن نے اس امر کی مخالفت کی ہے اور اپنے ایک مشترکہ اجلاس میں اس کی مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس منصوبے پر دو طریقوں سے عمل کیا جائے گا۔ پہلے والدین کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ ایک ہی تعلیمی ادارے میں اپنے بچوں کو آغا خان بورڈ کے تحت امتحان دلانا چاہتے ہیں یا نہیں، دوسرے مرحلے میں اس ادارے کے سب بچوں پر لازم کر دیا جائے گا کہ وہ آغا خان بورڈ کو ہی منتخب کریں، جبکہ اس سے اگلے مرحلے میں وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی کا ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۴ء کے اخبارات میں شائع ہونے والا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

> ”آغا خان فاؤنڈیشن کا امتحانی نظام ہمارے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم تعلیمی اداروں کو آغا خان فاؤنڈیشن کے سپرد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، تاہم بعض تعلیمی اداروں کے امتحانات کو ہم آغا خان فاؤنڈیشن سے منسلک کر رہے ہیں۔ ”اے لیول“ اور ”او لیول“ کے امتحانات خصوصی طور پر ”آغا خان فاؤنڈیشن“ کے زیر اہتمام منعقد کیے جانے کے انتظامات ہو چکے ہیں۔“

ہماری معلومات کے مطابق اس وقت اسلام آباد کے وفاقی تعلیمی بورڈ کو آغا خان فاؤنڈیشن کے ساتھ ملحق کرنے کے لیے دباؤ بڑھ رہا ہے، مگر نہ صرف یہ کہ اساتذہ اور والدین کی انجمن اس کی مخالفت کر رہی ہے بلکہ خود وفاقی تعلیمی بورڈ کے ارکان میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے جسے نمٹانے کے لیے مذکورہ بالا تین رکنی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس پس منظر سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آغا خان یونیورسٹی کو مکمل اختیارات کے ساتھ امتحانی بورڈ قائم کرنے کی اجازت دینے کے بعد ملک بھر کے تعلیمی اداروں کو آغا خان فاؤنڈیشن کی طے کردہ شرائط کے ساتھ آغا خان بورڈ کے ساتھ بتدریج منسلک کر دینے کے لیے مسلسل کام ہو رہا ہے اور اگر اسے کسی مضبوط اور مؤثر مزاحمت کا سامنا نہ کرنا

پڑا تو اگلے چار پانچ سال کے عرصے میں سرکاری اور غیر سرکاری، دونوں شعبوں میں امتحانی نظام کا سب سے بڑا کنٹرولر آغا خان بورڈ ہو گا۔ اس طرح پورے ملک کا تعلیمی نظام آغا خان بورڈ کی تحویل میں چلا جائے گا۔

جہاں تک اس حوالے سے کوئی طوفان آنے یا نہ آنے کا سوال ہے، ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ یہ دو حوالوں سے ملک و قوم کے لیے نقصان دہ، بلکہ فکری اور نظریاتی طور پر تباہ کن بات ہوگی۔ ایک اس لیے کہ آغا خان فاؤنڈیشن کا یہ تعلیمی منصوبہ خود اس کا اپنا منصوبہ نہیں ہے، بلکہ امریکی سفیر کے ساتھ ایک باقاعدہ اور آن ریکارڈ معاہدے کے تحت اس نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے اور اس طرح اس کے ساتھ تعلیمی نظام کو منسلک کرنے کا مطلب ملک کے پورے تعلیمی نظام کو بالواسطہ طور پر امریکی ایجنڈے کے ساتھ وابستہ کر دینا ہے جو ملک کی خود مختاری کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے حوالے سے تعلیمی مقاصد سے انحراف کے بھی مترادف ہے۔ دوسرا حوالہ خود آغا خان فاؤنڈیشن کا ہے کہ آغا خان فرقہ ایک اقلیتی گروہ ہے جس کے عقائد قادیانیوں کی طرح ملت اسلامیہ کے اکثریتی عقائد سے متصادم ہیں اور مسلمانوں کے لیے اپنے تعلیمی نظام میں اس کی بالادستی کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ وفاقی وزیر تعلیم کو شاید یہ طوفان نظر نہ آرہا ہو مگر اس کے آثار آنکھیں کھلی رکھنے والے ہر شخص کو دکھائی دے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمران بھی طوفان والی سمت میں ایک نظر دیکھنے کی زحمت گوارا کر سکیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۲۸/ نومبر ۲۰۰۴ء)

”دی لیڈر“ اور قومی نصاب کمیٹی

وفاقی حکومت نے گیارہویں جماعت کے لیے نیشنل بک فاؤنڈیشن کی تیار کردہ انگریزی کی نصابی کتاب سے ”دی لیڈر“ کے عنوان کے تحت شامل کی جانے والی نظم کو نصاب سے خارج کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس نظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے سے امریکہ کے صدر جارج بش کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ این این آئی کی رپورٹ کے مطابق یہ فیصلہ وفاقی وزیر تعلیم لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید اشرف کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں کیا گیا جس میں بتایا گیا کہ یہ نظم انٹرنیٹ سے لی گئی اور یہ نظم جس کے شاعر کا نام بھی مذکور نہیں ہے، گیارہویں جماعت کی نصابی کتاب میں شامل کر دی گئی تھی۔

اس سے قبل ملک کے نامور ماہرین تعلیم اور ارباب دانش کی طرف سے اس نظم کو شامل نصاب کرنے پر شدید احتجاج ریکارڈ پر آ چکا ہے جس کے مطابق اسے مجرمانہ غفلت قرار دیتے ہوئے ممتاز اہل دانش نے کہا ہے کہ صدر بش کی تعریف کر کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکا گیا ہے اور یہ نئی نسل کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے، جبکہ وفاقی وزارت تعلیم کی طرف سے اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ نظم محض ”اتفاق“ سے شامل نصاب ہو گئی ہے جسے نصاب سے خارج کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے، جبکہ اگلے سال پوری کتاب کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

جہاں تک نظم کو کتاب سے خارج کرنے کا تعلق ہے، یہ خوش آئند بات ہے کہ وزارت تعلیم نے ملک کے کروڑوں عوام اور ارباب علم و دانش کے جذبات کا احترام کیا ہے اور اس کا بروقت نوٹس لیا ہے، لیکن اس سلسلے میں جو عذر پیش کیا گیا ہے، وہ ”محل نظر“ ہے۔ اس نے ایک اور نازک سوال کھڑا کر دیا ہے کہ کیا ہمارے ہاں قومی نصاب سازی کا معیار یہی ہے کہ کسی صاحب کو انٹرنیٹ سے اپنے ذوق کی کوئی نظم مل گئی اور اس نے اسے اٹھا کر نصاب میں شامل کر دیا؟ ظاہر ہے کہ یہ کتاب ”قومی نصاب کمیٹی“ میں منظوری کے مراحل سے گزری ہے، اس کے بعد ہی نیشنل بک فاؤنڈیشن نے اسے

شائع کیا ہے۔ کیا قومی نصاب کمیٹی اور نیشنل بک فاؤنڈیشن میں کارکردگی کا معیار یہی ہے اور کیا تعلیمی نصاب کے لیے مواد منتخب کرنے کا طریقہ کار یہی ہے؟ اس پس منظر میں ”قومی نصاب کمیٹی“ اور ”نیشنل بک فاؤنڈیشن“ کے پورے ڈھانچے اور طریق کار کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ مسئلہ اس قدر ہلکا پھلکا اور آسان نہیں ہے کہ اسے ”محض اتفاق“ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے، اس لیے ہم یہ گزارش کریں گے کہ قومی سطح پر ماہرین تعلیم کا ایک کمیشن قائم کیا جائے جو ”قومی نصاب کمیٹی“ اور ”نیشنل بک فاؤنڈیشن“ کے طریق کار کا جائزہ لے کر اس متنازعہ نظم کے شامل نصاب ہونے کی وجوہ اور اسباب کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ان دونوں قومی اداروں کی مجموعی کارکردگی کے بارے میں بھی رپورٹ پیش کرے۔

جہاں تک ”دی لیڈر“ کے عنوان سے قومی نصاب تعلیم میں صدر بش کو خراج تحسین پیش کرنے کا تعلق ہے، یہ کارروائی جس کسی کو بھی خوش کرنے کے لیے کی گئی ہے، نہ صرف قوم کے مجموعی جذبات واحساسات اور ملت اسلامیہ کے رجحانات کے منافی ہے بلکہ معروضی حقائق سے بھی متصادم ہے، کیونکہ اس وقت دنیا بھر میں، بلکہ خود امریکہ میں صدر بش کی پالیسیوں اور طرز عمل کو جس طرح تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اس سے آنکھیں بند کر لینا کسی طرح بھی عقل و دانش کا تقاضا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نقطہ نظر سے نظم کا جائزہ لیا جائے تو اس میں صدر بش کے بارے میں ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے کہ ”دی لیڈر“ صابر اور ثابت قدم رہتا ہے، وہ سب کچھ برداشت کر کے تمام چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، وہ اپنے طرز عمل میں نرم ہے، مگر اسٹیل کی طرح مضبوط بھی ہے، ایمان کا پکا اور خوشگوار طبیعت کا عادی ہے، وہ اپنی اہلیت کی وجہ سے قوم کو مشکل ترین حالات سے نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ سچائی کے لیے لڑتا ہے، وہ لڑائی کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے، تاہم امن کا داعی بھی ہے اور امن کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے، جب وہ سچائی کے راستے پر چل نکلتا ہے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا، وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنے اوپر ہونے والے شبہے کو دور کرنے کے لیے بار بار اپنا کیس واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے، ان لوگوں تک بھی پہنچتا ہے جو اس کو نہیں سنتے، وہ چاہتا ہے کہ دنیا اس کی ثابت قدمی کا ساتھ دے، وہ امن کو چاہتے ہوئے بدی کو مٹانے میں اپنی قوت لگا رہا ہے اور ہر وہ کام کرنا چاہتا ہے، جو صحیح ہو۔

اس نظم کو اگر صدر بش کی شخصیت اور کردار سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بلا شبہ کسی بھی صحیح الفکر لیڈر یا انسانیت دوست عالمی راہنما میں یہی اوصاف ہونے چاہئیں، لیکن ان اوصاف کو صدر بش پر منطبق کرنے سے پہلے ہمیں تصویر کے دوسرے رخ پر بھی ایک نظر ڈالنا ہوگی اور اس کے لیے ہم امریکہ ہی کے سابق صدر جناب جمی کارٹر کے ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہیں گے جو گزشتہ دنوں امریکہ کے معروف اخبار ”لاس اینجلس ٹائمز“ میں شائع ہوا ہے اور جس میں صدر بش کی قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ روزنامہ پاکستان نے ۱۸/ نومبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع کیا ہے اور ہمارے نزدیک امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر کا یہ مضمون امریکہ کے موجودہ صدر جارج ڈبلیو بش کے خلاف چارج شیٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے قومی تعلیمی نصاب میں صدر بش کی تعریف کے لیے شامل کی جانے والی اس نظم کا مسئلہ سامنے نہ آتا تو ہم اس مضمون کے بعض پہلوؤں کا ”جمی کارٹر بنام جارج ڈبلیو بش“ کے عنوان سے جائزہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر نظم کے مسئلے نے رخ تھوڑا سا تبدیل کر دیا ہے۔ جمی کارٹر اپنے اس مضمون میں کہتے ہیں کہ:

- ہمارے تاریخی اوصاف یہ ہیں کہ ہم اپنے شہریوں کو درست معلومات مہیا کرتے ہیں اور اختلاف رائے اور اختلاف عقائد کو عزت و احترام کے ساتھ برداشت کرتے ہیں، لیکن موجودہ حالات میں یہ تاریخی اوصاف خطرات سے دوچار ہو چکے ہیں۔
- ہمارے سیاسی راہنماؤں نے یک طرفہ طور پر بین الاقوامی تنظیموں اور دیرینہ معاہدوں کی پابندیوں سے آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔ ان میں وہ تمام معاہدے بھی شامل ہیں جو ایٹمی اسلحے اور جراثیمی وحیاتیاتی ہتھیاروں کے ضمن میں طے ہوئے یا جو عالمی انصاف کے بارے میں تھے۔
- جب تک ہماری ملکی سلامتی کو (براہ راست) کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، امن ہماری قومی ترجیحات میں سرفہرست ہے، لیکن ہم اپنی اس روایت کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ ہم نے ”قبل از وقت“ حملے کی پالیسی اپنالی ہے۔ اگر کسی ناپسندیدہ حکومت کو بدلنا مقصود ہو یا کوئی اور مقصد پیش نظر ہو تو یک طرفہ اقدام کو ہم نے اپنا حق سمجھ لیا ہے۔ ہم اسے ”عالمی اچھوت“ قرار دے کر اس کے ساتھ براہ راست مذاکرات سے انکار کر دیتے ہیں۔

- ہمارے چوٹی کے راہنماؤں کی شدید کوشش ہے کہ ساری دنیا پر امریکی سامراجیت مسلط کر دی جائے۔ انہیں کوئی پروا نہیں کہ اس خواہش یا کوشش کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔
- ایک طرف ہماری فوج مصروف جنگ ہے اور دوسری طرف ہمیں دہشت گردی کے خطرات لاحق ہیں، پھر بھی ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ''یا تو ہمارا ساتھ دو یا ہم تمہیں اپنا مخالف سمجھیں گے''۔ ہم نے کسی کے لیے تیسرا راستہ رہنے ہی نہیں دیا۔
- ممکنہ حد تک حقائق چھپائے جا رہے ہیں اور ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ امریکی عوام کو مرنے والے امریکی فوجیوں کی اصل تعداد کا علم نہ ہو سکے۔
- بجائے اس کے کہ ہم بنیادی انسانی حقوق کے علمبردار اور چیمپئن کا کردار ادا کرتے، قانون حب الوطنی (patriot act) کی بعض انتہا پسندانہ شقوں نے ہماری شہری آزادی اور نجی زندگی کے حقوق کو سلب کر لیا ہے۔
- امریکہ نے جنیوا سمجھوتوں کو پس پشت ڈال کر عراق، افغانستان اور گوانتاناموبے میں تشدد کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ مختلف ملکوں کی جو حکومتیں امریکہ کی حامی ہیں، ان سے بھی ان کے عوام پر تشدد کرایا جا رہا ہے۔
- گزشتہ نصف صدی کے دوران میں تخفیف اسلحہ کے ضمن میں جتنے معاہدے طے پائے، ہم چاہتے ہیں کہ انہیں بیک جنبش قلم منسوخ کر دیا جائے یا ان کی صریحاً خلاف ورزی کی جائے۔ ہم اب عالمی سطح پر ایٹمی پھیلاؤ کے ''بڑے مجرم'' بن چکے ہیں۔

جمی کارٹر نے اس چارج شیٹ میں اور بھی بہت کچھ کہا ہے، مگر ہم ان چند باتوں پر اکتفا کرتے ہوئے پاکستان کی قومی نصاب کمیٹی اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے بزرجمہروں سے پوچھنا چاہیں گے کہ کیا ان کی نظر میں ''دی لیڈر'' کا معیار یہی ہوتا ہے؟

(روزنامہ پاکستان ۱۳/ دسمبر ۲۰۰۵ء)